نشاطِ تماشا

فکاہی کلیات

سیّد ضمیر جعفری

نشاطِ تماشا

ظریفانہ کلیات

سیّد ضمیر جعفری

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۳

نیاز احمد نے

آر۔آر پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

تعداد ـــــ ایک ہزار

قیمت [redacted] روپے

ISBN 969-35-0156-X

ترتیب

جہاں آرا

احتشام ضمیر ——

اِقتدار ضمیر ——

ضمارا — شہ پارا — علی — روبینا — موری —

ماؤ ضیاء اور عمر

کے نام

(۱)

روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

(۲)

مرا نشاطِ تماشا بس از وصالِ بہشت
بقیمتِ کم و بیشِ ثمر چہ کار مرا

(نظیری)

ابتدائیہ

"سنگِ میل پبلی کیشنز" کے جناب نیاز احمد نے ۱۹۹۰ء تک کا کہا ہوا میرا بیشتر فکاہی کلام ان اوراق میں جمع کر دیا ہے۔ انھوں نے میری ایک خواہش پوری کی۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔

مندرجہ جات کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا۔ میں اس سے زیادہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا کہ زمانے کی دھوپ چھاؤں میرے سر پر بھی رہی اور دل میں بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے "اپنے" گہرے تجزیے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی اور اب تو اس "دھندے" کے لیے فرصت ہی نہیں رہی ــــ آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے!

اپنے تجزیے" سے وحشت کا سبب غالباً یہ بھی ہو کہ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں تو شاید کچھ لکھ ہی نہ پاتا۔ ذاتی حوالے سے ایک اور بات جو میں نے ہمیشہ محسوس کی اور یہاں کہنا چاہوں گا، وہ یہ ہے کہ میرے اندر تو ضرور ردِّ عمل کا لاوا پکتا رہتا ہوگا، مگر "باہر" کوئی "طے شدہ خاکہ" شاذ شاذ ہی کبھی سامنے ہوا۔ یعنی شعر کہنے سے پہلے مجھے عموماً یہ معلوم نہ ہوتا کہ مجھے کیا لکھنا ہے اور کس طرح لکھنا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں میرے دونوں بیٹوں عزیزم احتشام حیدر اور عزیزم امتنان ضمیر حیدر کی ذہنی اور "دستی" معاونت مجھے حاصل رہی ــ ربُّ العزّت انھیں دین و دنیا میں سرخرو رکھے!

چک عبدالخالق۔ تحصیل وضلع جہلم

۲۳ر مارچ ۱۹۹۱ء

ضمیر

دُعا

یا رب ! مجھے کرم سے اپنے
سُورج کی طرح طلُوع رکھنا
سُورج کی طرح غروب کرنا

دُعا

خُداوندا !
مجُھے موسیقی کی بارش میں
موت آئے !

نقطۂ نگاہ

ہم کو ہے محبوب گاتی، گنگناتی شاعری
رُوح کے اندر چھُمکتی، جھِلملاتی شاعری
محکماتِ زندگی کے نام گنوائے بغیر
نسلِ آدم زاد کو اِنساں بناتی شاعری

رو میں ہے رخشِ عمر

زیرِ نظر کتاب میں میری پچاس برسوں پر پھیلی ہوئی فکاہیہ شاعری کی تقریباً وہ تمام تحریریں شامل ہیں جو تادمِ تحریر — میں نے تحریر کی ہیں۔ "تقریباً" میں نے اس لیے کہا کہ بہت سی منظومات، جن میں سے بعض مجھے بہت عزیز بھی تھیں، اس عرصہ میں تلف ہوگئیں یا میں انھیں تلاش نہ کرسکا۔ ادھر اپنا حال یہ ہے کہ ؎

اِک شخص تھا جو مل نہ سکا عمر بھر مجھے

اس حال میں، کھوئی ہوئی نظموں کو کون ڈھونڈھتا۔ نظموں کا انتخاب میرے عزیز و مکرم دوست (منفرد مزاح نگار) کرنل محمد خان نے کیا۔ کچھ "چھان۔ پورا" چھانٹ کر انھوں نے بھی مجھے واپس بھجوا دیا — "تقریباً" کا لفظ اس لیے بھی لکھا کہ میں ابھی "تقریباً زندہ" بھی ہوں۔

اپنی "کلیات" کی اشاعت پر اگر میں یہ کہوں کہ مجھے خصوصی خوشی نہیں ہوئی تو یہ اتنی بڑی اور ایسی بھیانک منافقت ہوگی جس کا میں متحمل نہیں ہوسکتا۔ میں "سنگِ میل" کے جناب نیاز احمد کا شکرگزار ہوں کہ وہ مجھے اپنی زندگی کے ایک "سنگِ میل" تک لے آئے۔ مجھے اس کتاب کی اشاعت پر ویسی ہی خوشی ہوئی، جیسی اپنے بچوں کے بیاہ پر۔

"تمنّائے حضوری" میں جی ایک طویل دیباچہ لکھنے کا تھا، مگر میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو ہر کام آخر وقت پر ہی کرتے ہیں چنانچہ عموماً صحیح کام بھی غلط کرتے رہے۔ "لمّی چھٹّی - تلی رکابی چھٹّی" —— اگلے دن جب نیاز صاحب نے دیباچہ کے لیے آن دبوچہ اور صرف دو روز کی مہلت دی تو یوں لگا جیسے اچانک کسی سخت آزمائش نے آلیا ہو —— وہ آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا۔

کتاب کی ضخامت نے اور لڑکھڑا دیا۔ ع

کچھ نہ چھوڑا شیخ نے مرنے کے بعد

کاغذوں کی ایک بوری کے سوا

دل میں کچھ شرمندہ بھی ہوا کہ یا اللہ میں تو اپنے پڑھے سے بھی زیادہ لکھ گیا۔ دیباچے میں تو کئی فکری، فنّی، نظری وغیرہ وغیرہ مسائل کو کھنگالنا ہوگا۔ ادھر ایک تو چیل کے گھونسلے میں مال ہی کہاں۔ اُوپر سے حالت یہ کہ —— وقت جب کم رہ گیا تو کام یاد آئے بہت —— اپنی بے بضاعتی کا اندازہ ان سوالات ہی سے ہو گیا جو ذہن میں اس طرح اُٹھ رہے تھے جس طرح رُوس کے خلاف "افغان مجاہدین"۔ یہ دھڑکا الگ کہ اپنا دیباچہ خود لکھتے لکھتے کہیں اپنے پاؤں پر ہی کلہاڑی نہ مار بیٹھیں۔ کہ آدمی کی شہرت دُوسروں کی رائے پر بنتی ہے اور حقیقت اپنی رائے سے آشکار ہوتی ہے۔ من آنم کہ من دانم

چرخے سے پہلا دھاگا ہم نے اپنے خاندان سے نکالنا چاہا کہ چلو وہیں سے بات چلے جہاں سے ہم خود چلے تھے۔ ولادت آغازِ ذات ہوتی ہے۔ گیانیوں کا کہنا ہے کہ بچے کی تربیّت ایک سو برس پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ سوچا اپنے مار کر بھی چھاؤں ہی میں پھینکیں گے۔ مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ خاندان کی کوئی پشت ادب میں ہماری پشت پناہی نہیں کر سکتی تھی۔ تاریخ تو خیر تھی مگر طنطنہ نہ تھا۔ خاندان پر اتنا

عروج کبھی آیا ہی نہیں کہ زوال آ سکتا ——— لوگ جی لیتے تھے چند اِک منتشر لمحات میں !

خیالات بہت آ — جا رہے تھے ۔ مگر ان کا آنا جانا ہم مسلمانوں ہی جیسا تھا کہ بعض بدلیاں دماغ کی طرف جا رہی تھیں تو بعض دل کی طرف ۔ اس کیفیت میں صرف موٹے موٹے اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں' ——— پہلا (اور سب سے موٹا) اشارہ تو وہی اپنی بے بضاعتی اور نارسائی کے احساس کا ہے ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں یہ کلیات اپنی صلاحیّت کے برتنے پر نہیں، بلکہ اپنے قارئین کی شرافت اور ذہانت کے بھروسے پر پیش کر رہا ہوں ۔ ہاں یہ خیال قدرے ڈھارس دے رہا ہے کہ جو شخص غلطی نہیں کرتا' وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔ بعض عارفوں نے تو یہ تک کہا ہے کہ جو شخص کوئی غلطی کرتا ہی نہیں ۔ اُس سے ڈرنا چاہیے ۔

مزاح کی نوعیت و اہمیت اس کے 'چال چلن' وغیرہ کے بارے میں ایک بات تو ہاتھ کے ہاتھ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کو ہنس کر گزارنا رو کر گزارنے سے بہتر ہے ۔ یوں مزاح کے ڈانڈے بھی اندوہ ہی سے ملے ہوئے ہیں ۔ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے — کربِ دلِ آدم ——— آشوبِ عصر ——— لہجہ مختلف بات ایک ——— خون مشترک "شبخون" الگ الگ ۔ ایک جھیل سے نکلتے ہوئے دو دریا ۔ انگریزی زبان کی ایک کہاوت میں بھی تو کہا گیا ہے کہ ——— مایوسی کی حالت میں ہونٹ خود بخود گنگنانے لگتے ہیں ——— ساز یہ بیدار ہوتا ہے اِسی مضراب سے !

کچھ نکات "مرشد" (اُردو کے صاحبِ طرز مزاح نگار) مولانا چراغ حسن حسرت کے ملفوظات اور منہ زبانی پھلجھڑیوں سے بھی ذہن میں روشن ہو گئے ۔ ان کے نزدیک اعلیٰ ترین مزاح وہ ہے جو سوچنے والے کو "کامیڈی" اور محسوس کرنے والے کو ٹریجڈی لگے ۔ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ مزاح زمین کی چیز ہے ۔ ظرافت آسمانوں میں

نہیں ہوتی ۔ ایک قول ان کا یہ تھا کہ انسان اس وقت بالغ ہوتا ہے جب آدمی پہلی مرتبہ اپنے اُوپر ہنستا ہے ۔ ایک مرتبہ تو مولانا نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں اور اس کی گردن پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ —— آدمی موت سے نہیں ڈرتا۔ آرزوؤں کی ناتمامی سے ڈرتا ہے۔ مزاح نگار میں اتنا حوصلہ ہونا چاہیے کہ وہ موت کے سامنے بانسری بجا سکے ۔

"ہور چُوپو" (اور چُوسو) —— مُرشد' (جیسا کہ ان کی عادت تھی) نیازمندوں کو —— کوئی "شارٹ کٹ" بتانے کے بجائے ہمیشہ کوئی لمبا اور کٹھن راستہ بتایا کرتے تھے ہم گھبرا کر اپنی طرف پلٹ آئے۔

میرے لیے طنز کا مسئلہ تکلیف دہ رہا ہے۔ میں طنز کو مزاح کا جڑواں بھائی سمجھتا ہوں ۔ اس بات کا بھی قائل ہوں کہ اس کے بغیر حقیقت پسندی کا عنصر پنپنے نہیں پاتا بلکہ یہ بھی کہ اگر مزاح میں سے طنز کو خارج کر دو تو باقی چربی یا "چرب زبانی" رہ جاتی ہے۔ مزاح بذاتِ خود بھی جمعہ کے لباس میں رہتا ہے۔ میں طنز کو "تیغ و کفن" پہنا کر میدانِ جنگ میں اُتارنے کا قائل نہیں ہوں —— وہ بے شک لڑے مگر ہاتھ میں تلوار نہ ہو۔ "گاف" کے کھیل کو "خراب چہل قدمی" سمجھا جاتا ہے —— اسی طرح طنز کی تلخی —— میرے نزدیک —— مزاح کو بدمزہ اور تک چڑھا کر دیتی ہے ۔ قلم بہت بڑی طاقت ہے ، مگر طاقت کا کام جنگ کرنا نہیں ، جنگ کو روکنا ہے۔ جو مزاح دوسروں کو خوش نہیں کرتا ، وہ میری رائے میں اعلیٰ مزاح نہیں ۔ ضرورت ہو تو آپ بے شک دوسروں کے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ ، مگر ایسے سبھاؤ کے ساتھ کہ دوسرے کے جُوتے چرچرانے نہ پائیں۔

ہمارے "پیرِ طریقت" اکبر الہ آبادی بھی تو کہہ گئے ہیں ؎

وہ ترقی ہے کہ جو کر دے شگفتہ مثلِ گل
وہ کلی کیا جو گریباں چاک ہو کر رہ گئی

مزاح -- زندگی کا نمک ہے۔ اسے دانائی کی بالائی منزل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ احساس کچھ غلط نہیں۔ دنیا میں آزادی ہمیشہ ناکافی ہوتی ہے۔ مگر جن قوموں کی حسِ ظرافت کم یا کھُردری ہوتی ہے وہاں عموماً "مارشل لاء" نافذ رہتا ہے۔ ہماری قومی اسمبلی کا ایک المیہ یہ بھی تو رہا کہ اکثر و بیشتر معزز اراکین میں نہ تو اتنی "حسِ ظرافت" تھی کہ وہ میٹھی اور ملائم گفتگو کر سکیں، اور نہ اتنی قوّتِ فیصلہ کہ خاموش ہی رہیں!

تعریف کسے پسند نہیں۔ ہم تو من حیث القوم تنقید سے کچھ سیکھنے کے بجائے تعریف سے تباہ ہو جانا پسند کرتے ہیں، مگر مجھے اس امر کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ مَیں مزاح کی لطافتوں اور بشاشتوں کا حق ادا نہیں کر سکا۔ میری اپنی خواہش تو صرف چڑیوں، چکوروں، کبوتروں، خرگوشوں وغیرہ کا "چڑیا گھر" بنانے کی تھی۔ مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ ان میں چیتے، لم ڈھینگ، لگڑ بگڑ، بلکہ گدھے تک، میرے روکتے روکتے گھُس آئے ہیں۔ ہزار ہا سُریلے پرندے بُلاتے رہے، مَیں صرف چند ایک کی آوازوں کو شناخت کر سکا۔ اگر کہیں معصومانہ بشاشت کی کوئی لہر متحرک ہو گئی ہو تو اسے میری بے خبری پر محمول فرمائیں اور کوئی بات ناگوار گزرے تو اس کو میری جہالت پر۔ مَیں فن و فکر کی آبیاری میں اپنی آرزو تو کجا اپنی تاب کے مطابق بھی ریاضت نہیں کر سکا۔ افسوس! کہ نامہ بہ برگِ گُل نہ لکھا جا سکا، تاہم اتنا کہہ سکتا ہُوں کہ مَیں نے جس چیز کو چھپنے کے لیے ٹھیک نہ سمجھا، اُس کو لکھنے کے لیے بھی ٹھیک نہیں جانا۔ نہ سُورج کے انتظار میں رات کو اپنے ہاتھ پر بیٹھنے دیا۔۔ بے مائیگی کے آشوب میں دل کو اس خیال سے بہلا لیتا ہوں کہ دُنیا میں کتنے انسان ہیں، جن کی سب خواہشیں پُوری ہو سکیں یا وہ اپنی تمام زندگی، حرف بہ حرف، اپنے اصُولوں کے مطابق بسر کر سکے۔ دنیا میں اتنے لوگ سانپوں کے ڈسنے سے ہلاک نہیں ہوتے

جتنے لوگ اولاد کی خواہش اور بچّوں کی پرورش کے جنجال کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ ہم بھی اسی ہجوم میں شامل تھے۔ غریب ہونے کی توفیق بھی اللہ کسی کسی کو دیتا ہے۔ جنوری ۱۹۹۲ء میں ـــ یہ فقیر (بشرطِ زندگی) اپنی کتابِ زندگی کا ۷۶ واں ورق اُلٹنے والا ہے۔ اربابِ نقد و نظر سے میری ایک ہی گزارش ہے کہ وہ میری عمر کے خیال سے میری اُن کوتاہیوں کو نظرانداز نہ کریں جو مجھ میں ہیں اور اُن چیزوں پر ہنسّی نہ فرمائیں جو مجھ میں نہیں ہیں۔

میرا بچپن گاؤں میں کسانوں کے درمیان گزرا ہے۔ بھیڑ دودہتے ہوئے، دُودھ کی دھاروں کے ساتھ ساتھ، سوچ کے عجیب و غریب، بے ربط، انوکھے انوکھے دھارے چلنے لگ جاتے۔ یہ سطور لکھتے ہوئے بھی جی کی کچھ ویسی ہی کیفیت رہی ـــ اب کے دُودھ ختم ہو گیا اور صرف بیڑ رہ گئی ہے۔ آپ سے اجازت چاہتا ہوں! خدا حافظ!!

سیّد ضمیر جعفری

۱۴۔اگست ۱۹۹۱ء
چک عبدالخالق۔ ضلع جہلم

ما فی الضمیر

میرا انتخابی منشور

خوشا اے ووٹرو! لو میں بھی اِک منشور لایا ہوں
تمنّاؤں کی بھُوری بیریوں پر بور لایا ہوں
بہ صد اصرار اس چوگان میں لایا گیا ہوں میں
بڑی مشکل سے اِن جاڑوں میں گرمایا گیا ہوں میں
میں اپنی خود کشیدہ بھاپ پر آزاد لڑتا ہوں
اکیلا سارے استادوں سے بے استاد لڑتا ہوں
رقیبوں کو بھروسا ہوگا اپنے کارناموں پر
مجھے ہے فخر اپنے ماہرِ فن خانساموں پر

ہر اک دل بند، حاجت مند کو خورسند کر دوں گا
گلی کوچے کی گندی نالیوں کو بند کر دوں گا
'بجٹ' میں کم سے کم رکھوں گا خرچہ کارخانوں کا
مگر تھمنے نہ دوں گا غلغلہ فلمی ترانوں کا
مری جانِ حزیں کا بارِ غم ہلکا نہیں ہو گا
کہ جب تک ہر گلی کے موڑ پر نلکا نہیں ہو گا
نئے اسلوب سے جز بندیِ کار جہاں ہو گی
مرے سب ووٹروں کے گھر میں 'راشن' کی دکاں ہو گی
بشر پر کھول کر سارے 'مساماتِ خرد مندی'
مناسب حد میں رکھیں گے 'زن آزادی و نر بندی'
گزشتہ دو صدی سے سخت 'ٹکسائے' گئے ہو تم
اب آسایش کی جانب گھیر کر لائے گئے ہو تم
کروں گا اور بھی پتلی قبائیں نازنینوں کی
مدارس میں رہیں گی چھٹیاں بارہ مہینوں کی
'کلاسیں' ہی نہ جب ہوں گی تو وہ کس کو پڑھائے گا
ہمارے دور میں ٹیچر فقط تنخواہ پائے گا

روایاتِ کساد و کاہلی چمکائی جائیں گی
جواں مردوں کی زلفیں پاؤں تک لٹکائی جائیں گی
ملائم گفتگو ــــ دیہات کے عرضی گزاروں سے
ضمانت ہم یہ لیں گے کھُردرے تحصیل داروں سے
حوالاتیں تو کچھ ہوں گی مگر 'تھانے' نہیں ہوں گے
پریشانی کے اوپر یہ 'پریشانے' نہیں ہوں گے
یہ کھائے روٹیاں میری، وہ نوچے بوٹیاں میری
چمن میں ہر طرف 'اُڑتی ہوئیں لنگوٹیاں میری

اسلام آباد ــــــــــ ۱۴ فروری ۱۹۷۷ء

❋

شب کو دلیا دَلا کرے کوئی
صبح کو ناشتہ کرے کوئی

اِس کا بھی فیصلہ کرے کوئی
کس سے کتنی حیا کرے کوئی

آدمی سے سلوک دنیا کا
جیسے انڈا تلا کرے کوئی

چیز ملتی ہے ظرف کی حد تک
اپنا چمچہ بڑا کرے کوئی

بات وہ جو کہو سرِ دربار
عشق ، جو برملا کرے کوئی

سوچتا ہوں کہ اس زمانے میں
دادی امّاں کو کیا کرے کوئی

جس سے گھر ہی چلے نہ ملک چلے
ایسی تعلیم کیا کرے کوئی

دل بھی اک شہر ہے یہاں بھی کبھی
اُومنی بس' چلا کرے کوئی

ایسی قسمت کہاں ضمیرؔ اپنی
آگے پیچھے سے 'تا' کرے کوئی

گرد نے ملتان تک اس طرح گردانا مجھے
میری بیوی نے بڑی مشکل سے پہچانا مجھے

فلسفے کا درک بخشا ہے تو اے مولائے کُل
اپنے گھر والوں پہ کچھ آسان فرمانا مجھے

مدّ و جزرِ زندگانی کی بدولت آگیا
ہر قدم پر دو قدم پیچھے سرک جانا مجھے

حلقۂ دانش وراں کی سرگرانی کیا کہوں
بحث کے دوران سو جاؤں تو چونکانا مجھے

عُذر اپنے قتل ہونے میں تو کیا لاؤں گا مَیں
ہاں مگر کانٹے چھری سے میز پر کھانا مجھے

شیخ صاحب میں نے بخشی ساری دنیا آپ کو
آپ دے سکتے نہیں اک خشتِ میخانہ مجھے

زندگی بھر عرضِ مطلب کی تمنّا ہی رہی
میری خاموشی سے بھی یارو سمجھ جانا مجھے

میں کہ ہوں اک مستقل نامنتخب امیدوار
مجلسِ ملّی کے باغیچے میں دفنانا مجھے

یار نے بیزار ہو کر آج خط میں لکھ دیا
موم بتّی لے کے اب ڈھونڈے گا پروانہ مجھے

برطانیا کی دو اَدائیں

ستمبر ۱۹۷۷ میں جب راقم الحروف لندن میں مقیم تھا، انگلستان کے ایک چڑیا گھر میں "وِکٹر" نامی ایک زراف کا انتقال ہو گیا۔ ذیل کے اشعار 'وِکٹر' کی موت پر، برطانیا کے اخبارات، ریڈیو، ٹیلی وژن میں خبریں شذرے، تبصرے اور تصویریں دیکھ سُن کر لکھے گئے۔ پوری قوم سوگ میں ڈوبی ہوئی پائی۔ (ض)

مر گیا ہے اک زراف مورگاہِ لندن میں
قوم سیلِ گریہ میں ڈوبتی سی جاتی ہے
صبح و شام چھپتے ہیں غم گزٹ علالت کے
موت آنجہانی کی اشکِ خوں رلاتی ہے
دل گرفتگی طاری شوخ و شنگ لڑکوں پر
گل سخوں کے چہرے پر سخت بے ثباتی ہے

اس کا ذکر آتے ہی ، اُس کا نام لیتے ہی
آنکھ ڈبڈباتی ہے ، بات تھرتھراتی ہے
ریڈیو سناتا ہے طول و عرض گردن کا
ٹیلی وژن کی ہر مورت اس کی دُم اٹھاتی ہے
نبض تھامے بیٹھے ہیں ۔ دکترانِ نام آور
ایک نرس آتی ہے ، ایک نرس جاتی ہے
چار کھونٹ برپا ہے ماتم آنجہانی کا
غم کی آنچ سچّی ہے ، دل کا درد ذاتی ہے
اِس اتھاہ شفقت میں یہ تضاد بھی دیکھا
امتیاز نسلی کی آگ کسمساتی ہے
یہ عجیب بستی ہے ، نفرت و محبت کی
جانور کو روتی ہے ، آدمی کو کھاتی ہے

۱۔ بائرن ایونیو۔ ہنس لو، لندن ــــــــــ ۲۱ ستمبر ۱۹۷۷

پُرزے پُرزے کیوں ہوا دامانِ جاں مجھ سے نہ پوچھ
میں کوئی درزی ہوں! چل ہٹ اے میاں مجھ سے نہ پوچھ

یہ ترے حُقّے کی ٹوپی تیرے سر پر تھی کبھی
یہ نہیں ہے وہ تو پھر ہے وہ کہاں؟ مجھ سے نہ پوچھ

"اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی"
زندگی کی ٹنکیاں اور نلکیاں مجھ سے نہ پوچھ

میں تو جلسے میں نہایت منہمک بیٹھا رہا
بانس لے کر اُڑ گیا کب سائباں مجھ سے نہ پوچھ

جہل غالب علم پر کیوں؟ مونچھ ڈاڑھی سے بڑی
یہ جہاں تیرا ہے اے ربِّ جہاں مجھ سے نہ پوچھ

اپنی ہانڈی خود پکا مسٹر اگر زندوں میں ہے
کونسی اچھی ہے 'پچھوں' کی دکاں مجھ سے نہ پوچھ

ووٹ کی تھی ایک پرچی، سو وہ تجھ کو ڈال دی
اب جو تو چاہے وہ کر، 'جانِ جہاں' مجھ سے نہ پوچھ

آبگینوں پر طمانچے، آنگنوں میں راکھ دیکھ!
کاروبارِ شہرِ نو بالشتیاں، مجھ سے نہ پوچھ

اے ادیب اپنا قلم مت دیکھ، اپنی کار دیکھ!
لُٹ گیا کیوں کوچۂ دانشگراں، مجھ سے نہ پوچھ

وہ ضمیرِ بے نوا، وہ اک فقیرِ حال مست
ایسے بندوں کا فلاں ابنِ فلاں مجھ سے نہ پوچھ

جو اِنساں نوعِ انسانی کا استحصال کرتے ہیں
نہایت ریشمیں الفاظ استعمال کرتے ہیں

کبھی اِک سال میں ہم 'مجلسِ اقبال' کرتے ہیں
پھر اس کے بعد جو کرتے ہیں وہ قوّال کرتے ہیں

جہاں میں زور و زر والے، ہنر والے، خبر والے
عموماً دوسروں کا مال — استعمال کرتے ہیں

گِلہ کیسا گلی کوچے کی مخلوقِ فراواں کا
یہ وہ کرتے ہیں جو اُن کے گرُو گھنٹال کرتے ہیں

بسا اوقات کھُلتا ہی نہیں منشا حسینوں کا
قمیصیں سبز رکھتے ہیں دوپٹّے لال کرتے ہیں

جہاں کی تیز رفتاری کو روکا تو ہے کچھ ہم نے
ہمیں جو آج کرنا ہے وہ اگلے سال کرتے ہیں

کوئی دن تو طلوعِ عظمتِ انساں کا دن ہو گا
چلو ہم آج اپنا آپ استقبال کرتے ہیں

بچارہ مردِ مومن بھی تو آخر پیٹ رکھتا ہے
مجاہد لوگ بھی روٹی تو استعمال کرتے ہیں

میاں کا مشغلہ پوچھا تو بیوی نے یہ بتلایا
وہ پہلے ڈاکٹر[1] تھے، آجکل ہڑتال کرتے ہیں

جزاک اللہ ضمیرؔ اس تیرے طرزِ نَے نوازی پر
ترے اشعار آنسو ہیں مگر خوشحال کرتے ہیں

---

[1] جن دنوں یہ اشعار لکھے گئے ڈاکٹر صاحبان نے اپنے بعض مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کر رکھی تھی۔

نام لکھوا کے خاکساروں میں
لوگ بیٹھے رہے چباروں میں

یہ ملاوٹ زدہ جواں دیکھو
پھول کملا گئے بہاروں میں

اب بھلا قرب رہبراں کیسا؟
اب ہوا بھر گئی غباروں میں

قوم کچھ اور بھی ہوئی ٹیڑھی
جب سے راشن ملا قطاروں میں

منفرد ہیں کسی تو مد میں ہم
پہلا نمبر ہے قرضداروں میں

ہم نے ہر انقلاب کو دیکھا
کچھ نئے کارکن تھے کاروں میں

کیا 'چچا سام' کا سیام ہیں کام
یہ لڑائی ہے رشتہ داروں میں

ریواز کی تصویر

[اسلامیہ کالج لاہور کے ’ریواز ہاسٹل‘ کی چند جھلکیاں
ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری کی ایک مقبول نظم کی ’پیروڈی‘ —— موصوف
سے معذرت کے ساتھ]

معرکہ درپیش ہے ریواز کی تفسیر کا
طالبانِ علم و فن کی بزمِ خوش تقدیر کا
کھینچ کر نقشہ دکھانا ہے پلاؤ کھیر کا
کھیر کا کھانا مگر لانا ہے جوئے شیر کا
شاعری میں باندھنا ہے دیکھیے کفگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

بلّیاں یہ 'زردہ پروردہ' ہماری بلّیاں
یہ پُلاؤ خور، فیرینی کی ماری بلّیاں
موٹی موٹی، پتلی پتلی، بھاری بھاری بلّیاں
کاروباری بلّیاں، بے اعتباری بلّیاں
غل ہے جن کے نغمۂ بیتابِ لقمہ گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریلواز کی تصویر کا
'فسٹ ایئر' والوں کی گھبرائی ہوئی سی ٹولیاں
کمسن "ہمجولوں" کی شرماتی ہوئی "ہمجولیاں"
میٹھے میٹھے قہقہے یہ پیاری پیاری بولیاں
اِن سے کھیلی جا رہی ہیں شور لے کی ہولیاں
اِن کے کپڑوں پر گماں گُلمرگ کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریلواز کی تصویر کا
پاس کی گلیوں میں بچّوں کو سُلاتی لوریاں
کُرکُن 'لوٹوں' کا اغوا، صابنوں کی چوریاں
چوریاں اور خوبرو چوروں کی سینہ زوریاں
صبحوں کی خاموشیاں، راتوں کی شوراشوریاں

چہچہے بے فکریوں کے شور دار و گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

رُوزِ فیشن[1]، مطبخوں کا آب و دانہ دیکھیے
جھومنا، گانا، بپھرنا، جگمگانا دیکھیے
دانہ دانہ چُن کے، بُن کے، دُھن کے کھانا دیکھیے
چل رہا ہے زندگی کا کارخانہ دیکھیے
"سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا"
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

خوبصورت اچکنیں، زرکار جوتوں کی بہار
ہر طرف پنجاب کے طُرّے قطار اندر قطار
رات کی جاگی ہوئی آنکھوں میں خوابیدہ خمار
پالتو مونچھیں، گھنیری، لہلہاتی، سایہ دار
ہے گماں اک ایک نوکِ مُو پہ نوک تیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

کچھ "پڑھاکو" — کورسوں کو بھی غذا سمجھے ہوئے
زندگی کو اِک مشقّت کی سزا سمجھے ہوئے

---

[1] خاص پکوان کے دن کو "فیشن ڈے" کہا جاتا ہے۔

پاس ہونے کے لیے ہر نا روا سمجھے ہوئے
دل محمدؐ[1] کے خلاصوں کو خدا سمجھے ہوئے
"نقش فریادی ہے جن کی شوخیِ تحریر کا"
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

جہلم و چناب کے خاصانِ طرّہ باز دیکھ
اُس کی زلفِ سُنبلیں، اس کی نگاہِ ناز دیکھ
اُن کے حجروں میں کتابوں سے زیادہ ساز دیکھ
گت پہ طبلے کی رَیاضِ علم کے انداز دیکھ
ہر کوئی رانجھا کسی اپنی خیالی ہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

فیل ہو ہو کر جو بن جاتے ہیں ابطالِ عظیم
جو ہیں اک مدّت سے اِن محبوب حجروں میں مقیم
اپنے استادوں کے بھائی بند، یارانِ قدیم
کتنی ہڑتالوں کے بانی، کتنے جلسوں کے زعیم
جذبہ ناپیدا مگر غُل نعرۂ تکبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

---

[1] ریاضی کے نامور استاد، پروفیسر خواجہ دِل محمدؐ مرحوم۔

تنگنائے کیوبیکل میں شاعروں کا اِک ہجوم
پچھلی دو صدیوں کے مستعمل تخلّص بالعموم
ان کے شعرِ تر کی ہے پورے عرب ہوٹل میں دُھوم
ان کی صورت دیکھ کر میں جھومتا ہوں تو بھی جھوم
کچھ ہنر ہے تاجوَر[1] کا، کچھ اثر تاثیر[2] کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

۱۰۵۔ ریواز ہوسٹل اسلامیہ کالج لاہور ——— ۱۹۳۸ء

---

[1] علّامہ تاجوَر نجیب آبادی۔ [2] پروفیسر ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر مرحوم

آتشدان کے حضور

[ٹین کا وہ گرانڈیل بادبانی ساخت کا آتشدان جو فرش سے اُٹھ کر کمرے میں اِدھر اُدھر گردش کرنے کے بعد چھت سے نکل جاتا ہے]

میرے کمرے میں جو یہ دل سرد آتشدان ہے
جنگِ عالمگیر کا ہارا ہوا جاپان ہے

فرش و عرش و میز و کرسی بام و دَر کے درمیاں
چپ کھڑا ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

شعلہ کیسا ایک چنگاری نکل سکتی نہیں
برف جم سکتی ہے اِس میں آگ جل سکتی نہیں

بے چمک ، بے نور ، لیکن دور تک پھیلا ہوا
مالٹا سے چل کے سنگاپور تک پھیلا ہوا

کوئلہ ایسا کوئی مردِ خدا پیدا کرے
جو اِس آتش دان کے دل میں جِلا پیدا کرے

ہم نشیں آ اِس کے ڈھانچے کو بجا کر تال دیں
دینے والوں کو دعائے دولت و اقبال دیں

(کیمرون ، ہائی لینڈ) ——————— ۱۹۴۵ء

مجھے ذوقِ تماشا لے گیا تصویر خانوں میں

مرے پیشِ نظر ہے ایک سستے ریٹ کا سنما
پرانے شہر کے سب سے پرانے گریٹ کا سنما
وہ دیکھو اُکھڑا اُکھڑا اک اناڑی شہسوار آیا
کہ خود اُس پر تو رحم آیا مگر گھوڑے پہ پیار آیا
وہ شور اٹھتا ہے اونچی سیٹیوں کا فحش گانوں کا
کہ جیسے کوئی ہنگامہ الیکشن کے زمانوں کا
اِدھر تو پردۂ تصویر پر تصویر جاری ہے
اُدھر جملہ صفوں سے نعرۂ تکبیر جاری ہے

اِدھر جب سطحِ سیمیں پہ کوئی عورت دکھائی دی
تو بچّوں نے اُدھر آغوشِ مادر کی دُہائی دی
جو 'پکچر' میں ذرا سا بھی 'وصالِ یار' ہو جائے
تو 'اہلِ دِل' کو پوری زندگی دشوار ہو جائے
اُدھر جب 'نرگسوں' اور 'کرگسوں' میں سامنا ہو گا
اِدھر عشّاقِ دل بر دست میں محشر بپا ہو گا
کبھی رقصِ مسرّت میں، کبھی جوشِ رقابت میں
براہِ راست سب شامل ہیں ہیرو کی محبّت میں
یہاں جب فلم اکثر اتفاقاً ٹوٹ جاتی ہے
تو اہلِ ذوق کی نبضِ تحمّل چھوٹ جاتی ہے
ہجومِ عام سے اُٹھّی ہزار اقسام کی گالی
کبھی اِس نام کی گالی، کبھی اُس نام کی گالی
وہ دیکھو ایک اونچے پیڑ پر گانے لگا ہیرو
محل تو تھا یہ رونے کا مگر گانے لگا ہیرو
اکیلے ہاتھ سے دس بیس تلواریں چلاتا ہے
جہاں چڑھنا بھی مشکل ہے وہاں سے کود جاتا ہے

یہ جب نکلے گا موٹر لے کے ٹکّر کھا کے آئے گا
بڑی محنت سے کوئی حادثہ فرما کے آئے گا
اگر مفلس ہے خود تو عشق مالا مال لڑکی سے
وگرنہ ڈھونڈ کر قلّاش و خستہ حال لڑکی سے
محبّت میں خیالِ خود کشی پیہم ضروری ہے
کہ مرنا سخت لازم اور جینا کم ضروری ہے
نہ جانے کتنی کنیاؤں سے عہدِ اُستواری ہے
کہ 'ہیرو' اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
مکلّف سُوٹ پہنے ہے، بھرا قد کاٹھ رکھتا ہے
نئے سیٹھوں، کنوارے افسروں کا ٹھاٹھ رکھتا ہے
نہ گھبراؤ نہ گھبراؤ اگر یہ مر بھی جائے گا
تو ہیروئن کی شادی پر یقیناً لَوٹ آئے گا
یہ عورت چال اور افعال سے مردانہ لگتی ہے
کبھی سلطان لگتا ہے کبھی سلطانہ لگتی ہے
جو شب کے دو بجے سلطانہ از جمخانہ می آئی
تو ماں نے کھانس کر پوچھا — "چرا دُزدانہ می آئی"

بہو کی جھلملاتی اوڑھنی میں ساس لگتی ہے
اگر غازہ نہ ہو رُخ پر نری بکواس لگتی ہے

جو تھانیدار دکھلایا گیا وقتِ گرفتاری
"سُراپا" نیم سرکاری، موٹاپا غیر معیاری

ہیروئن بھی پرانی مہرباں معلوم ہوتی ہے
بسا اوقات تو ہیرو کی ماں معلوم ہوتی ہے

بغیرِ سازو نغمہ خودکُشی بھی کر نہیں سکتی
کہ جب تک ٹھمریاں "ٹھمرانہ" لے گی مر نہیں سکتی

نظر آتا ہے جو چہرہ پری تمثال ہے گویا
یہ دنیا خوبصورت لڑکیوں کا ٹال ہے گویا

کلیجہ تھام لو مُجرے کی محفل جمنے والی ہے
یہ محفل جم گئی صاحب تو پھر کب تھمنے والی ہے

گھنیرے تاڑ کے جنگل سے قوّالوں کی آوازیں
کئی صدیوں کی تالوں پر کئی سالوں کی آوازیں

میاں قوّال نے لٹ اس طرح لٹکا کے رکھّی ہے
کہ جیسے ریس کے گھوڑے نے دُم کترا کے رکھّی ہے

دلن اُسے کوئی یہ کہہ دے کہ اتنا بھی نہ اِترائے
مبادا ناک بھر جائے، مبادا مونچھ گر جائے
لڑائی میں رقیبوں سے وہ "اسلوبِ رواداری"
"نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری"
کئی زخموں سے چہرہ مستقل گُل رنگ ہے اس کا
شریفوں کے محلّے میں محاذِ جنگ ہے اس کا
جو 'میک اپ' میں محلّے کا میاں رمضان ہے کوئی
یہ مغلوں کے زمانے کا مہابت خان ہے کوئی
جسے بہروپیا سمجھے تھے ہم "شاہِ جہاں" نکلا
ہنسی آتی ہے 'بے چارہ کہاں ڈوبا، کہاں نکلا
ابھی کیا ہے، ابھی اِک گیروا سادھو بھی آئے گا
فقط آنے کے کیا معنی' وہ گانا بھی سنائے گا
وہ دیکھو لب ہلے، گا کر رہے گا، جانتے ہیں ہم
ہمارے گھر ہی کا تو مال ہے پہچانتے ہیں ہم
یہ آتے ہی رُخِ حالات فوراً موڑ دیتا ہے
کہانی کے سب اجزائے پریشاں جوڑ دیتا ہے

ہمارا اور اِس سادھو کا یارانہ پرانا ہے
کہ اِک مُدّت سے ہر "پکچر" میں اس کا آنا جانا ہے
جو قبرستان سے شادی کی شہنائی اُبھر آئی
تو وسطِ شہر میں دیوارِ تنہائی نکل آئی
کہانی میں جوانی اس طرح چھلکائی جاتی ہے
کہ چکنائی تو آتی ہے مگر دانائی جاتی ہے
جو موہن مصرعیاں "فرمایشاً" لکھوائی جاتی ہیں
جو فیتہ ڈال کر پیمایشاً بنوائی جاتی ہیں
اُدھر اِک طائفۂ "فلم استاران" می رقصد
اِدھر اصحابِ "بأٹکٹان و بے ٹکٹان" می رقصد
بلیغ الدّین دَر دل، اندرونِ جان می رقصد
محمد خان جب رقصد علی الاعلان می رقصد

۱۹۴۴ء ______________

نام کی ضرورت

قوم کو کام کی ضرورت تھی
اور مجھے نام کی ضرورت تھی

تیرے کوچے میں کل رقیبوں سے
بلوۂ عام کی ضرورت تھی

میں سمجھتا تھا دوستی جس کو
وہ فقط کام کی ضرورت تھی

کون ؟ ناصح ! مگر حضور مجھے
آج آرام کی ضرورت تھی

جنکنز اور جینی

مضبوط ہو گیا ہے، چپک کر مشین میں
رشتہ نیاز مند میں اور نازنین میں
مصرعے الگ الگ ہیں مگر اِک زمین میں
جنکنز "جین" میں ہے تو "جینی" بھی "جین" میں

لندن ——— ۵ اکتوبر ۱۹۷۷

صاحب کی بپتا

۱۹۴۶ء کے اقتصادی بحران میں، بندھی ٹکی آمدنی والا طبقہ، جو دوسری جنگِ عالمگیر کے دوران مصنوعی معیارِ زندگی کا عادی ہو چکا تھا، بطورِ خاص متاثر ہوا تھا۔

—————— (دہلی)

خانساماں ہے مُصر ہر شب چکن بنوائیے
حاضری پر حاضر و غائب ٹماٹر کھائیے
جیب کہتی ہے چھری کانٹے فقط کھڑکائیے
لنچ پر شلجم، ڈنر میں توریاں فرمائیے

مطبخوں میں بوئے جوئے مولیاں، ٹَن ٹَن میاں[1]
دیو کی نندن ہو یا گُل شیر خاں ٹَن ٹَن میاں

---

[1] کھسیانی ہنسی کے اظہار کے لیے اتنی ہی بے معنی آواز

کھُردرے پالش سے خستہ بُوٹ چمکائیں گے کیا؟
تُخنت پوشی درزیوں سے سُوٹ سِل جائیں گے کیا؟
"ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟"
بیویوں کو کوئی سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا؟

بج رہی ہیں جن کی خالی چوڑیاں ٹَن ٹَن میاں
دیو کی نندن ہو یا گُل شیر خاں ٹَن ٹَن میاں

یا الٰہی خیر، رکھّا ہے نیا بیرا جو آج
یہ نہ سمجھے گا کبھی میری غریبی کا مزاج
لے چُکا ہے، لارڈ اور لیڈی مڈلٹن سے خراج
اپنی یہ حالت کہ گھر میں ڈھب کی چھلنی ہے نہ چھاج

صاحب آزردہ ہے، بندہ بدگماں، ٹَن ٹَن میاں
دیو کی نندن ہو یا گُل شیر خاں، ٹَن ٹَن میاں

مِل گیا بنگلہ مقدّر سے تو ہریالی نہیں
حضرتِ والا نے کُتّی گھاس تک پالی نہیں
اِس بیاباں میں کوئی بُوٹا نہیں، ڈالی نہیں
آہ یہ کوٹھی کہ ویراں ہے مگر خالی نہیں

لُٹ گئے سب اِس کے گملے گملیاں ٹَن ٹَن میاں
دیو کی نندن ہو یا گُل شیر خاں ٹَن ٹَن میاں

لیڈری کا شوق ، ذوقِ مینا بازاری بھی ہے
گھر کی مجبوری بھی جمخانے کی لاچاری بھی ہے
فلم پر تنقید فرمانے کی بیماری بھی ہے
ہر ادا بیگم کی منھگی ہے مگر پیاری بھی ہے

عشق اور اندیشۂ سود و زیاں ! ٹَن ٹَن میاں
دیو کی نندن ہو یا گُل شیر خاں ، ٹَن ٹَن میاں

والدِ ماجد کا طنزِ تلخ و پیہم اور ہم
مامتا کا دیدۂ بیدار پُرنم اور ہم
مستقل روٹھی ہوئی بیگم کی بم بم اور ہم
گھر میں یہ پھیلی ہوئی اولادِ آدم اور ہم

سر گراں ہیں جن کی مَیلی ٹوپیاں ٹَن ٹَن میاں
دیو کی نندن ہو یا گُل شیر خاں ٹَن ٹَن میاں

ہو چکے ہیں جب سے نینی تال و دہرہ دون بند
بکس میں ہیں جودھپوری کوٹ اور پتلون بند

ساغر و مینا میں اجمل خان کی معجون بند
صبح کے مضمون ساکت، شام کے شبخون بند

جاؤ جمنا پر بجاؤ گھنٹیاں، ٹَن ٹَن میاں
دلو کی نندن ہو یا گُل شیر خاں، ٹَن ٹَن میاں

یاد ایّامے کہ بازاروں میں ارزانی بھی تھی
نوعِ انسانی میں کچھ توفیقِ نادانی بھی تھی
نوکری میں بندگی تو تھی، سلیمانی بھی تھی
دن کی مزدوری مگر راتوں کی سلطانی بھی تھی

اے مرے دل! ٹَن ٹَنان! اے میری جاں! ٹَن ٹَن میاں
دلو کی نندن ہو یا گُل شیر خاں، ٹَن ٹَن میاں

آ رہے ہیں ہم

ہر سانس میں بیان دِیے جا رہے ہیں ہم
سمجھے ہوؤں کو اور بھی سمجھا رہے ہیں ہم

صابن دیارِ یار سے منگوا رہے ہیں ہم
لو اب لباسِ فقر کو دھلوا رہے ہیں ہم

میں نے کہا تھا اک خمِ کا کُل تو بھیج دو
بولے کہ لو تمام چلے آ رہے ہیں ہم

اندازِ ربط و ضبطِ محبّت تو دیکھیے
وہ جھوٹ بولتے ہیں قسم کھا رہے ہیں ہم

مانگی ہوئی ہنسی بھی بڑی پوچ چیز تھی
ہنسنے پہ یہ گماں تھا کہ شرما رہے ہیں ہم

واعظ کے ساتھ ہی سرِ ممبر لٹک گئے
کیا نعمتیں حیات کی ٹھکرا رہے ہیں ہم

یہ اپنے اپنے عَجز و مقدّر کی بات ہے
بوتے نہیں اناج مگر کھا رہے ہیں ہم

اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

(۱)

اسی میں ملّت بیضا سما جا، کود جا، بھر جا
تری قسمت میں لکھا جا چکا ہے تیسرا درجہ
نہ گنجایش کو دیکھ اس میں نہ تُو مردم شماری کر
لنگوٹی کَس، خدا کا نام لے گھس جا سواری کر
عبث گِننے کی یہ کوشش کہ ہیں کتنے نفوس اس میں
کہ نکلے گا بہ ہر عنوان تیرا بھی جلوس اِس میں
وہ کھڑکی سے کسی نے 'مورچہ بندوں' کو للکارا
پھر اپنے سر کا گٹھّڑ دوسروں کے سر پہ دے مارا
کسی نے دوسری کھڑکی سے جب دیکھا یہ نظّارہ
زمیں پر آ رہا دھم سے کوئی تاجِ سرِ دارا

اگر یہ ریلوے کا سلسلہ ایران جا پہنچے
تو سکھّر پر اُترتا شخص اصفہان جا پہنچے
یہ ، سارے کھیت کے گنّے کٹا لایا ہے ڈبّے میں
وہ ، گھر کی چارپائی تک اُٹھا لایا ہے ڈبّے میں
کسی پیچاک میں صیقل کلہاڑا جگمگاتا ہے
کسی روزن سے اک کالا سلیپر منھ کو آتا ہے
کھڑے حُقّے ہیں مع مینارِ آتشدان تو دیکھو
یہ ، قوم بے سر و سامان کا سامان تو دیکھو
وہ ، اک رسّی میں پورا لاؤ لشکر باندھ لائے ہیں
یہ ، بستر میں ہزاروں تیر و نشتر باندھ لائے ہیں
صراحی سے گھڑا ، روٹی سے دسترخوان لڑتا ہے
مسافر خود نہیں لڑتا مگر سامان لڑتا ہے
جو نعمت چاہ سے جس بھاؤ بھی منگوائی جائے ہے
نہ کافر پھینکی جائے ہے نہ ظالم کھائی جائے ہے

وہ اک دانائے کُل ' لوگوں میں یوں گھل مل کے بیٹھے ہیں
رضائی میں بجو یوں بیٹھے ہیں گویا سل کے بیٹھے ہیں

عوام النّاس کو درسِ فلاحِ عام دیتے ہیں
بہر سُو تھوتھو کرنے کا فرض بھی انجام دیتے ہیں

اُدھر کونے میں جو اک مجلسِ بیدار بیٹھی ہے
کرائے پر الیکشن کے لیے تیّار بیٹھی ہے

سیاست میں دما دم اپنا چمچہ مارتے جائیں
اگرچہ ہارتے جائیں مگر للکارتے جائیں

اگرچہ سبز چارے کا وہاں توڑا نہیں کوئی
تعجّب ہے کہ نیلی بار میں گھوڑا نہیں کوئی

"بڑے لمڈے کو مولا بخش جی کتنا پڑھاؤ گے؟
اُسے بی اے پہ روکو گے کہ ایل ایل بی کراؤ گے؟"

"وہ بی اے ہے مگر بی اے کی خُو آئی نہیں اس کو
ابھی ماں باپ کے کپڑوں سے بُو آئی نہیں اس کو"

بہم یوں گفت گو میں آشنائی ہوتی جاتی ہے
لڑائی ہوتی جاتی ہے صفائی ہوتی جاتی ہے

تمناؤں کے نغمے چوڑیوں میں گنگناتے ہیں
پھر اِس کورس میں سب موجود بچّے سُر ملاتے ہیں

دریچوں سے ہویدا جس کی شانِ کجکلاہی ہے
یقیناً یہ گٹھیلا نوجواں — فوجی سپاہی ہے
کسی دھندلے سے اسٹیشن پہ آدھی رات اترے گا
یہ صندوقوں کا سب لشکر بھی اس کے ساتھ اترے گا
چمکتی سائینس — رومال، شیشے، تیل بکسوں میں
خوشی کے کھیل بکسوں میں، دلوں کے میل بکسوں میں
ادھر کچھ ماورائے این دآں فن کار بیٹھے ہیں
کہ جیسے گھوٹکی میں بھی سمندر پار بیٹھے ہیں
طبیعت ہی کچھ اس درجہ کی آتش گیر ہے ان کی
کہ انجن سے زیادہ گرم کُن تقریر ہے ان کی
کس اطمینان سے لالہ سمندر خان سوتے ہیں
لٹا کر ساتھ اپنے اپنا کُل سامان سوتے ہیں
میاں رمضان یوں 'فِٹ' ہو گئے ہیں پیش منظر میں
سر و شانہ ترازو میں — بقایا دھڑ کنستر میں
جنابِ نازؔ اپنے پانداں پر چھا کے بیٹھے ہیں
بیاضِ شعر بھی آغوش میں پھیلا کے بیٹھے ہیں

عطائی اک طلسمی مومیائی لے کے آیا ہے
یہ مادر زاد اندھا روشنائی لے کے آیا ہے
وہ آپہنچا کوئی چمٹا بجا کر مانگنے والا
بہت مقبول ہے لوگوں میں گا کر مانگنے والا

کسی نے یوں گھریلو گفتگو پر زور ڈالا ہے
کہ جیسے اگلے اسٹیشن پہ رشتہ ہونے والا ہے
"زمیں آباد کتنی اور غیر آباد کتنی ہے؟
تری تنخواہ کیا ہے؟ خیر سے اولاد کتنی ہے؟"
"دمِ ہجرت چچا مرحوم اپنے ساتھ کیا لائے؟"
"زر و زیور وہیں چھوڑا مگر حقّہ اُٹھا لائے"

ودیعت جس قدر راہی کو ہے توفیقِ جاں کاہی
اسی نسبت سے موٹی ہے لحافوں کی خود آگاہی
وہی اس بھیڑ میں کچھ سرکش و بازو کشادہ ہے
صراحی جس کی اونچی ہے ٹفن جس کا زیادہ ہے

جن کو تھے مرغوب لہنگے جھنگ کے
اب وہ قائل ہیں قبائے تنگ کے

بے خودی میں بھی سلیقہ چاہیے
یعنی گملے میں ہوں بوٹے بھنگ کے

تم بھی سیدھی بات کہتے ہو ضمیرؔ
تم بھی شاعر ہو پرانے رنگ کے

✻

بر سرِ اقتدار ہیں ہم لوگ
دوسروں پر سوار ہیں ہم لوگ
زندگی آرزو ہے مرنے کی
موت کے رشتہ دار ہیں ہم لوگ
کس کی حاجت روا کرے کوئی
کس قدر بے شمار ہیں ہم لوگ
ٹھہریے عرضِ مدّعا سُنیے
آپ کے نام تار ہیں ہم لوگ

مہمان کا سامان

(اسلام آباد کے کوارٹروں میں)

جنابِ والا کہ یہ سات منزلہ صندوق!
کسی مکاں کے لیے ہے کہ لامکاں کے لیے؟

جناب اس کا اگر ایک پٹ اُکھیڑ سکیں
تو کام آئے محلّے میں سائباں کے لیے

جناب نے جو گھڑایا ہے اِس زمانے میں
کبھی بنا تھا تجمّل حسین خاں کے لیے

جناب اِس میں جو سامان ٹُھنس کے لائے ہیں
یہ خانداں کے لیے ہے کہ سب جہاں کے لیے

لحاف، تکیے، ترازو، تنُدور غرضیکہ!
"صلائے عام ہے یارانِ نُکتہ داں کے لیے"

جناب خود ہی بتائیں کہ ہم کہاں رکھیں!
نہ یہ زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے

۱۹۶۲ء —————

وبائے الاٹمنٹ

ہر سمت ہے بلند صدائے الاٹمنٹ
ہائے الاٹمنٹ تو وائے الاٹمنٹ
دنیا ہے اور دینِ ولائے الاٹمنٹ
اب لوگ جی رہے ہیں برائے الاٹمنٹ
بندوں کا اب خدا ہے خدائے الاٹمنٹ

چکی ملے، مشین ملے، بادباں ملے
پانی ملے، زمین ملے، آسماں ملے
کچھ تو مری جناب ملے، مہرباں ملے
ہر چند حق نہیں ہے مگر پھر بھی ہاں ملے
یعنی الاٹمنٹ برائے الاٹمنٹ

رہڑی جو بیچتا تھا اُسے فیکٹری ملی
پورے تعلّقے کے عوض لانڈری ملی
اک در ہوا جو بند تو بارہ دری ملی
ووٹر کوئی ملا نہ ملا لیڈری ملی
اور لیڈری بھی وہ جو کرائے الاٹمنٹ

کتنے مہاجرین تو آکر چلے گئے
پٹ توڑ کر، کواڑ جلا کر چلے گئے
دیوار و در کو ٹھوک بجا کر چلے گئے
یعنی مکیں مکاں ہی اٹھا کر چلے گئے
ہے سر پہ ساتھ ساتھ ہُمائے الاٹمنٹ

کل تک گلی کے موڑ پہ جو کُوٹتے تھے ٹین
تختہ بدوش، ٹھیلا بدست و تھڑا نشین
اک اک کے پاس آج مشینیں ہیں تین تین
اکثر بزرگ اِن میں ہیں لوکل مہاجرین
بیٹھے ہیں دبدبے سے دبائے الاٹمنٹ

چہرے پہ میرے یار کے تازہ نکھار دیکھ
کیا روشنی کی چھوٹ ہے مونچھوں کے پار دیکھ
موٹر پہ اُڑ رہا ہے وہ تُلّا کمہار دیکھ
"ہے دیکھنے کی چیز اِسے بار بار دیکھ"
اے مرحبا یہ حسنِ ادائے الاٹمنٹ

کوٹھی میں بود و باش کا گھمسان دیکھیے
یہ، زندگی کا چاکِ گریبان دیکھیے
مٹھی سے وہ اُٹا ہوا گلدان دیکھیے
جیسے گھسا ہو روس میں جاپان دیکھیے
ہاں دیکھیے کہ جو بھی دکھائے الاٹمنٹ

پیادے ہوئے سوار کوئی پوچھتا نہیں
اچھّوں کا حالِ زار کوئی پوچھتا نہیں
پیسے ہیں چار چار کوئی پوچھتا نہیں
"پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں"
خاموش زیرِ مشقِ جفائے الاٹمنٹ

۱۹۴۹ء ———

مہذّب بیبیوں کا رقص جاری ہے جہاں میں ہوں
مؤدّب شوہروں پر وجد طاری ہے جہاں میں ہوں

بہت دن عورتیں سہتی رہی ہیں جبرِ محکومی
مجھے ڈر ہے کہ اب مردوں کی باری ہے جہاں میں ہوں

ضمیرِ جعفری تم شکل و صورت ہی کو روتے ہو
یہاں تو عقل و دانش بھی اُدھاری ہے جہاں میں ہوں

...روزے سے ہوں

مجھ سے مت کر یار کچھ گفتار، میں روزے سے ہوں
ہو نہ جائے تجھ سے بھی تکرار، میں روزے سے ہوں

ہر کسی سے کرب کا اظہار ، میں روزے سے ہوں
دو کسی اخبار کو یہ تار، مَیں روزے سے ہُوں

میرا روزہ اک بڑا احسان ہے لوگوں کے سر
مجھ کو ڈالو موتیے کے ہار، میں روزے سے ہوں

میں نے ہر 'فائل' کی ڈھچی پر یہ مصرع لکھ دیا
کام ہو سکتا نہیں سرکار، میں روزے سے ہوں

اے مری بیوی! مرے رستے سے کچھ کترا کے چل
اے مرے بچّو! ذرا ہشیار میں روزے سے ہوں

شام کو بہرِ زیارت آ تو سکتا ہوں ـــــ مگر
نوٹ کرلیں، دوست رشتہ دار، میں روزے سے ہوں

تو یہ کہتا ہے بہ لحنِ تر کوئی تازہ غزل
میں یہ کہتا ہوں کہ برخوردار، میں روزے سے ہوں

عید ملن

جس کے گھر بھی جائیے ، کچھ پینا ہے کچھ کھانا ہے
حلوۂ بیگانہ ہے اور بلوۂ مستانہ ہے
شوق کا اندازہ ہے نے بھوک کا پیمانہ ہے
دل کو سمجھانے سے کیا حاصل کہ دل دیوانہ ہے
پیٹ تر لقموں کا اک بھاری مسافر خانہ ہے
یومِ عید الفطر یارو یومِ آب و دانہ ہے

سرد فیرینی بہ مرغِ آشیانہ — کھائیے
خُرمائے شیریں بہ ظرفِ بیکرانہ — کھائیے
مخلصانہ دیکھیے پھر والہانہ — کھائیے
تر سویّوں کو تو بالکل عاشقانہ — کھائیے
لغزشِ مستانہ بھی اک سجدۂ شکرانہ ہے
یومِ عید الفطر یارو یومِ آب و دانہ ہے

ہے میسّر آج تو شُربِ عرب، نانِ عجم
اُڑ کے ہر دانے پہ گرا اے طائرِ بامِ حرم
زندگی؟ اللہ بس، باقی ہوس، کل تم نہ ہم
"فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم"
پیٹ اِک مُحکم حقیقت، دل فقط افسانہ ہے
یومِ عید الفطر یارو یومِ آب و دانہ ہے

رندِ خوش اوقات کے ہاں لطف انگیزی سے کھا
دوستوں کے گھر خوش آمیزی سے جانیزی سے کھا
مشرقیّت کی فضا میں 'فقرِ پرہیزی' سے کھا
ورنہ انگریزی میں ہنس ہنس کر دلآویزی سے کھا

کٹکری اور بٹلری ، ٹپکانا اور نپکانا ہے
یومِ عید الفطر یارو یومِ آب و دانہ ہے

رسمِ دیدِ عید کی تمہید سے فوراً سنبھل
وقت کم ہے نعمتیں بسیار ہیں کھا اور ٹل
کم سے کم کر گفتگو اے شیرِ میدانِ عمل
عید مل آگے نکل ، کچھ در دہن ، کچھ در بغل
جانے کس کس کے ابھی زنجیرِ در کھڑکانا ہے
یومِ عید الفطر یارو یومِ آب و دانہ ہے

ویرانی نہیں جاتی

نظر کی عیب جوئی دل کی ویرانی نہیں جاتی
یہ دو صدیوں کی عادت ہے بہ آسانی نہیں جاتی
مسلمانوں کے سر پر خواہ ٹوپی ہو نہ ہو لیکن
مسلمانوں کے سر سے بوئے سلطانی نہیں جاتی
خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں!
کہ پیدا ہو گئے ہیں اور حیرانی نہیں جاتی
جہاں تک کثرتِ اولاد نے پہنچا دیا اس کو
وہاں تک بندہ پرور نسلِ انسانی نہیں جاتی
یہ اچھی فقر و استغنا کی صورت ہے معاذاللہ
کہ پوری قوم کی صورت ہی پہچانی نہیں جاتی
مجرّد آرٹ کی ملبوتری عورت عجب شے ہے
جو اس کو دیکھ لو پھر وں پشیمانی نہیں جاتی

صاحبِ اولاد سڑکیں

زمیں پر آدمی کی اوّلیں ایجاد یہ سڑکیں
پرانے وقت کے بغداد کی اولاد یہ سڑکیں
مرمّت کی حدوں سے زائد المیعاد یہ سڑکیں
ہمارے شہر کی مادر پدر آزاد یہ سڑکیں
بظاہر صید لیکن اصل میں صیّاد یہ سڑکیں

کمیٹی گھر میں ہے جو پاشکستہ، سرو جاں انجن
بظاہر دیکھنے میں اپنا 'گونگا پہلواں انجن'
گراں پھر اس پہ زنگ آلودگی سے سرگراں انجن
کسی انگریز صدرِ بلدیہ کا راز داں انجن

اسی مرحوم کی مغموم سی اولاد یہ سڑکیں

دمِ بارانِ رحمت گرد کا گرداب ہو جانا
گڑھوں کا پھیل کر تالاب در تالاب ہو جانا
بپھر کر نالیوں کا رستم و سہراب ہو جانا
محلّے کے گلی کوچوں کا زہرہ آب ہو جانا
مہینوں تک برنگِ ہر چہ بادا باد یہ سڑکیں

دکانوں سے کھسک کر آ گئے بازار سڑکوں پر
کھڑے ہیں مدّتوں کے پالتو انبار سڑکوں پر
کبڈّی کھیلتے ہیں ارشد و ابرار سڑکوں پر
میاں رمضان گھر میں ان کے برخوردار سڑکوں پر
سوارو دیکھنا! ہیں صاحبِ اولاد یہ سڑکیں

بہر گامے سڑک کھا جانے والی کھائیاں دیکھو
چٹخنے راستوں کی ٹوٹتی انگڑائیاں دیکھو
کھڑی اونچائیوں کے پیٹ میں گہرائیاں دیکھو
گڑھوں کی جا بجا بہزادیاں، چغتائیاں دیکھو
نقوشِ مانی و چغتائی و بہزاد یہ سڑکیں

ہم اِن سے حلم و صبر و شکر کا پیغام لیتے ہیں
کہ جب چلتے ہیں کم از کم خدا کا نام لیتے ہیں
یہ کام آئیں نہ آئیں ہم انھی سے کام لیتے ہیں
"گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں"

ہم اِن سے مطمئن ہیں اور ہم سے شاد یہ سڑکیں

راولپنڈی ——————— ۱۹۴۹ء

کھڑا ڈِنر

بُفے دعوت' پہ بُلوایا گیا ہوں
پلیٹیں دے کے بہلایا گیا ہوں

کبھی باتوں میں اُلجھایا گیا ہوں
کہیں کرسی سے ٹکرایا گیا ہوں

نہ آئی پر نہ آئی میری باری
پلاؤ تک بہت آیا گیا ہوں

کبابوں کی رکابی ڈھونڈنے کو
کئی میلوں سے دوڑایا گیا ہوں

برائے قتلِ قتلہ ہائے ماہی
چھری کانٹے سے لڑوایا گیا ہوں

مٹر کے واسطے جب کی مٹر گشت
تو "آلو گوشت" میں پایا گیا ہوں

ضیافت کے بہانے درحقیقت
مشقّت کے لیے لایا گیا ہوں

اسلام کا نام تو عام لیا

(ایک ماڈرن قوّالی)

جلسوں میں بہر تقریر لیا، نعروں میں بہر ہنگام لیا
خبروں میں بہر عنوان لیا، پرچوں میں بہر پیغام لیا
جلوت میں بہ کوئے عام لیا، خلوت میں بروئے جام لیا
'نوٹوں' پہ خدا کو بھول گئے، 'ووٹوں' پہ خدا کا نام لیا
اسلام کا نام تو عام لیا، اس نام سے کتنا کام لیا

یَں ایم اے تھا وہ کچھ بھی نہ تھا یَں کچھ بھی نہیں وہ افسر ہے
میں نیچے ہوں وہ اوپر ہے، میں باہر ہوں وہ اندر ہے
میں گردِ ردّیِ دفتر ہوں، وہ میرِ گدّیِ دفتر ہے
اور کیوں نہ ہو اس کا ایک چچا، جو سَر تھا کبھی اب سر پر ہے
میری ڈگری دَم توڑ گئی جب اُس نے چچا کا نام لیا

دامانِ چمن میں پھول بھی تھے، ہم ہی دل کو بہلا نہ سکے
دامن بھرتا تو کیوں بھرتا، ہم دامن ہی پھیلا نہ سکے
تشریحِ تمنّا ہو نہ سکی، توہینِ خودی فرما نہ سکے
گُل ہم تک اُڑ کر آ نہ سکے، ہم اُن تک چل کر جا نہ سکے
ہم رونے والوں میں کھل کر پھولوں نے عبث الزام لیا

...گھی کے ساتھ

گو زندگی کے ساتھ ہیں شرمندگی کے ساتھ
کوٹھی ہے ساتھ کار کے، روٹی ہے گھی کے ساتھ

یہ حادثہ عجیب ہوا آدمی کے ساتھ
تاریک ہو گئی ہے نظر روشنی کے ساتھ

دونوں کو ان کے ظرفِ مروّت کی داد دو
راشدؔ[1] کے گھر میں شامِ غزل جعفری کے ساتھ

ہم مے بھی چھوڑ دیں گے مگر آپ شیخ جی!
کچھ روز جا کے رہیے کسی آدمی کے ساتھ

حافظؔ کی لے میں شعر تو ممکن نہیں ضمیرؔ
طبلہ بجا رہے ہیں ذرا فارسی کے ساتھ

تھا فیصلہ غلط کہ نہایت غلط، مگر
بندے علی نے ووٹ دیا پارٹی کے ساتھ

---

[1] مجتبیٰ ن۔م۔راشد

مرغی خانہ

(ایک استعارہ)

چند مرغے مرغیوں نے کر کے باہم سازباز
ایک دڑبے میں بنالی "مجلسِ بیضا گداز"
مدّعا یہ تھا کوئی تنظیم کا پیمانہ ہو
یعنی مُرغی خانہ ہر پہلو سے مرغی خانہ ہو
اِن میں کچھ بے آشیانے بے ٹھکانے مرغ تھے
اور کچھ جیّد گھرانوں کے پرانے مرغ تھے
کچھ نجیب الاصل، تیز و تند، جنگی مرغ تھے
کچھ فرنگن مرغیاں تھیں کچھ فرنگی مرغ تھے

نازِ محبوبی سے پر پھیلانے والی مرغیاں
ملّتِ بیضا کا دل گرمانے والی مرغیاں
سبز بھی تھے ، زرد بھی تھے، کاسنی بھی ،لال بھی
نرم رُو اطفال بھی ، پختہ گر وگھنٹال بھی
اک سیانے مرغ نے دی بانگ از راہِ کلام
السّلام ! اے نازشِ مُرغانِ عالَم السّلام!
اے عزیزو یاد فرماؤ اگر کچھ یاد ہو
کن گراں مایہ شُتر مرغوں کی تم اولاد ہو؟
وہ صبا رفتار ، خوش گفتار ،خوش کردار مرغ
وہ جواں پرواز ، موسیقار ،شب بیدار مرغ
زندگی کے جادۂ دشوار و ناہموار پر
ہم چلیں گے اُن کے نقشِ پنجۂ منقار پر
تھی ابھی لرزاں فضاؤں ہی میں بانگِ اتّحاد
ہوگیا مرغوں میں برپا ایک انڈے پر فساد

یہ بڑے صاحبوں کا ہوٹل ہے
اس میں "آلِ سمور" رہتے ہیں

آج کل منبرِ رسولؐ پہ بھی
لوگ "بَین السّطُور" رہتے ہیں

یہ گرانی بھی مہربانی ہے
ہم برائی سے دور رہتے ہیں

دو بہرے شناساؤں سے ملاقات

اُس نے کہا، آداب کرتا ہوں، کہو کیا حال ہے

اِس نے کہا، تھیلے میں دو رومال ہیں، اِک تھال ہے

اُس نے کہا، انساں میں اب کچھ ذوقِ ہمدردی بھی ہے!

اِس نے کہا ہم کیا کریں، کھانسی بھی ہے، سردی بھی ہے

اُس نے کہا کچھ پیٹ بڑھ آیا ہے پچھلے سال میں

اِس نے کہا بریگیڈیر گلزار ہیں چکوال میں

اُس نے کہا، اِس وقت شاید قصد ہے بازار کا

اِس نے کہا، بارہ بجے، دن ہو مگر اتوار کا

اُس نے کہا منجھلے چچا کیا اب بھی ہیں ملتان میں؟

اِس نے کہا کچھ درد سا رہتا ہے بائیں کان میں

اُس نے کہا، بیمار ہے بیگم گزشتہ رات سے

اِس نے کہا اچھی کہی، دِل خوش ہوا اِس بات سے

اُس نے کہا، انگلینڈ سے افسر کا تار آیا نہیں

اِس نے کہا، پھر تو کہیں، اُن کو بخار آیا نہیں

اُس نے کہا، اِمشب رسیلا رقص جمخانے میں ہے

اِس نے کہا، طفلِ جواں، گھر میں ہے یا تھانے میں ہے

اُس نے کہا، کیا آپ کو اپنی جوانی یاد ہے؟

اِس نے کہا، ہاں یاد ہے اور منہ زبانی یاد ہے

ترے حلقۂ سخن میں

(ایک ژولیدہ گفتار بزرگ کے دھندلے دھندلے ملفوظات کا خلاصہ)

استاد بولا۔ نیستی، ہستی کی موجودات ہے
شبنم کے باہر آنکھ ہے، پتّھر کے اندر رات ہے
چڑیوں کی چونچیں سُرخ ہیں، بازوں کی بازی مات ہے
یہ ڈال ہے، وہ پات ہے، یہ عکس ہے، وہ ذات ہے
شاگرد بولا۔ واہ وا کیا بات ہے، کیا بات ہے

استاد بولا۔ غنچۂ امید جب تک راس ہو
دشتِ سوا و ماسوا زنجیرِ در کے پاس ہو
ذوقِ نظر گلبرگ ہو، کشتِ ہنر میں گھاس ہو
سیّارگانِ شوق پر کچھ دھوپ، کچھ برسات ہے
شاگرد بولا۔ واہ وا کیا بات ہے، کیا بات ہے

اُستاد بولا۔ ضم نہ ہو گردابِ استحصال میں
گوبھی اُگاتے جائیے اس سال پورے سال میں
بازیچۂ اطفال میں، با غیچۂ اقبال میں
معمورۂ جذبات ہے، مغفورۂ نغمات ہے
شاگرد بولا۔ واہ وا کیا بات ہے، کیا بات ہے

استاد بولا۔ کاہ پر کوہِ گراں ہے زندگی
ماضی کی منکوحات سے فردا کی ماں ہے زندگی
کُن سے کُناں، چُن سے چُناں، پُن سے پُناں ہے زندگی
ہر صبح مُدِّ ظِلّہٗ، پردہ بہ پردہ رات ہے
شاگرد بولا۔ واہ وا، کیا بات ہے، کیا بات ہے

استاد بولا۔ حرف وصوت ورنگ بے بنیاد ہیں
کچھ ہوش کے خرگوش ہیں، کچھ جوش کی اولاد ہیں
سب نقش وہم ایجاد ہیں، سب عکس مادر زاد ہیں
اک نیم بسمل فاختہ صورت گرِ حالات ہے
شاگرد بولا۔ واہ وا، کیا بات ہے، کیا بات ہے

استاد بولا— عشق برگِ زردِ نخلِ آرزو
ہر داغ "پی پی در بغل" ہر شاخ "کوکو در گلو"
اک نغمہ نغمہ خامشی، اک لقمہ لقمہ گفتگو
جو شکل میں دو چار ہے، وہ عقل میں چھ سات ہے
شاگرد بولا— واہ وا، کیا بات ہے، کیا بات ہے

استاد بولا— عُرفی و حافظ چمن بردوش تھے
اور میرزا غالبؔ، خدا بخشے خمستاں نوش تھے
کچھ آپ بھی مدہوش تھے، کچھ باپ سے روپوش تھے
لطفِ زباں میں شہد ہے، زورِ بیاں میں دھات ہے
شاگرد بولا— واہ وا، کیا بات ہے، کیا بات ہے

استاد بولا— اب حدیثِ لامکانی کیا کہیں
کس رُخ اڑے پھُر کر کے مرغِ آسمانی کیا کہیں
بیتے ہوئے ایّام کی 'طوطا کہانی' کیا کہیں
اسلامیوں کی ہسٹری کچھ فارغ الاوقات ہے
شاگرد بولا— واہ وا، کیا بات ہے، کیا بات ہے

یہی شوق نزاکت ہے اگر اپنے جوانوں میں
تو دیکھو گے بہن کی بالیاں۔ بھائی کے کانوں میں

اُتارو طاق سے، ان میں بھی جھانکو، ان میں بھی دیکھو
مبادا شہد بیٹھا ہو پُرانے مرتبانوں میں

ضمیر اپنی طبیعت پر مجھے خود بھی تعجب ہے
ادیبوں میں ادیب اور پہلواں ہوں پہلوانوں میں

میری نشتر زنی احساس کا اک فرض ہے، ورنہ
میری اوقات کیا ہے، میں نہ پیسوں میں نہ آنوں میں

پیدا کرو

شوق سے لختِ جگر، نورِ نظر پیدا کرو
ظالمو! تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو

ارتقا تہذیب کا یہ ہے کہ پھولوں کی بجائے
توپ کے دھڑ، بم کے سر، راکٹ کے پر پیدا کرو

شیخ، ناصح، محتسب، ملا، کہو! کس کی سنیں؟
یارو کوئی ایک مردِ معتبر پیدا کرو

میری دشواری کا کوئی حل مرے چارہ گرو!
جلد تر، آسان تر اور مختصر پیدا کرو

میں بتاتا ہوں زوالِ اہلِ یورپ کا پلان
اہلِ یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

تیرے شعرِ تَر کو یہ اولادِ آدم کیا کرے
نَے نوازی ہو چکی اب نیشکر پیدا کرو

کیا چھچھوندر سے نکالے ہیں یہ بچّے شیخ جی
قبلۂ عالَم! انھیں بارِ دگر پیدا کرو

میری درویشی کے جشنِ تاج پوشی کے لیے
ایک ٹوپی اور کچھ مرغی کے پَر پیدا کرو

حضرتِ اقبالؔ کا شاہیں تو ہم سے اُڑ چکا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

طعن ہو، بہتان ہو، الزام ہو، دُشنام ہو
کوئی صورت ہو، مگر مشہور ہونا چاہیے
دوستی کچھ اِس ہنر مندی سے کی جائے کہ دوست
ہاتھ کے نزدیک، دل سے دور ہونا چاہیے

میاں رمضان گردن تک تو کچھ کچھ ٹھیک آتے ہیں
مگر پھر بعد کی گڑبڑ میں سر پیدا نہیں ہوتا
ہمارا ابھی یہی ایمان ہے اے حضرتِ واعظ
کہ دنیا میں بشر بارِ دگر پیدا نہیں ہوتا

بندر روڈ

اِک سے اِک تاجر بڑا دھنوان بندر روڈ پر
اک سے اِک شاعر "عظیم الشّان" بندر روڈ پر[1]
ہلکی ہلکی ساریاں اور بھاری بھاری ڈاڑھیاں
کُفر بندر روڈ پر، ایمان بندر روڈ پر
صدر بھی جَولاں گاہِ عشق و مستی ہے، مگر
عشق و مستی کا بڑا گھمسان بندر روڈ پر
خود اُلٹ دیتے ہیں اپنے دستِ نازک سے نقاب
چاند سے چہرے، سرِ میدان، بندر روڈ پر

---

[1] ڈان کے عظیم الشان مشاعروں کی طرف اشارہ

واقعہ اک اک جلیل القدر بندر روڈ کا

حادثہ اک اک عظیم الشّان، بندر روڈ پر

زلفِ بنگال و رُخِ پنجاب و رِیشِ مردِ حُر
مختلف عنوان ہیں یک جان، بندر روڈ پر

اُجلے ایوانوں میں کالی ڈسنے والی منڈیاں
کھا گیا انسان کو انسان بندر روڈ پر

زندگی اک دوڑ، سرپٹ دوڑ مرنے کی طرف
آدمی حیران و سرگردان، بندر روڈ پر

سیٹھ جی ! اپنے جھروکے سے کبھی تو جھانکیے
سیٹھ جی وہ دیکھیے انسان، بندر روڈ پر

چھوڑ کر لاہور کی گلیوں کو آخر آ بسے
سالک[1] و حسرت[2] سے نکتہ دان بندر روڈ پر

---

[1] مولانا عبدالمجید سالک مرحوم [2] مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم

شربتِ دیدار دیتے ہیں

وہ سب کو تھوڑا تھوڑا شربتِ دیدار دیتے ہیں
مگر مصروف ہیں ، اتوار کے اتوار دیتے ہیں

محبّت میں یہی اِک مشورہ سب یار دیتے ہیں
سرِ تسلیم خم کر ہم اُنھیں تلوار دیتے ہیں

ابھی وہ ساتویں درجے میں پہنچے ہیں بہ صد منّت
گزشتہ دس برس سے فیس برخوردار دیتے ہیں

وہ کہتے ہیں کہ دُنیا اَمن و آسایش کی جنّت ہے
چلو ہم آج اُن کو آج کا اخبار دیتے ہیں

شرافت کی سند پیغامبر لایا تو کیا لایا
جو اچھّے لوگ ہیں بیٹی کو موٹر کار دیتے ہیں

ترے کوچے میں دیوانوں کا یہ جمگھٹ؟ تعجّب ہے
کہ دیوانے تو دیوانوں کو اکثر مار دیتے ہیں

ہماری سادہ لوحی کو وہ نسبت ہے خسارے سے
کہ مُرغے جیت بھی جائیں تو شاہیں ہار دیتے ہیں

ہوئی ہے تار گھر میں جب سے اردو کی پذیرائی
اُنھیں عُشّاق اب دو دو غزل کے تار دیتے ہیں

صدا بصحرا

[شہر میں ٹیلی فون کا نیا کال سسٹم جاری ہوا تو سابقہ نمبر بھی سب کے سب تبدیل کرنے پڑے۔ اس سبب سے چند روز خاصے لطائف سرزد ہوتے رہے۔]

میں نے گھر کو جو گھمایا کوئی دفتر بولا
پھر گھمایا تو وہی 'قندِ مکرّر' بولا
خاص نمبر سے کوئی عام سخن ور بولا
اپنی 'سلمیٰ' کو بلایا تھا، 'سکندر' بولا
یوں خواتین کا مردانِ خدا ہو جانا
"باور آیا ہمیں پانی کا ہَوا ہو جانا"

یار ماشؤ سے جو کی بات کہ او میرے رقیب!
خوب بگڑے گئے کل شام فلاں بُت کے قریب
اپنی صورت تو ذرا دیکھ شُتر مرغِ عجیب
وہ یہ بولا کہ ہے بندہ صفِ اوّل کا طبیب

میں یہ بولا کہ ندامت بہ سخن ہے مجھ کو
شکوہ کس شخص سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

کوئی بولا۔ اِسی اتوار کو ہم آئیں گے
امتنان اور سلیمان کو بھی لائیں گے
ناشتہ گول سہی، 'لنچ' مگر کھائیں گے
تاش چھوڑیں گے تو شطرنج سے گُتھ جائیں گے

میں یہ بولا کہ 'ڈبل تین ڈبل چار' ہوں میں
وہ یہ بولا کہ ارے کتنا غلط کار ہوں میں

ایک شاعر کو پکارا کہ ملاقات کریں
کچھ مداوائے غمِ صورتِ حالات کریں
شام کو حلقۂ رِنداں میں خوش اوقات کریں
رات کو، روشنیِ جام سے بارات کریں

وہ یہ بولا کہ "میاں گھی کا کنستر بھیجوں؟
مال باہر سے جو آیا ہے وہ اندر بھیجوں؟"

میں جسے شاد سمجھتا تھا پریشاں نکلا
سخت کافر تھا، یہاں مردِ مسلماں نکلا
ایک عطّار کو سونگھا تو غزلخواں نکلا
"قیسؔ تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا"

اتّفاقاً کسی لُبّتیؔ کی کہانی سن لی
اور وہ بھی اسی کافر کی زبانی سن لی

جواں معلوم ہوتی ہے

جنابِ شیخ کی آفت میں جاں معلوم ہوتی ہے
بڑھاپے میں طبیعت نوجواں معلوم ہوتی ہے

بہ فیضِ کثرتِ اولاد وہ نوبت بھی آ پہنچی
کہ اب مُنّے کی ماں، شوہر کی ماں، معلوم ہوتی ہے

دہن تو خیر بیش از غنچہ کُھلتا ہی نہیں اُن کا
کمر ہے بھی تو وہ خُلد آشیاں، معلوم ہوتی ہے

طبیعت کی نہ پوچھو، ہاں مگر رخسار و گیسو تک
وہ ظالم کس قدر آرامِ جاں معلوم ہوتی ہے

ہماری زندگی میں بھی ذرا سی روشنی کر دے
تری آنکھوں میں بجلی کی دکاں معلوم ہوتی ہے

سیاست میں وفاداری مرے اللہ کیا شے ہے
یہاں محسوس ہوتی ہے، وہاں معلوم ہوتی ہے

ضمیر اُس شہر میں بھی مدّتوں رہنا پڑا ہم کو
جہاں خانم بھی اک گُلشیر خاں معلوم ہوتی ہے

کام آتا نہیں

نام اگر دیکھو تو کس شجرے میں نام آتا نہیں
کام اگر پوچھو تو کوئی خاص کام آتا نہیں

فون پر باتیں، ملاقاتوں میں حائل ہو گئیں
السّلام آتا ہے وہ ماہِ تمام آتا نہیں

پڑھ رہا ہوں علم جس میں وہ زباں میری نہیں
کر رہا ہوں عشق جس سے اس کا نام آتا نہیں

اپنی روٹی خود پکا مسٹر کہ اب بیوی کے ساتھ
حُسن آجاتا ہے، حُسنِ انتظام آتا نہیں

بحث ہم دونوں میں جب ہو گی تو جھگڑا کیوں نہ ہو
مجھ کو علمِ علم اور آپ کو علمِ کلام آتا نہیں

حُسن جب یکسر نمایش ہو تو اُس کو دیکھ کر
جتنا پیار آتا ہے اتنا احترام آتا نہیں

کچھ ہنر کچھ جستجو، کچھ سعی اے نورِ نظر!
صرف اک پتلون کس لینے سے کام آتا نہیں

بھائی مولا بخش کس کس فلسفے کو ووٹ دے
بھائی مولا بخش کو اپنا بھی نام آتا نہیں

میکدے سے بس اب اتنا ہی تعلّق ہے ضمیرؔ
مے کی خوشبو مجھ تک آ جاتی ہے جام آتا نہیں

یہ کوہاٹ ہے

بے تکلّف لوگ، ہنس مکھ کوچہ و بازار دیکھ
زندگی آزاد و خوش آمیز و کم رفتار دیکھ
وضع میں اک بے نیازی کی ادا بیدار دیکھ
زلفِ آوارہ کے نیچے نوگزی شلوار دیکھ
ہر پرانی ڈیوڑھی پر اک پرانا ٹاٹ ہے
دوست یہ کوہاٹ ہے

نوجوان و پیر کیا پھرتے ہیں اِترائے ہوئے
سُرمئی لُنگی کے 'لڑ' ماتھوں پہ اکڑائے ہوئے
کارتُوسوں کے پٹے سینے سے لٹکائے ہوئے
اپنی توڑے دار بندوقوں کو چمکائے ہوئے
'شاٹ' ایسا شاٹ ہے گویا بڑی تھری ناٹ ہے[1]
دوست یہ کوہاٹ ہے

چیز جو بھی ہے جسامت کا نہیں حدّ و حساب
ہاتھ بھر کا نان دو دو ہاتھ کے 'چپل کباب'
قُطر میں رَسّی سے کچھ موٹا ہے فالودہ جناب
ایک ہی گُھٹّے سے ہر معدے کا خانہ ہو خراب
اک فقط لوکاٹ "براندازۂ لوکاٹ" ہے
دوست یہ کوہاٹ ہے

قہوہ خانے دیکھیے، قہوے کے پیالے دیکھیے
سر کے بل لٹکے ہوئے جالے ہی جالے دیکھیے
کس مزے سے پی رہے ہیں پینے والے دیکھیے
ڈھولکوں کی گت پہ چھم چھم چھم چار تالے دیکھیے

---

[1] تھری ناٹ رفل

ہر قبیلے کا الگ 'شیراں' ہے 'لنڈاٹ' ہے
دوست یہ کوہاٹ ہے

ہر طرف مردانِ کوہستاں کی آبادی ضمیر
خدّ و خال و قدّ و قامت میں صلابت کی نظیر
عورتیں بھی یوں تو کچھ ہوں گی کہ ہے یہ ناگزیر
جانے کن حجروں میں ہے مدفون یہ حُسن اسیر
ریشم و کمخواب اندر ہو گا ، باہر ٹاٹ ہے
الغرض کوہاٹ میں کوہاٹ ہی کوہاٹ ہے

———— ۱۹۵۴ء

ایک غزل سن کر

دریدہ دامنوں، خستہ گریبانوں کی باتیں ہیں
غزل میں جتنی باتیں ہیں، مسلمانوں کی باتیں ہیں

قوافی میں وہی خلد آشیانی حسرتیں اب تک
ردیفوں میں وہی مرحوم ارمانوں کی باتیں ہیں

تصوّر اتنا گاڑھا ہے کہ صورت ہی نہیں بنتی
تصوّف اتنا گہرا ہے کہ نہ خانوں کی باتیں ہیں

جو میخانے میں صدیوں سے کبھی چلنے نہیں پائے
اُن اَڑیل ساغروں، اُن سست پیمانوں کی باتیں ہیں

کہیں اغیار دُور از کار کا مربوط شکوہ ہے
کہیں کچھ 'خاص رشتے دار بیگانوں' کی باتیں ہیں

مصائب سے زیادہ زرد رومانوں کا چہرہ ہے
حقائق سے زیادہ تلخ افسانوں کی باتیں ہیں

الیکشن کا بخار

جس کشادہ ڈیوڑھی کی چق اٹھا کر دیکھیے
باپ ووٹر، ماں رضا کار، پسر امیدوار

گفتنی ہے، کو بہ کو، خدمت گزاری کی حدیث
دیدنی ہے، رُو بہ رُو، امیدواری کا بخار

بکھر رہی ہے تنگ گلیوں میں ہوس کی چاندنی
گر رہے ہیں خشک کوچوں پر طلب کے آبشار

چوک و چوپال و چمن میں سُونگتے پھرتے ہیں ووٹ
کوچہ و برزن کے اندر دوڑتی جاتی ہے کار

اٹھ رہی ہیں اپنے اپنے من کی سندر ممٹیاں
بن رہے ہیں اپنے اپنے خواب کے نقش و نگار

یہ اچانک سی مروّت، دفعتاً سی دوستی
سب ضرورت کے تماشے، سب غرض کے اشتہار

شوہر ہو گیا

نعرہ زندہ باد کا سر ہو گیا
کام اپنا بندہ پرور ہو گیا
جو کمیٹی کا بھی ممبر ہو گیا
وہ بھی تقریباً منسٹر ہو گیا
در کچھ امکانات کے ایسے کھُلے
جو چُغند تھا وہ چقندر ہو گیا
اک ذرا افسر نے مونچھیں چھوڑ دیں
محکمہ سارا مچھندر ہو گیا

اُس کی اردو میں تھی انگریزی بہت
لوگ یہ سمجھے کمشنر ہو گیا

مفلسی میں جس کی ڈاڑھی بڑھ گئی
زینتِ محراب و منبر ہو گیا

میرے شعرِ تر پہ ہنس لینے کے بعد
دیدۂ اہلِ نظر تر ہو گیا

اللہ اللہ یہ مساواتِ کبیر
اب گدھا گھوڑا برابر ہو گیا

آپ کچھ شرما کے لیڈر بن گئے
میں ذرا گھبرا کے نوکر ہو گیا

جانِ محفل تھا خدا بخشے، ضمیرؔ
اب تو اک مدّت سے شوہر ہو گیا

اُن کے پھاٹک میں یوں کھڑے ہیں ہم
جیسے ہاکی کے 'گول کیپر' ہیں

۱۹۳۶ء

پرانی موٹر

(جاوید خٹک کی نذر)

عجب اک بار سا، مردار پہیوں نے اٹھایا ہے
اِسے انساں کی بدبختی نے جانے کب بنایا ہے
نہ ماڈل ہے، نہ باڈی ہے، نہ پایہ ہے، نہ سایہ ہے
پرندہ ہے جسے کوئی شکاری مار لایا ہے
کوئی شے ہے کہ بینِ جسم و جاں معلوم ہوتی ہے
کسی مرحوم موٹر کا دھواں معلوم ہوتی ہے

طبیعت مستقل رہتی ہے ناساز و علیل اِس کی
اٹی رہتی ہے نہر اِس کی، پھٹی رہتی ہے جھیل اس کی
توانائی قلیل اس کی تو بینائی بخیل اِس کی
کہ اِس کو مدّتوں سے کھا چکی عمرِ طویل اس کی

گریباں چاک انجن یوں پڑا ہے اپنے چھپّر میں
کہ جیسے کوئی کالا مرغ ہو گھی کے کنستر میں

ولایت سے کسی 'سر جارج ایلن بی' کے ساتھ آئی
جوانی لُٹ گئی تو سندھ میں یہ خوش صفات آئی
وہاں جب عین اس کے سر پہ تاریخِ وفات آئی
نہ جانے کیسے ہاتھ آئی مگر پھر ان کے ہاتھ آئی

ہمارے ملک میں انگریز کے اقبال کی موٹر
سن اڑتالیس میں پورے اٹھتّر سال کی موٹر

یہ چلتی ہے تو دو طرفہ ندامت، ساتھ چلتی ہے
بھرے بازار کی پوری ملامت، ساتھ چلتی ہے
بہن کی التجا، ماں کی محبّت، ساتھ چلتی ہے
وفائے دوستاں بہرِ مشقت، ساتھ چلتی ہے

بہت کم اس 'خرابے' کو خراب انجن چلاتا ہے
عموماً زورِ دستِ دوستاں ہی کام آتا ہے

کبھی بیلوں کے پیچھے جوت کر چلوائی جاتی ہے
کبھی خالی خدا کے نام پہ کھنچوائی جاتی ہے
پکڑ کے بھیجی جاتی ہے، جکڑ کے لائی جاتی ہے
وہ کہتے ہیں کہ اس میں پھر بھی موٹر پائی جاتی ہے

اذیت کو بھی اک نعمت سمجھ کر شادماں ہونا
تعال اللہ یوں انساں کا مغلوبِ گماں ہونا

اگر انسان اِس میں بیٹھ جائے اور یہ چل جائے
جو سردی ہو تو جم جائے، جو گرمی ہو تو گل جائے
اُچھل جائے تو یہ خطرہ کہ موٹر ہی نکل جائے
دبک جائے تو اندیشہ کسی پُرزے میں ڈھل جائے

گزرگاہوں کے سینے پر رواں ہے فیضِ عام اِس کا
کہ اک دو گام چلتے ہی چھلک اٹھتا ہے جام اِس کا

بہ طرزِ عاشقانہ دوڑ کر، بے ہوش ہو جانا
بہ رنگِ دلبرانہ جھانک کر، رُوپوش ہو جانا

بزرگوں کی طرح کچھ کھانس کر، خاموش ہو جانا
مسلمانوں کی صورت دفعتاً پُرجوش ہو جانا

قدم رکھنے سے پہلے لغزشِ مستانہ رکھتی ہے
کہ ہر فرلانگ پر اپنا مسافر خانہ رکھتی ہے

دمِ رفتار دنیا کا عجب نقشہ دکھائی دے
سڑک بیٹھی ہوئی اور آدمی اُڑتا دکھائی دے
نظامِ زندگی یکسر تہہ و بالا دکھائی دے
یہ عالم ہو تو اِس عالم میں آخر کیا دکھائی دے

روانی اِس کی اک طوفانِ وجد و حال ہے گویا
کہ جو پرزہ ہے اک بپھرا ہوا قوّال ہے گویا

شکستہ ساز میں بھی، محشرِ نغمات رکھتی ہے
توانائی نہیں رکھتی مگر جذبات رکھتی ہے
پرانے ماڈلوں میں کوئی اونچی ذات رکھتی ہے
ابھی پچھلی صدی کے بعض پرزہ جات رکھتی ہے

غمِ دوراں سے اب تو یہ بھی نوبت آ گئی، اکثر
کسی مرغی سے ٹکرائی تو خود چکرا گئی، اکثر

ہزاروں حادثے دیکھے، زمانی بھی، مکانی بھی
بہت سے روگ پالے ہیں ز راہِ قدردانی بھی
خجل اِس سخت جانی پر ہے مرگِ ناگہانی بھی
خداوندا نہ کوئی چیز ہو اتنی پرانی بھی
کبھی وقتِ خرام آیا تو ٹائر کا سلام آیا
"تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا"

۱۹۵۵ء

راجہ اور راؤ

کوئی راجہ نہ کوئی راؤ ہے
اصل شے مرغ کا پلاؤ ہے

دلِ ناداں سے کیوں الجھتے ہو
زندگی چار دن کا چاؤ ہے

تم دوپٹّا ہی کھینچ کر رکھّو
روس اور چین میں کھنچاؤ ہے

کیمبرج کی سند نہیں جس پاس
لاکھ عالم ہو ماؤ ماؤ ہے

ملتفت بھی ہیں وہ گریزاں بھی
کچھ بہانہ ہے کچھ بہاؤ ہے

اپنے گھر پر گماں ہوا اکثر
کسی انگریز کا پڑاؤ ہے

چل رہی ہے مشین مغرب میں
اور مشرق میں چل چلاؤ ہے

آفریں ہے ضمیرؔ صاحب پر
لب بہ نغمہ ہے، دل میں گھاؤ ہے

ضمیر کا گھر

[مجھے کچھ عرصہ ایک خستہ حال سے چوبی مکان (HUT) کے نصف حصّے میں رہنے کا اتفاق ہُوا۔ مالک مکان نے 'ہٹ' کے دو حصّوں کو الگ الگ کرایہ داروں میں کچھ اس طرح تقسیم کیا تھا کہ آدمی خواہ کسی حصّے میں رہے، ضرورت کی اکثر چیزیں دوسرے حصّے میں رہ جاتی تھیں۔ (ض)]

لکڑی کی 'نصف ہٹ' میں بسیرا ہے آج کل
فدوی بشر نہیں ہے 'بٹیرا' ہے آج کل
دو 'کمریاں' کہ عرض ہے جن میں نہ طول ہے
جینا اگر یہی ہے تو مرنا فضول ہے
جو چیز جس جگہ تھی ضروری، وہیں نہیں
چھت بے تکلّفی میں کہیں ہے کہیں نہیں

آواز جو بلند ہوئی پار ہو گئی
اب گھر میں بات چیت بھی دشوار ہو گئی
پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے چھت بھی چلی ہوئی
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی
دیوار اِس طرف ہے تو شہتیر اُس طرف
جلسہ اِدھر ہے نعرۂ تکبیر اُس طرف
اُسٹور' اِس طرف تو 'کچن' دوسری طرف
'بلب' اِس طرف ٹنگے ہیں 'بٹن' دوسری طرف
شاعر اِدھر ہے، مشقِ سخن دوسری طرف
'رن' اِس طرف بپا ہے 'بزن' دوسری طرف
صحنِ چمن کی نہرِ لبن دوسری طرف
نلکے کا دھڑ اِدھر ہے تو 'پھن' دوسری طرف
بیلیں اُگی ہوئی ہیں ترے در کے سامنے
کدو اُچھل رہے ہیں مرے گھر کے سامنے
مرغوں کا شوق ہے جو اُدھر کے مکین کو
اچھی سزا ملی ہے اِدھر کی زمین کو

گھبرا کے پی گئے، کبھی کلغا کے پی گئے
پانی نیاز مند کے گھر آ کے پی گئے
کچھ بے وقوف مرغ جو خود دار ہو گئے
وہ شام ہی سے فتنۂ بیدار ہو گئے
گائے جو پال رکھی ہے اطفال کے لیے
فی الحال کام آتی ہے، بھونچال کے لیے
رُوئے سخن اِدھر تو سخن دوسری طرف
گھنٹی کا تن اِدھر ہے تو ٹن، دوسری طرف
مہمانِ محترم جو کوئی آ کے رہ گیا
کچھ ایسی شرم آئی کہ شرما کے رہ گیا
کھانا جہاں دیا وہیں نہلا دیا گیا
ٹہلا دیا گیا، کبھی لٹکا دیا گیا
ہم اُس سے اور وہ جان سے بیزار ہو گیا
رشتہ تعلقات کا ہموار ہو گیا
بستر ہے رہ گزار میں بستر کے سامنے
دارا پڑا ہوا ہے سکندر کے سامنے

آندھی میں رات کرتے و بنیان تو گیا
"اب خود بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا"

فرزند خیر سے جو یہاں چند ہو گئے
پیدا ہوئے اُدھر کہ اِدھر بند ہو گئے

گھر میں کبھی جو بیٹھ گیا ہوں نماز میں
بچے اُچھل پڑے ہیں جبینِ نیاز میں

کُھلتا ہے اُن کے غُسل کا ' خانہ ' مری طرف
گانا اُدھر ہے وجد میں آنا مری طرف

در اِس طرف تو پردۂ دَر دوسری طرف
ہر چیز الغرض ہے مگر دوسری طرف

"جینے سے یوں نباہ کیے جا رہا ہوں میں
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں"

مسٹر کھلا

پنؔ کھُلی، ٹائی کھلی، بکلس کھلے، کالر کھلا
کھلتے کھلتے ڈیڑھ گھنٹے میں کہیں افسر کھلا

آٹھ دس کی آنکھ پھوٹی، آٹھ دس کا سَر کھلا
لو خطیبِ شہر کی تقریر کا جوہر کھلا

تیرگی آتی ہے قسمت میں تو پھر جاتی نہیں
میرے گھر کے سامنے لو "کوئلہ سنٹر" کھلا

سچ ہے مشرق اور مغرب ایک ہو سکتے نہیں
اُس طرف بیوی کھلی ہے، اس طرف شوہر کھلا

ؔ PIN

اُن کا دروازہ تھا مجھ سے بھی سوا مشتاقِ دید
میں نے باہر کھولنا چاہا تو وہ اندر کھلا

طبعِ شاہانہ ہے میری، وضعِ درویشانہ ہے
آستیں میں بنگلہ پنہاں، ہاتھ میں چھپّر کھُلا

شیخ مولا بخش بھی 'اپوا'[۱] کے حامی ہو گئے
خیر سے اس مسجدِ ویراں میں بھی مندر کھلا

میں نے غالبؔ کے ادب سے اس میں غواصی نہ کی
ورنہ تھا اِس 'بحرِ بے پایاں' میں تو ہیومر کھُلا

---

[۱] انجمن خواتینِ پاکستان

سگرٹ نوش کی فریاد

لذّتِ لب کے جو سگرٹ تھے وہ روپوش ہوئے
ساز خاموش ہوئے، خواب فراموش ہوئے
دودِ کش، کشمکشِ ہجر سے بے ہوش ہوئے
جو بَلانوش تھے وہ اور بَلا نوش ہوئے

شوقِ بسیار نے بیڑی سے شناسائی کی
شعلۂ خس سے منوّر شبِ تنہائی کی

کاہشِ ذوقِ طلب میں سحر و شام پھرے
کار میں آپ، تو بے کار میں خدّام پھرے
دوست احباب پھرے، نامہ و پیغام پھرے
ہر ٹھکانے سے مگر نادم و ناکام پھرے

لے کے بیٹھے کبھی حُقّہ جو قدِ یار کے ساتھ
خود گرفتار ہوئے مرغِ گرفتار کے ساتھ

کوئی سگرٹ کسی ذات کا پایا ہم نے
اُسے چوما، اُسے چاٹا، اُسے کھایا ہم نے
گھاس اور پھوس کو سینے سے لگایا ہم نے
ٹھُونس اور ٹھانس کو آنکھوں پہ بٹھایا ہم نے
"جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے"
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

ایک دو کش میں کہاں گرمیِ گفتار ملے
ہم چمکتے ہیں اگر بزم دھواں دھار ملے
ہائے یہ دن کہ نہ اک مشعلِ گلنار ملے
یار سے یار ملے بھی تو وہ بیزار ملے
خندۂ خوش، دلِ مائل، سخنِ خوب نہ مانگ
"مجھ سے پہلی سی محبّت مرے محبوب نہ مانگ"

عورتوں کی اسمبلی

(چھیڑ خوباں سے چلی جائے)

یہ نرگس، وہ نسریں، یہ سُنبل و لالہ
گلابی سی گل رُخ، غزل سی غزالہ
نظر میں ستارے، جبیں پر اُجالا
جو دیکھے، پکارے، ارے مار ڈالا

نہ کیوں دل نشیں ہو یہ تقریر سادہ
کہ الفاظ کم ہیں، تبسّم زیادہ

وہ شانوں پہ زرکار آنچل اُچھالے
اِدھر سے اُدھر مست زلفوں کو ڈالے
میاں اور بچّے خدا کے حوالے
حسیں ہاتھ میں نرم فائل سنبھالے

کس انداز سے ناز فرما رہی ہے
کہ جیسے چمن میں بہار آ رہی ہے

مسائل میں جو دُور ہیں ہوگئی ہے
وہ 'ہاں' سے زیادہ 'نہیں' ہوگئی ہے
بھڑک کر اگر خشم گیں ہوگئی ہے
تو پہلے سے بڑھ کر حسیں ہوگئی ہے

غزال اپنا رَم آپ کم دیکھتے ہیں
جو ہم دیکھتے ہیں وہ ہم دیکھتے ہیں

دساور سے ہیروں کے ہار آ رہے ہیں
بھڑک دار ریشم کے تار آ رہے ہیں
نگاروں کے نقش و نگار آ رہے ہیں
سنگھار آ رہے ہیں، اُدھار آ رہے ہیں

یہ مانا کہ گھر میں خرابی رہے گی
مگر اوڑھنی تو گلابی رہے گی

مباحث میں یوں گرمِ گفتار ہیں سب
کہ بس لڑنے مرنے کو تیّار ہیں سب

فسوں کار ہیں سب، طرحدار ہیں سب
برابر برابر کی سرکار ہیں سب

اِدھر اصغری بھڑ گئی اکبری سے
اُدھر طِفل رونے لگے گیلری سے

'سپیچوں' میں گوٹے کناری کی باتیں
بہُو کی کفایت شعاری کی باتیں
پڑوسن کی پرہیزگاری کی باتیں
غرض ہر بیاہی، کنواری کی باتیں

شہادت کی انگشت اقبال پر ہے
کبھی ناک پر ہے، کبھی گال پر ہے

رواں ہیں ہجومِ تجلّی کے دھارے
یہ آنچل سمیٹے، وہ گیسو سنوارے

دمِ گفتگو کوئی جیتے نہ ہارے
ستاروں سے ٹکرا رہے ہیں ستارے
بُوا کو تو دیکھو نہ گہنا نہ پاتا
بجٹ ہاتھ میں جیسے دھوبن کا کھاتا

وہ لابی کے جھرمٹ گلابی گلابی
وہ عارض شہابی، وہ لب لعل نابی
دوپٹے حسابی، قمیصیں کتابی
وہ آپس کی باتیں شتابی شتابی

نہ یہ سن رہی ہے، نہ وہ سن رہی ہے
یہ دل بُن رہی ہے، وہ جاں بُن رہی ہے

بہ اندازِ غیظ و غضب بولتی ہیں
بہ آوازِ شور و شغب بولتی ہیں
نہیں بولتی ہیں تو کب بولتی ہیں؟
پہ جب بولتی ہیں تو سب بولتی ہیں

معاً اپنے خوابوں میں گم ہو گئی ہیں
ابھی جاگتی تھیں ابھی سو گئی ہیں

کوئی گھر میں طرزِ بیاں چھوڑ آئی
کوئی کار میں چابیاں چھوڑ آئی
یہ ہر بحث کو درمیاں چھوڑ آئی
وہ سب 'فائلیں' نیم جاں چھوڑ آئی

حقائق کی سنگینوں نے صدا دی
تو یہ فاتحِ زندگی مسکرا دی

جو اوڑھے ہوئے شال ہے چار خانی
زمیں پر کوئی شعلۂ آسمانی
ہمہ بے یقینی، ہمہ بدگمانی
ذرا دیکھنا اِس کی آتش بیانی

وزارت کو مارے ہے یوں گفتگو سے
کوئی ساس لڑتی ہو جیسے بہو سے

بے ساختہ پن چاہیے

میں نے پوچھا سیٹھ دھن پرشاد سے من چاہیے؟
سیٹھ جی بولے کہ سستا ہو تو سو ٹن چاہیے

دلِ فراقِ یار میں ہر آن شعلہ در بغل
چشمِ نم کو روز اک پانی کا گیلن چاہیے

اور کچھ طے ہو نہ ہو اک چیز یہ طے ہو گئی
باپ کالا ہو مگر بیٹا 'نکلسن' چاہیے

چُست جاموں، کُشت پتلونوں سے یہ ثابت ہوا
آدمی کو کس قدر بے ساختہ پن چاہیے

ہم بھی کس تہذیب کے سنگم میں آ پیدا ہوئے
ظرف رومی چاہتے ہیں، حرف رومن چاہیے

کچھ سفیدی، کچھ لچک، کچھ کھردرا پن، کچھ مٹھاس
اپنے کلچر میں بھی سرگودھے کا مکھن چاہیے

جا پڑا اب خوشہ ہائے انجم و پرویں پہ ہاتھ
اب ستارے ٹوٹنے والے ہیں دامن چاہیے

آرزوؤں کا یہ محشر ہے تو اے میرے خدا
ظرفِ ہستی سے بڑا اِک اور برتن چاہیے

کب تک آخر چوٹیوں کے ارد گرد اُڑتے پھریں
اِس زمانے کے عقابوں کو نشیمن چاہیے

دیکھیے مغرب کی اس الجھن کو سلجھاتا ہے کون
جان روشن چاہیے یا کان روشن چاہیے

ہائے کس کمسن پہ کس موسم میں دل آیا ضمیرؔ
اُس کو فیشن چاہیے، فدوی کو پنشن چاہیے

دل عبث بدنام ہے، ناصح عبث بدنام ہے
دل کا اپنا کام ہے، گردے کا اپنا کام ہے

فکرِ صبح و شام نے پروائے ننگ و نام ہے
عشق اگر یہ ہے تو یہ سب سے بڑا آرام ہے

اُس سے زعمِ دوستی ہے جس نے میرے نام پر
یہ کہا — "ہاں ہاں کوئی جغرافیے کا نام ہے"

شہر کا بڑا بازار

دفعتاً اک شور زندہ باد، مردہ باد کا
ایک سیلِ خشمگیں انبوہِ آدم زاد کا
پرچمِ خسرو پہ نقشہ تیشۂ فرہاد کا
یہ الیکشن ہو رہا ہے شہر کے اجداد کا

آگے آگے کار پیچھے پیچھے ہاہا کار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

شیخ دوراں اِس طرف، حضرت کی دستار اُس طرف
خانصاحب خود اِدھر پھرتے ہیں شلوار اُس طرف
نصف گاہک اِس طرف، آدھے خریدار اُس طرف
خوب کاروبار ہے، کار اِس طرف بار اُس طرف

خود سڑک کے بیچ ٹھیلا آر، سودا پار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

کافر و دیندار گڈمڈ ماہ رخساروں کے بیچ
کار، بیکاروں کے پیچھے، پیدل، اسواروں کے بیچ
پھول اور کانٹے بہم، زردار ناداروں کے بیچ
جیسے گتھ جائیں کئی عنوان اخباروں کے بیچ

اُونٹ سرکش، اسپ خودرو، گائے خود مختار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

ہست خاں ہستی کا ہر جنجال پھیلائے ہوئے
مست خاں مستی میں سر کے بال پھیلائے ہوئے
عورتیں، آنکھوں میں تینی تال پھیلائے ہوئے
مرد، ہونٹوں پر زبانِ حال پھیلائے ہوئے

ہاتھ میں گو بھی، بغل میں طفل، دل میں پیار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

وجد فرماتے ہیں، لہراتے ہیں، ٹکراتے ہیں لوگ
وہ اخوّت ہے کہ لوگوں پر چڑھے جاتے ہیں لوگ
یوں بھی ناکردہ خطاؤں کی سزا پاتے ہیں لوگ
اپنی اپنی بکریاں بھی ساتھ لے آتے ہیں لوگ
جس کو سمجھاؤ وہ لڑنے کے لیے تیّار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

رس ملائی میں رلائی جا رہی ہیں مکھّیاں
تھال میں ربڑی کے خود 'ربڑا' رہی ہیں مکھّیاں
میرا راشن مجھ سے پہلے کھا رہی ہیں مکھّیاں
بوتلوں میں 'غسلِ صحت' پا رہی ہیں مکھّیاں
شربتِ دینار کیا ہے 'شربتِ مکھیار' ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

دل یہ کہتا ہے کہ انگلستان لو، جاپان لو
جیب کہتی ہے گزی گاڑھے کی صدری تان لو

مول کا ہر بول بھائی مان لو پر جان لو
ایک ہی قیمت ہے بیشک پان لو یا نان لو

نان بے مقدار ہے اور پان بدبودار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

ہوٹلوں میں شعر بَر لب شاعرانِ پُر فسوں
گھر میں بیچاروں کا یہ عالم کہ پھرِں ہاں نہ ہوں
شعرِ تَر میں لذّتِ مضمونِ دل بُردن ہے یُوں
"بلبل از گل، گل ز بُو، بُو از گلاب آید بروں"

آگ ہے، نمرود ہے، اَمرود ہے، فنکار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

———— ۱۹۶۰ء

دفتر کے ساتھ ہیں

افسر کے ساتھ لوگ نہ دفتر کے ساتھ ہیں
سب اپنے اپنے نانِ میسّر کے ساتھ ہیں

آغا کی مونچھ دیکھ کے نوکر نے دی خبر
اک شخص ہیں کہ درّۂ خیبر کے ساتھ ہیں

اُن سے تعلقات پر اِترا رہا ہوں میں
جن کے تعلّقات جہاں بھر کے ساتھ ہیں

کھلتا نہیں یہ بھید کہ بزمِ سخن ہیں لوگ
طبلے کے ساتھ ہیں کہ سخن ور کے ساتھ ہیں

بیگم کی چشمِ تر میں وہ سیلاب ہے کہ ہم
سولہ برس سے ایک سمندر کے ساتھ ہیں

منگلا کی سیر کیوں نہ ہو دو چند اے ضمیر
ہم آج اپنے حامد[1] و اختر[2] کے ساتھ ہیں

---

[1] راجہ حامد مختار کیانی [2] کرنل راجہ محمدؐ اختر

سفر ہو رہا ہے

(کراچی شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر معذور ترین بس میں)

گریباں پسینے سے تر ہو رہا ہے
کمر بند گردن کے سر ہو رہا ہے
سفینہ جو زیر و زبر ہو رہا ہے
اِدھر کا مسافر اُدھر ہو رہا ہے
جو دیوار تھی اُس میں در ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

نشستوں پہ جتنے نشستہ ہوئے ہیں
وہیں جستہ جستہ خجستہ ہوئے ہیں
اُٹھے ہیں تو زنجیر بستہ ہوئے ہیں
گرے ہیں تو یکسر شکستہ ہوئے ہیں

نفس ہر نفس تیز تر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

کوئی پہلواں سیٹ میں دھم گیا ہے
بہت بھی گیا تو بہت کم گیا ہے
کوئی ہاتھ پتلون میں جم گیا ہے
کوئی ناک دیوار سے تھم گیا ہے

کوئی سرو قد مختصر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

جواں کچھ سرِ پائیداں اور بھی ہیں
دریچوں میں سروِ رواں اور بھی ہیں
قطاروں میں بیوی میاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ہجوم اور بھی معتبر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

وہ اک پیل تن یوں سمٹ کر کھڑا ہے
کہ پیٹ اُس کا دھڑ سے الگ جا پڑا ہے

کسی کی گھڑی پر کسی کا گھڑا ہے

مقدّر کو دیکھو کہاں جا لڑا ہے

تماشا سرِ رہگزر ہو رہا ہے

کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

جہاں چند شاعر سواری کریں گے

تو لاری میں بھی نغمہ کاری کریں گے

غزل کو ترنّم سے جاری کریں گے

یہی مشغلہ باری باری کریں گے

'فعولن' میں عرضِ ہنر ہو رہا ہے

کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

جو خوش پوش گیسو سنوارے ہوئے تھا

بہت مال چہرے پہ مارے ہوئے تھا

بڑا قیمتی سوٹ دھارے ہوئے تھا

گھڑی بھر میں سب کچھ اتارے ہوئے تھا

بچارے کا حلیہ دِگر ہو رہا ہے

کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

کوئی بے خبر، گلفشاں ہو گئی ہے
تو لاری کی لاری جواں ہو گئی ہے
طبیعت اچانک رواں ہو گئی ہے
ملاقات ان سے کہاں ہو گئی ہے

نظر سے طوافِ نظر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

ڈرائیور اگر مسیح پا ہو گیا ہے
بھری گود لے کر ہوا ہو گیا ہے
سفینہ سپردِ خدا ہو گیا ہے
ہر اک شخص محوِ دعا ہو گیا ہے

سفر ہر قدم پُر خطر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

کبھی بیش سے گھٹ کے بس ہو گئی ہے
کسی تیج میں نیچ کس، ہو گئی ہے
چلی ہے تو بانگِ جرس ہو گئی ہے
رکی ہے تو ٹھس ہو کے بس ہو گئی ہے

نہیں ہو رہا ہے مگر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

جو گردن میں کالر تھا 'کر' رہ گیا ہے
ٹماٹر کے تھیلے میں 'ٹر' رہ گیا ہے
خدا جانے مرغا کدھر رہ گیا ہے
بغل میں تو بس ایک 'پر' رہ گیا ہے
کوئی مفت میں مُفتخر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

وہ لکھتے ہیں، کچھ اپنے حالات لکھیے
گزرتے ہیں کس طور دن رات لکھیے
مشاغل بہ تفصیلِ اوقات لکھیے
جو لکھیے تو اب اور کیا بات لکھیے
کوئی کام ہم سے اگر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

ڈرگ روڈ۔ چھاؤنی ——— ۱۹۶۱ء

شوق کی بلندی

[میرے ایک شاعر دوست نے مکان تعمیر کرایا تو نقشہ بنانے میں کچھ اتنے
مبالغے سے کام لیا کہ تعمیر کا کام ایک مدت تک درمیان ہی میں معلّق رہ گیا۔]

اک بڑا شاعر، بہت چھوٹا سا جو افسر بھی ہے
ماورائے دو جہاں بھی داخلِ دفتر بھی ہے
مُدتوں سے پالتو انداز کا شوہر بھی ہے
خیر سے اولادِ بتدریج کا لشکر بھی ہے
قرض کی پونجی سے تعمیرِ مکاں کرنے لگا
مثلِ اَبنائے جہاں، کارِ جہاں کرنے لگا

جب زمیں ڈھونڈی تو بر رُوئے زمیں ملتی نہ تھی
جانے کن پردوں میں تھی پردہ نشیں ملتی نہ تھی
جیب سے جیب، آستیں سے آستیں ملتی نہ تھی
دل جہاں ملتا تھا، یہ ظالم وہیں ملتی نہ تھی

آخر اک جھلسے ہوئے ٹیلے پہ ڈیرا کر لیا
یعنی اُس شاہیں نے پربت پر بسیرا کر لیا

آرزو نے خواب دکھلایا تھا جس تعمیر کا
اُس میں پتّا آب ہوتا تھا کسی جاگیر کا
جا بجا اپنا الگ کمرہ تھا خورد و پیر کا
خواب کا، احباب کا، تقریر کا، تحریر کا

چوبِ برما کے مصفّا در، شگفتہ بام تھے
پتّھروں کے نقش بھی صورت گرِ ایّام تھے

بستیاں تو بستیاں معقول ویرانوں سے دور
بس کے اڈّوں، ٹم ٹموں کے ٹم ٹمستانوں سے دور
سارے داناؤں سے، کم فکروں سے، نادانوں سے دور
الوؤں، چمگادڑوں کے پاس انسانوں سے دور

گوشت سبزی دال آٹے کی دکاں کوئی نہیں
"اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہیں"

ایک بیٹھک ذوقؔ و غالبؔ کو منانے کے لیے
ایک حجرہ داغؔ کی غزلیں گوانے کے لیے
حرف گاہیں — قافیے دھونے سکھانے کے لیے
چار چھ چولھے فقط آلو پکانے کے لیے

بُرجیوں کا زاویہ دیکھو کہ رُخ شہتیر کا
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تعمیر کا"

سابقہ کوچوں کی کوئی شے اِدھر آتی نہیں
اپنے متروکہ بزرگوں کی خبر آتی نہیں
باس اُن گلیوں کی ٹیلی فون پر آتی نہیں
ریشماں آواز دیتی ہے، مگر آتی نہیں

ساتھ پٹری ریل کی 'مِل' توریئے کے تیل کی
ریڈیو میں شو نکلتی ہے کوک خیبر میل کی

دو کشادہ 'لان' تھے آبِ رواں کے ساتھ ساتھ
سرو چلتے تھے حدودِ گلستاں کے ساتھ ساتھ

ایک اُجلی شہ نشیں ہر آستاں کے ساتھ ساتھ
شیشہ ہائے نزم، سنگِ سخت جاں کے ساتھ ساتھ

حسرتِ دیوار و در بس سر اُٹھا کے رہ گئی
قرض کی توفیق تھوڑی دور جا کے رہ گئی

گول کمرہ اپنی گولائی پہ آ کر رُک گیا
فن کا نخرہ نصف انگڑائی پہ آ کر رُک گیا
جشنِ جلوت، قیدِ تنہائی پہ آ کر رک گیا
یہ تماشا ایک رسوائی پہ آ کر رک گیا

گردشوں میں خم نہیں ہے، دمدموں میں دم نہیں
چھت یہ کہتی ہے کہ مسٹر تم نہیں یا ہم نہیں

گھر کا کُل ساماں اِسی ارماں کے اوپر رکھ دیا
اپنا مفلر رکھ دیا، بیوی کا جھومر رکھ دیا
جانے کس عالم میں پہلے ایک پتھّر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دِل رکھ دیا، سر رکھ دیا'

کتنی چیزیں تھیں جو اس ملبے میں پنہاں ہوگئیں
"سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں"

قرض خواہوں کا سلامِ رونمائی اور آپ
ٹھیکیداروں سے مسلسل آشنائی اور آپ
'آہن وسیمنٹ' سے پیہم لڑائی اور آپ
فاعلاً فعلاً میں مٹّی کی کھدائی اور آپ

بے خودی بُنیاد کا پتّھر لگا کر اُڑ گئی
شاعری دس بیس کاریگر لگا کر اُڑ گئی

فن کے ساتھ

یہ عجب افتاد ہے اربابِ فکر و فن کے ساتھ
سازِ غالبؔ کی طرف ، آوازِ ٹینی سن کے ساتھ

ایک زندہ باد اِک پائندہ باد اور اس کے بعد
ہم لپیٹ کر سو گئے اپنے 'ریزولیوشن' کے ساتھ

اللہ اللہ ایشیا میں تیل کی یہ ریل پیل
اک درم دو نان دس مہمان ہر گیلن کے ساتھ

ہم میں تم میں بس یہی پچھلی صدی کا فرق ہے
تم رہے 'گیمن' کے پیچھے، ہم رہے جُمّن کے ساتھ

اب ہوا معلوم دس بچّوں کی گٹھری سر پہ تھی
ہم یہ سمجھے تھے کہ حضرت ہیں کسی دھوبن کے ساتھ

بزمِ فن میں کس نمی پُرسد کہ بھیّا کون ہو
یوں تو پاجامہ بھی تھا، پگڑی بھی تھی اچکن کے ساتھ

شیخ جی کے حق میں یہ مانگو دعا اے دوستو
ان کو روٹی بھی خدا بخشے دلِ روشن کے ساتھ

زیست کا معیار آخر کار اونچا ہوگیا
آدمی کو موت تو آئی مگر فیشن کے ساتھ

باپ کا حصّہ کوئی قصّہ برائے نام تھا
اک عجب 'ٹیڈی' سا کل دیکھا چچا چھکّن کے ساتھ

دیکھ اے دنیا کہ ہم وہ با مروّت لوگ ہیں
دشمنی انگریز سے تھی لڑ مرے جرمن کے ساتھ

زندگی کی اینٹ پہلے دن ہی کج رکھّی گئی
عشق مِس زیب النّسا سے عقد مِس گلشن کے ساتھ

اک برس میں کیسے کیسے حادثے دیکھے ضمیر
ہم تو سن پینسٹھ کو جا پہنچے ہیں سن پچپن کے ساتھ

کل شب جہاں میں تھا

[ہمارے محکمے کے ایک اعلیٰ افسر کو قوّالی سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ ایک مرتبہ ایسے اناڑی قوّالوں کو پکڑ لائے جو پکّے راگ میں کچّے تان پلٹے لگانے اور الفاظ کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے کے ماہر تھے۔ ماتحت عملے کی چار راتیں اسی شور و غوغا کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ (ض)]

پے بہ پے قوّالیوں کی پالیاں ہونے لگیں
دن نکمّے اور راتیں کالیاں ہونے لگیں
رفتہ رفتہ تالیاں بے تالیاں ہونے لگیں
ہوتے ہوتے مشتعل گھر والیاں ہونے لگیں

اک میاں اُچھلا تو بیوی نے کہا اے جانِ من!
"تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!"

گانے والے راگ میں ٹھمراگ کے استاد تھے
عقل میں 'ہم زلف' تھے اور شکل میں ہمزاد تھے
تال میں بھونچال تھے سُر سُرتیاں ایجاد تھے
یعنی اِس فن میں پرانے 'صاحبِ اولاد' تھے

ابتدا یہ تھی کہ وہ طبلوں کو سمجھاتے رہے
انتہا یہ تھی کہ طبلے آپ ہی گاتے رہے

لفظ کو رگڑیں بہت، معنی کو پھیلائیں بہت
شعر کم گائیں مگر مفہوم سمجھائیں بہت
تھا پ بَل کھائے نہ کھائے آپ بَل کھائیں بہت
در مقفّل ہے مگر زنجیر کھڑکائیں بہت

گردشِ معنی میں اسکندر کہیں، دارا کہیں
شعر کو ٹانکا کہیں، شاعر کو دے مارا کہیں

ساز سے آواز بڑھ جائے تو پسپائی کریں
راگنی بجھنے لگے تو 'روشن آرائی' کریں
نغمہ پیرائی میں جب پروازِ بالائی کریں
حرکتیں ایسی کریں جیسے کہ سودائی کریں

ساز آوارہ ، نوا گر نم ، طبلچی چُور تھا
سر مغنّی گویا پھانسی پر لبِ منصور تھا

تال دے کر جب کلامِ حضرتِ اقبال دیں
شعر کیا ہر لفظ کی چوکھٹ پہ چوکی ڈال دیں
شعر دیں پھر پرچۂ ترکیبِ استعمال دیں
قافیوں کو دور تک کھینچیں ردیفیں ٹال دیں

فلسفہ تھا سر نگوں ، مفہوم خستہ حال تھا
شعر بچ نکلا تو یہ اقبالؔ کا اقبال تھا

ایک وہ ہے کی 'دوئی' سو بار دہرائی گئی
لَے کبھی چھوڑی ، کبھی پکڑی ، کبھی کھائی گئی
فارسی پنجاب کے کھیتوں میں دوڑائی گئی
شیخ سعدیؔ کی غزل دُرگا میں دُرگائی گئی

سوہنی جس موج میں ڈوبی وہ جُوئے شیر تھی
محملِ لیلیٰ کو الٹایا تو اندھیر تھی

آخری گھمسان میں مہمان بھی گانے لگے
سُر سے عاری ، تان سے انجان بھی گانے لگے

لان میں بیٹھے ہوئے دربان بھی گانے لگے
اچھّے اچھّے معتبر انسان بھی گانے لگے

دست و بازو، چشم و ابرو، گوش و سر ہلتے رہے
شام کو ملنے جو بیٹھے رات بھر ہلتے رہے

بیماری کا نام

زندگی ہے مختلف جذبوں کی ہمواری کا نام
آدمی ہے شلجم و گاجر کی ترکاری کا نام

علم الماری کا، مکتب چار دیواری کا نام
ملٹن اک لٹھا ہے، مومن خان پنساری کا نام

صاف کالر کے تلے، معقول اُجلی سی قمیص
ہے بہت ہی مختصر سا میری دشواری کا نام

اُس نے کی پہلے پہل پیمائش صحرائے نجد
قیس ہے دراصل اک مشہور پٹواری کا نام

عشق ہرجائی بھی ہو تو درد کم ہوتا نہیں
اک ذرا تبدیل ہو جاتا ہے بیماری کا نام

کوئی نصب العین، کوئی عشق، کوئی چاندنی
زندگی ہے ورنہ اک مصروف بیکاری کا نام

مدّتوں دُزدیدہ، دُزدیدہ نظر سے دیکھنا
عشق بھی ہے اک طرح کی چور بازاری کا نام

میں نے تو اپنے لیے آوارگی تجویز کی
تم نے کیا رکھا ہے اپنی خود گرفتاری کا نام

بات تو جب ہے بدل جائے سرشت انسان کی
یوں تو لکھ دینے کو لکھ دو اُونٹ پر لاری کا نام

دل ہو یا دلیا ہو، دانائی کہ بالائی ضمیر
زندگی ہے بعض اشیا کی خریداری کا نام

بس دور ہی سے اُن کی ہنسی دیکھتے رہے
یعنی خوشی برائے خوشی دیکھتے رہے

عید کا میلا

لو عید آئی، لو دو ٹیلے میدان میں پھر بازار لگا
ہر چاہت کا سامان ہوا، ہر نعمت کا انبار لگا
سب اجلا شہر امنڈ آیا، شلوار سجا، دستار لگا
اِس بھیڑ کے بپھرے طوفاں میں جو ڈوب گیا، سو پار لگا
ٹولی کے آگے ٹولہ ہے، 'ریلی' کے پیچھے ریلا ہے
یارو یہ عید کا میلا ہے

مرکزِ رنگیں رعنائی کا، چِکنا تنبو حلوائی کا
زینہ زینہ، زینت سے دھرا ہے تھال پہ تھال مٹھائی کا
گردن اونچی رس گلّے کی، سر نیچا ہے بالائی کا
حلوائی دام بٹورتے میں سر مونڈ رہا ہے نائی کا
برفی، امرتی، پیڑا ہے، چم چم، لڈو، گجریلا ہے
یارو یہ عید کا میلا ہے

دھندلے ترپالی منڈوے میں ناٹک نوٹنکی آئی ہے
نوبت، نقّارہ، سارنگی، ڈھولک، جھانجن شہنائی ہے
کُل سولہ ٹیڈی پیسوں میں کس دھوم کی رُسوائی ہے
لیلیٰ کے لبوں پر سُرخی ہے، مجنوں کے گلے میں ٹائی ہے
یہ ہنسنے میں من موجی ہے وہ گانے میں البیلا ہے
یارو یہ عید کا میلا ہے

اِک سرکس ٹیڑھا میڑھا سا، انجام تو کیا آغاز نہیں
اس ریچھ کے منھ میں دانت نہیں، اس باز کی آنکھیں باز نہیں
وہ شیر کہ جس کی مونچھ تو ہے، پر ہیبت نہیں، آواز نہیں
طوطا ہے تو خیر سے گونگا ہے، شاہیں میں پر پرواز نہیں

دو بندر ٹین کے اندر ہیں، دڑبے میں مرغ اکیلا ہے

یارو یہ عید کا میلا ہے

پگڈنڈی جگمگ منڈی ہے، بانسوں پر تنبو تانے ہیں
کچھ نئے نویلے ہوٹل ہیں، کچھ ریستوران پرانے ہیں
ہر ڈھنگ کے سستے کھانے ہیں، ہر رنگ کے فلمی گانے ہیں
کچھ چلتے پھرتے، چھوٹے چھوٹے گشتی نعمت خانے ہیں

تر حلوہ گرم کڑاہی میں، دو لوٹے ہیں، اک ٹھیلا ہے

یارو یہ عید کا میلا ہے

لو اک جی دار بساطی نے ہر چیز لگا دی، چار آنے
کنگھی جاپانی چار آنے، شیشہ بغدادی، چار آنے
پتلی سی چھتری کے نیچے مومی شہزادی، چار آنے
ہر گڑیا، پڑیا، باجا کھاجا، ریشم، کھادی چار آنے

بگلے کی چونچ میں مچھلی ہے، کیلے کے ساتھ کریلا ہے

یارو یہ عید کا میلا ہے

کیا کوچہ و در، کیا کوہ و کمر، گلبرگ ہیں سب گلنار ہیں سب
خوشبو میں بسے گلزار ہیں سب، رنگوں سے بھرے بازار ہیں سب

بچّے تو الھڑ بچّے ہیں، بوڑھے بھی صبا رفتار ہیں سب
پوشاک میں 'چوڑی دار' ہیں سب، خوراک میں مرغا مار ہیں سب
ہر سُو خوشیوں کا ریلا ہے، من منگلا، دِل تربیلا ہے
یارو یہ عید کا میلا ہے

بچّے، بالے، گبھرو، بوڑھے، خوش وقت ہوئے، خوشحال ہوئے
جھولوں میں جھَول کے پھول بنے، فٹ بال بنے بھونچال ہوئے
برقی چکّر میں چکرا کر چہکے تو خوشی سے لال ہوئے
اک دھوم دھڑکّی پھیرے میں سب پیسے استعمال ہوئے
سُندری کے کان میں مُندری ہے، شوہر کی جیب میں دھیلا ہے
یارو یہ عید کا میلا ہے

زاہد کو مے پلا کے پشیمان ہیں ضمیر
نقد و گناہ دونوں ہمارے حساب میں

ریاکاری نہیں جاتی

تن آسانی نہیں جاتی ، ریاکاری نہیں جاتی
میاں برسوں میں یہ صدیوں کی بیماری نہیں جاتی

جنابِ شیخ یوں چلتے ہیں علم و فضل کو لے کر
کسی ٹھیلے سے جیسے کوئی الماری نہیں جاتی

یہ مکتب جن کے کھل جانے سے آنکھیں بند ہو جائیں
یہ دانش جس کے آجانے سے بیکاری نہیں جاتی

میاں گلشیر خاں تم بھی ہَوا کے رُخ کو پہچانو
جہاں ساڑی چلی جاتی ہے پُھلکاری نہیں جاتی

سنا ہے قیس پیدل دوڑتا ہے اب بھی صحرا میں
سنا ہے اس علاقے میں کوئی لاری نہیں جاتی

ضمیرؔ جعفری صاحب اٹھو کچھ کام فرماؤ
فقط رونے سے، میری جان! دشواری نہیں جاتی

ایشیا کے مطمئن بندوں کی یارب داد دے
ابر کو ابر، آسماں کو آسماں رہنے دیا

.....شمع تہ خانے میں ہے

یہ تکلّف ہو تو پھر کیا لطف یارانے میں ہے؟
آنکھ ہے عینک کے پیچھے، ہاتھ دستانے میں ہے

فرق بس اتنا ہی عاقل اور دیوانے میں ہے
اُس کی مشعل بام پر ہے اس کی تہ خانے میں ہے

خط بھی دلکش تھا پر اُن کی خوش کلامی کیا کہیں
جو مزہ ڈالی سے میوہ توڑ کر کھانے میں ہے

قیس ہی پر کچھ نہیں موقوف صحرا پیشگی
اِس طبیعت کا مسافر اب بھی ویرانے میں ہے

سرد مہری کی وہ خنکی ہے کہ یارو آج کل
شمع میں قلفی[۱] جمی ہے برف پروانے میں ہے

۱ے : صحیح "قفلی"

جلسۂ تعمیرِ مسجد کل پہ رکھو دوستو
آج مجھ کو اک ضروری کام میخانے میں ہے

وہ تراشِ زلف و ابرو ہو کہ محرابِ قبا
ہے زنانے میں وہی عالم جو مردانے میں ہے

ہم نے مانا زندگی حسبِ تمنّا تو نہیں
کون سی نیکی مگر گھبرا کے مر جانے میں ہے

ہر نفس اک تازہ تر الجھن کو سلجھانا پڑا
آدمی گھر میں ہے یارب یا کسی تھانے میں ہے

دل کے بے ترتیب و گرد آلود دفتر میں ضمیرؔ
یاد اُن کی اب نہ جانے کون سے خانے میں ہے

مجھ سے مت گھر کا پتا پوچھو کہ جوشِ اشک سے
آج کل بندہ کوئی چھ سات دریاؤں میں ہے

تاروں میں ہوتی ہے

نہ قالینوں میں ہوتی ہے، نہ دستاروں میں ہوتی ہے
بشر کی آبرو کچھ اور معیاروں میں ہوتی ہے

نہیں دیکھی تو دیکھو میرے شہکاروں میں ہوتی ہے
وہ خنکی جو قریب المرگ بیماروں میں ہوتی ہے

ہماری عاجزی کی خُو پہ وہ بیگانہ خُو بولا
یہ وہ خوبی ہے جو خستہ نمک پاروں میں ہوتی ہے

چمک تعلیم سے انسان میں آتی تو ہے اب بھی
مگر دل سے زیادہ آگ رخساروں میں ہوتی ہے

عجب کیا ہے جو بچے برق ہوں فہم و فراست میں
میاں بیوی کی بحث اب کھل کے اخباروں میں ہوتی ہے

کوئی رومی، کوئی رازی، کوئی اقبال پیدا کر
کہ شہروں کی بڑائی اُن کے میناروں میں ہوتی ہے

بشر کے دل میں احساسِ ندامت بھی بڑی شے ہے
عموماً اتنی نیکی سب گنہگاروں میں ہوتی ہے

چلو اچھا ہوا، ناداں ہیں وہ، کم فہم ہوں میں بھی
غلط فہمی، ہمیشہ دو سمجھ داروں میں ہوتی ہے

جنابِ جعفری جو بول کہنا تول کر کہنا
کہ تیری شاعری کی بات درباروں میں ہوتی ہے

تار دیں

ہم تو اپنی زندگی بھی وار دیں
لوگ اگر کچھ تعزیت کے تار دیں

اس زمانے کا تقاضا ہے کہ لوگ
دلبروں کو دل نہ دیں، دینار دیں

ہائے اُن کا سرسری سا التفات
جس طرح خیرات ساہوکار دیں

ساز لے کر بزمِ موسیقی میں اب
باپ گائیں، تھاپ برخوردار دیں

ٹیڈیوں کو کاش اہلِ مدرسہ
علم سے پہلے کوئی شلوار دیں

راہ و رسمِ دوستی اُن سے ہوئی
جن سے در مانگیں تو وہ دیوار دیں

بات چھوٹی ہو تو ہو کچّی نہ ہو
مال وہ جتنا بھی دیں تیّار دیں

کہیے اب کرنل محمدؐ خان سے
شاعری کے ہاتھ میں تلوار دیں

ؐ پاکستان کے ممتاز مزاح نگار ادیب اور 'بجنگ آمد' کے مصنّف کرنل محمد خاں۔

چاند نگر

[کرنل بورمن کی قیادت میں خلائی جہاز 'اپالو، ہشتم' کی چاند کے مدار پر کامیاب پرواز کے ساتھ پروازِ خیال۔ (ض)]

لو اُڑا 'ہشتم اپالو' بند کوزے کی طرح
تیرتا ہے آدمی انڈے میں چوزے کی طرح
چاند اب انساں کے قدموں سے بس اتنی دور ہے
جتنا چک لالے کے اسٹیشن سے کیمبلپور ہے
آسماں رتبہ ہوئی ہے سرزمیں انسان کی
ہے عناصر پر یہ اک فتحِ مبیں انسان کی

ہوتے ہوتے ملکِ آدم زاد ہو جائے گا چاند
رفتہ رفتہ صاحبِ اولاد ہو جائے گا چاند
آرزو کی روشنی، آسودگی کی جان چاند
حُسن، طلعت، رقص، راحت، رنگ، رس، رومان چاند
چاند ہوگا اور زمیں کے گورے کالے مرد و زن
فتنہ و شر، سود و سودا، حیل و حجّت، مکر و فن
بنک، سڑکیں، چوک، چوبارے، چمن، بازار، چاند
مدرسے، کالج، دفاتر، ممٹیاں، مینار چاند
دشت و صحرا چاند، انساں چاند، چوپائے بھی چاند
گھر میں ہم خود چاند، گلیاں چاند، ہمسائے بھی چاند
جتنے رقبے سے ہلالِ عید آتا ہے نظر
اس جگہ ہوں گے، اگر ہوں گے، مسلمانوں کے گھر
سنگ ہائے ناتراشیدہ کے مٹیالے مکاں
سادہ سادہ در کشادہ ڈیوڑھی والے مکاں
اک اترتی تیرگی، ویران دیواروں کے ساتھ
اک لپٹتی روشنی مضبوط میناروں کے ساتھ

اک کھلا میدان ہو گا بہرِ جلسہ و جلوس
دائیں جانب سام ٹام اور بائیں جانب چین و روس

بورمن نے چاند کی تصویر جو بھجوائی ہے
سرد سی تنہائی ہے، کچھ گرم سی گولائی ہے
ہم سمجھتے تھے سراسر روشنی والا ہے چاند
وہ یہ کہتا ہے کہیں گورا، کہیں کالا ہے چاند
کچھ گڑھے، کچھ غار، جن میں جا رہی ہیں سیڑھیاں
جانے کیوں ہیں، کون سے کام آ رہی ہیں سیڑھیاں
اس میں مرغابی کہاں ہو گی کہ شادابی نہیں
کشورِ مہتاب میں کوئی بھی مہتابی نہیں
اس کے دامن میں خود اپنی روشنی ہوتی نہیں
چاند تو ہوتا ہے لیکن چاندنی ہوتی نہیں
ہم سمجھتے تھے کہ یہ پورے کا پورا چاند ہے
وہ ادھورا اور اُدھارا، بھورا بھورا چاند ہے
نم نہیں، پتا نہیں، ڈالی نہیں، سایہ نہیں
چاند کا حلیہ ہمیں تو کچھ پسند آیا نہیں

ذہن میں لے کر نئی دنیا کے امکانات کو
ایک میرے مہرباں کہنے لگے کل رات کو
کہہ رہی ہے ہم سے جو منّے کی ماں ہم بھی کریں
چاند پر جاکر کوئی کارِ جہاں ہم بھی کریں
ہو اگر اک چائے کا اسٹال بر نوکِ ہلال
میری رائے میں تو رش لے گا بہت نکلے گا مال
عطر، پوڈر، تولیے، شیشے ہوں یا کریانہ ہو؟
تازہ پھل، ترکاریاں رکھیں کہ مرغی خانہ ہو؟
اک اُڑن ہوٹل اُڑائیں ساری پروازوں کے ساتھ
ہو سکے تو خود بھی اُڑ جائیں خلابازوں کے ساتھ
ابتدا میں ایشیا کے لوگ ہوں گے خال خال
کم گلے گی اس لیے مشرق کے مسکینوں کی دال
وزنِ اشیا میں جو پیش آئے گی دشواری بہت
چاند بازاروں میں ہو گی چور بازاری بہت
چاندنی میں لطف آجائے گا اس اندھیر کا
چیز اک اک پاؤ کی اور دام دو دو سیر کا

چاند کے مرکز میں قطعہ جات جب ہوں گے الاٹ
مجھ کو قسطوں پر دلا دیں ایک ستھرا سا پلاٹ

دسمبر ۱۹۶۸

یوں جہدِ للبقا سے نبٹتے رہے ضمیر
لٹتے رہے کبھی تو کبھی دیکھتے رہے

ہر چند کہ تھا مگر نہیں تھا

(پاکستان انگلستان کرکٹ ٹیسٹ میچ، کراچی میں،
انگریز کھلاڑیوں کی سست رفتاری سے عاجز آ کر)

بلّم بازوں کے شہر میں بلّے بازی کا جب شور ہوا
موسم کا مزاج انگریز ہوا، بھولا، سر جوزف بھور ہوا
ڈیڈی گھر سے مفرور ہوا، ٹیڈی کالج کا چور ہوا
گھس گھس پہ طبیعت گھبرائی، ٹھپ ٹھپ سے کلیجہ بور[1] ہوا
نے کٹ[2] باجی، نے ہٹ[3] لاگی، نے رن[4] بھاگی، نے کیچ[5] ہوا
یہ کھیل بھی کوئی کھیل ہوا، یہ میچ[6] بھی کوئی میچ ہوا

موجود، ہجوم خوش میں خوش اقبال بھی، خوش اقبالیاں بھی
نو غنچے، ڈھلمل شوہر، جھلمل بیویاں، کافر سالیاں بھی
لوگوں نے بجائیں تالیاں بھی، یاروں نے سنائیں گالیاں بھی
تنگ آ گئے دیکھنے والے بھی، زچ ہو گئیں دیکھنے والیاں بھی

---

[1] BORE [2] CUT [3] HIT [4] RUN [5] CATCH
[6] MATCH

نے کٹ باجی، نے ہٹ لاگی، نے رن بھاگی، نے کیچ ہوا
یہ کھیل بھی کوئی کھیل ہوا یہ میچ بھی کوئی میچ ہوا

بابو، مسٹر، مولانا، افسر، تاجر، ساہوکار آئے
بس، بگھی، موٹر، ٹم ٹم، رکشا، ٹھیلے میں اسوار آئے
کچھ اپنے 'چوکے' چھوڑ آئے، کچھ اپنے چھکّے مار آئے
اک آدھے میچ میں بیٹھے بیٹھے پوری عمر گزار آئے

نے کٹ باجی، نے ہٹ لاگی، نے رن بھاگی، نے کیچ ہوا
یہ کھیل بھی کوئی کھیل ہوا، یہ میچ بھی کوئی میچ ہوا

سیروں چلغوزے ڈھیر ہوئے، چلتی رہی پیالی چائے کی
یاں نعمت مرغِ مسلّم کی، واں دعوت اونچے پائے کی
اک 'ریس'[1] تھی کھانے پینے میں، ہمسائے سے ہمسائے کی
انگریزی سے جب اکتائے، اردو میں ہائے ہائے کی

نے کٹ باجی، نے ہٹ لاگی، نے رن بھاگی، نے کیچ ہوا
یہ کھیل بھی کوئی کھیل ہوا، یہ میچ بھی کوئی میچ ہوا

---

[1] ریس RACE

تماشائی

(ایک کرکٹ میچ میں)

گل رخوں کے حال کی باتیں کریں
کم سنوں کے سال کی باتیں کریں

'بیٹ' کی عظمت کا افسانہ سنائیں
'بال' کے اقبال کی باتیں کریں

دور بینوں کو گھما کر دور تک
ہر پری تمثال کی باتیں کریں

اپنی اپنی چاندنی کا ذکر ہو
اپنے اپنے 'مال' کی باتیں کریں

اُس کو چوکس فیلڈ پر شاباش دیں
اِس کے بوگس 'کال' کی باتیں کریں

دلبروں کے قد و گیسو ناپ کر
شال کی اور 'فال' کی باتیں کریں

رُخ پہ دیں پنجاب کو دادِ نظر
زلف سے بنگال کی باتیں کریں

مہ وشوں کے جگمگاتے شہر میں
دل کے استعمال کی باتیں کریں

چلیے اب صدّیق[1] کے چل کر ضمیر
غالب و اقبال کی باتیں کریں

---

[1] پروفیسر صِدّیق کلیم (پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور)

ہال کے بال

(ویسٹ انڈیز کے تیز رفتار باؤلر وزلے ہال کا کھیل دیکھ کر)

شور اُٹھتا کہ ہالؔ آتا ہے
کھیل کا انتقال آتا ہے

•

ہالؔ پر جب جلال آتا ہے
بالؔ سے پہلے حال آتا ہے

ہم کو تو کچھ نظر نہیں آتا
لوگ کہتے ہیں 'بالؔ' آتا ہے

الاماں اس کی برق رفتاری
'بال' ہے یا خیال آتا ہے

'بال' آتا ہے یا نہیں آتا
کچھ مگر لال لال آتا ہے

ایرانی بہو کا خیر مقدم

[ہمارے چھوٹے بیٹے عزیزی امتنان ضمیر حیدر نے ۱۹۷۹ء میں، جب وہ لندن میں مقیم تھا، ایک ایرانی لڑکی ماری صوفی سانیہ وش کو اپنی رفیقۂ حیات بنالیا۔ ماری ایران کے ایک خوبصورت کوہستانی قصبہ املش کے شہروار ارباب عبدالعلی کی دختر نیک اختر ہے۔ ہماری بڑی بہو عزیزہ روبینہ (بیگم میجر احتشام ضمیر حیدر) بھی ہمارے گھر کا اُجالا تھی۔ بحمد اللہ کہ اب اس اُجالے میں ایک نئی روشنی اور نئے رنگ کا اضافہ ہوگیا۔ (ض)]

ماری و امتنان کی شادی
باعثِ انبساط و آبادی
تازگی امتزاجِ دلکش کی
یہ ہے جہلم کا وہ ہے املش کی
دو اُجالوں کی باہم آمیزی
ایک پنجابی —— ایک تبریزی

لڑ گئی تھی نگاہ لندن میں
ہو گیا پھر بیاہ لندن میں
چاندنی — بام سے اُتر آئی
فارسی — 'نارسی' کے گھر آئی
سادہ پانی بھی آبِ ناب ہوا
بسترِ عام — 'رختِ خواب' ہوا
کالی چڑیا — پرندِ گل دُم ہے
کھاٹ اب تخت ہے، گھڑا 'خُم' ہے
'کیسہ' تھیلا ہے 'ظرف' برتن ہے
گفتگو کرنا — 'حرف کردن' ہے
یاں جو ابتر ہے واں بھی ابتر ہے
نوکر — ایران میں بھی 'نوکر' ہے
نام ہر شے کا شاعرانہ ہے
'میرزا خضمی' ایک کھانا ہے
ہمہ خانہ تمام ایرانی
اک نمکدانی ہے نمک دانی

گھر میں چھوٹی سی 'آر، سی، ڈی' ہے
ساری برکت یہ فارسی کی ہے
نام جب فارسی کمنـد ہوا
دال کا مرتبہ بلنـد ہوا
جب کوئی شے دکاں سے آتی ہے
اک مثال اصفہاں سے آتی ہے
سوئے مطبخ تپش بہ جاں آید
کہ وہاں — 'بوئے مولیاں' آید
جہاں کرتے تھے ما شُما حمّام
اب نہاتے ہیں حافظ و خیّام

شاخِ شیشم پہ بلبلِ شیراز
میرے فرزند تیری عمر دراز
گھر میں ہے امن و آشتی دن رات
کہ نہیں ساس اور بہو میں بات
ساس بیچاری ساس خُو ہی نہیں
دُو بہ دُو کیا ہو — گفتگو ہی نہیں

جب بہو نے پیاز پیاز کیا
ساس نے بوسۂ نیاز لیا

گھر میں پھرتی ہے دختروں کی طرح
بالکل اپنے کبوتروں کی طرح
فاصلہ قربتوں میں شیر و شکر
روح مانوس — اجنبی پیکر
درسِ تاریخ ہم ورق ہے بہت
نقشِ تہذیب، مشترک ہے بہت
ذائقہ ہے وہی پلاؤ کا
خواہ ہو اُس میں گوشت گاؤ کا
نسبتِ طَیبہ و حجاز وہی
روضہ خوانی وہی، نماز وہی
طرزِ ذہن و نمِ نمو بھی وہی
فکرِ عقبیٰ و ذکرِ ھُو بھی وہی
زندگی کی اساس، اصول وہی
رہ وہی، رب وہی، رسولؐ وہی

اقبال اور ہم

اقبالؔ کا پیام اخوت کا ترجماں
مِلّت کو دیکھیے کہ ہے آپس میں ہم نبرد
داعی وہ فقر کا تھا پیمبر خودی کا تھا
تن پر ہمارے قرض کی پوشاک لاجورد
کہتا تھا شالامار میں کل ایک برگِ زرد
"بلبل چہ گفت، گل چہ شنید و صبا چہ کرد"

تجاہل

گلی نگر پہ دھیان نہ تھا
روزنِ در پہ آنکھ نہ تھی
شہر کے شور پہ کان نہ تھا
ہم سمجھے خاموشی ہے
جیسے بجلی جنگل میں
شاخ و شجر کو راکھ کرے
ہم نے کب شعلہ دیکھا
ہم نے کب آواز سنی

صاحب اور میں

(انگریزی سے ماخوذ ایک تابلیو)

(۱)

سو باتوں کی ایک ہی بات   تگڑا اوپر والا ہاتھ
مجھ سے کام میں ہو تاخیر
کاہل سست خطاب ملے   فردِ حساب خراب ملے
صاحب سے گر ہو تاخیر
برجستہ اس کی تعبیر
ق
کرتا ہے ماتحت ضمیر
یارو کیس پرانا تھا
اس میں دفن زمانہ تھا

درد، بخار اور کھانسی میں
صاحب جا کر جھانسی میں
چھانٹ رہے ہیں تفصیلات سو باتوں کی ایک ہی بات
تگڑا اوپر والا ہاتھ

(۲)

کوئی کام!
ہم سے ہو کم سرانجام صاحب بولے — 'ہڈ حرام'
خود چاہا جب کرنا کام 'سر' سے ہو کب سرانجام
برسوں تک!

گنا کاٹ کے سرسوں تک
'مثل' رہی اٹکی لٹکی
فرض کی پھانس کہاں کھٹکی

لوگ مگر چپ رہتے ہیں
بولیں بھی تو کہتے ہیں
صاحب کا کچھ دوش نہیں
اس کو اپنا ہوش نہیں

کام رہے موقوف بہت
صاحب تھا مصروف بہت

(۳)

میں صاحب کی تعریف کروں
اتنا ہی کہوں
وہ دانش و حکمت والا ہے
قد چھوٹا ہے ، سر بالا ہے
جو ہم چشموں کا ٹولا ہے
ہر فرد اُس کا بڑبولا ہے
یہ ٹولا کب چُپ رہتا ہے
کہتا ہے
تو صاحب کے دل اور دماغ پہ مکھّن پالش کرتا ہے
کیا بڑھیا مالش کرتا ہے

(۴)

لیکن صاحب! ــــ میرا صاحب
جب اپنے 'باس' سے کہتا ہے

تُو فخرِ وطن ـــ تُو نازِ زمن!
تُو دھوپ میں برگد کی چھاؤں
تُو موتی ہے تُو کندن ہے
تُو کھیت پہ برسا ساون ہے
تو اِس کا نام تعاون ہے

(۵)

دنیا کے کِسی 'بابو گھر' میں
مرے صاحب سا
کوئی صاحب کم بنیاد نہیں
مری ہر خامی ازبر اُس کو
مری کوئی خوبی یاد نہیں

ـــــــــــــــــ ۱۹۸۲ء

چوری کا مال

اک مردِ مجرّد کے گھر سے
چوروں کے ہاتھ جو مال آیا
اس مال کو دیکھ کے بیاہے ہوؤں کو حال آیا
رنگین بلاؤز جاپانی
مسکے مسکے ___ ورقے ورقے
کچھ شب جامے درکے درکے

کچھ نیم شلو کے نسوانی
لبنانی
جن سے چھلکے گوری کا بدن
آویزے — فرغل — بال کلپ
اودے اودے دھانی دھانی
اس مردِ مجرّد کے گھر سے
ہر شے نکلی — 'نامردانی'

———— (ماخوذ)

ایک ظریف کی قبر کا کتبہ

یہ ہے لزلے جیک کی قبر
کندہ جس پر آیۂ صبر
جسماً۔ نازک، نرم، نحیف
قسماً۔ نازک، نرم، نحیف
ڈربی کے بازاروں میں جُوتے پالش کرتا تھا
لوگ ہوئے ریٹائر جب

بھر گیا ڈربی شائر جب
منھگے ہو گئے ٹائر جب
لنڈے گنجے پنشنروں کے سر کی مالش کرتا تھا
اب بھی گویا ایک طرح کے جُوتے پالش کرتا تھا

——— (انگریزی سے ماخوذ)

مسز ولیم

مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو
کبھی مکھن، کبھی پتھر کبھی افیون تھی یارو
فرانسیسی ملی انگریزیوں میں بات کرتی تھی
وہ دن گلیوں میں رہتی تھی، کلب میں رات کرتی تھی
تکلّم میں پرانی بلبلوں کو مات کرتی تھی
گئی گزری سہی، لیکن گزر اوقات کرتی تھی

تلوّن کیش اتنی — جنوری میں جُون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

وہ آنکھیں بحرِ اطلانتک کے نیلے پانیوں جیسی
بدن یونانیوں جیسا، نظر مصرانیوں جیسی
جوانی میں بکنگھم کی جواں ملکانیوں جیسی
طبیعت نا ملائم — مستقل استانیوں جیسی
وہ خود منصف بھی تھی، خود مجرم بھی تھی، خود قانون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

فرنگ و ایشیا میں بانکپن مشہور تھا اُس کا
دلوں میں آگ سُلگانے کا فن مشہور تھا اُس کا
دہن معدوم تھا لیکن سخن مشہور تھا اُس کا
وہ عورت تھی مگر مردانہ پن مشہور تھا اُس کا
محلّے بھر کی افواہوں کا ٹیلی فون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

بڑی بی زندگی سے والہانہ پیار رکھتی تھی
رسیلی آنکھ — تازہ روغنی رخسار رکھتی تھی

گھڑی، پرس اور چھتری ہر گھڑی تیار رکھتی تھی
گھر انگلستان میں ــــ عاشق سمندر پار رکھتی تھی

وہ کھانا بے حساب اُس کا، وہ پینا بے ہراس اُس کا
بھرا رہتا تھا ہر مشروبِ رنگیں سے گلاس اُس کا
وہ خود خوش باش تھی خوش باش سارا آس پاس اُس کا
بدلتا تھا بہر تقریب غازہ اور لباس اُس کا
کبھی گھگرا، کبھی پتلون ہی پتلون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

زباں زدِ عام تھیں لندن میں خوش اندامیاں اُس کی
انوکھی تھیں ہر اک مادام سے مادامیاں اُس کی
کئی تھانوں کے اندر مشتہر تھیں خامیاں اُس کی
کہ شہزادوں سے بھی منسوب تھیں بدنامیاں اُس کی

ابھی دانتوں میں تھیں موتی کی لڑیاں، لوچ بانہوں میں
ابھی کچھ ساحلی کونجوں کی حسرت تھی نگاہوں میں
وہ اس سن میں بھی اک سروِ رواں تھی سیرگاہوں میں

کبھی لندن کبھی دہلی کبھی رنگون سے تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

شبِ آدینہ جب سر جان ینگ آتے تھے گھر اُس کے
کئی کوٹھوں سے اُڑ اُڑ کر پتنگ آتے تھے گھر اُس کے
ملنگ آتے تھے اور پی پی کے بھنگ آتے تھے گھر اُس کے
گریجوایٹ، ایل ایل بی لفنگ آتے تھے گھر اُس کے
سِول سروس کے مرغانِ کلنگ آتے تھے گھر اُس کے
کئی جرنیل اپنے گھر سے تنگ آتے تھے گھر اُس کے
امیر البحر نیوی کے نہنگ آتے تھے گھر اُس کے
زر و زیور جواہر رنگ رنگ آتے تھے گھر اُس کے
شِلنگ آتے تھے اور بھرتے شِلنگ آتے تھے گھر اُس کے

وہ شب گردوں کے حق میں مستقل شب خون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

——— (انگریزی سے ماخوذ)

سفارتی زبان

بہم آشتی کا نیا فارمولا
جو ہم نے قبولا
یہ مانا کہ یہ نسخۂ ماسبق کے
برابر نہیں ہے
مگر اس کو دیکھیں اگر ہم
بحیرہ خزر کے تناظر میں رکھ کر

عرب سے اٹھا کر
پشاور میں رکھ کر
نتائج کو چکھ کر
تو معلوم ہو گا
کہ اس فارمولے سے کمتر نہیں ہے
بظاہر یہ جس کے برابر نہیں ہے

دہلی (جن پت ہوٹل) —————— ۱۲ مارچ ۱۹۸۳ء

بادشاہ کی محبوبہ

مجھ سے محبّت ہو جس کو
اُس کے اندر مٹّی کی
آخر کچھ خوشبو تو ہو

بے شک آپ کا نام بلند
تخت نگاریں ــــ بام بلند

منظرِ گُل اندام بہت
جس میں نہ ہو کوئی خامی
وہ انسان ہے خام بہت

—————— (شیکسپیئر سے ماخوذ)

اُلّو اور بلبل

دانا ہی سہی
اُلّو سے نہ رائے مانگ کبھی
سُن بانی ـــــ شاخ پہ جھومتی گاتی بلبل کی
یا ـــــ سبزہ و گل میں گھلی ہوئی
اور بکھلی ہوئی
ست رنگ پروں کی لالیٔ سے

لہ LARK

اس بے فکری دیوانی سی
مستانی کلغی والی سے

تجھے آس ملے
تری پیاس بجھے
تسکین — سرور — مٹھاس ملے

جیسے شاعر کے بول کر من میں جا اُتریں
اور 'بور' کتھا پرچارک کی

——————— (انگریزی شاعر آسٹن سے ماخوذ)

ضمیریات

مایوس و مضمحل ہیں یتیم و لسیر ہیں
وہ بھی مری طرح ہی ترقّی پذیر ہیں

جن کا کلام خام وہی برسرِ کلام
نا دسترس جو ہاتھ وہی دستگیر ہیں

ان کے سخن سے کھل نہ سکا آج تک کہ وہ
'ریحُ الحریر' ہیں کہ 'مسیحُ المصیر' ہیں

۱، ۲ : بے معنی الفاظ

جن کے اُداس رُخ پہ ہے سب سے زیادہ گرد
یہ آسمانِ علم کے بدرِ منیر ہیں

ہم اپنے حق میں آپ ستم آفریں رہے
زندہ ہیں آج تک کہ بہت خوش خمیر ہیں

اب عام آدمی کو ترستی ہیں بستیاں
سب ساکنانِ شہر شیوخِ کبیر ہیں

مٹّی کے اس قدیم دیے کا کرم بھی دیکھ
بجلی جہاں نہیں، وہیں روشن ضمیر ہیں

الزام بے وفائی کا ہم پر غلط غلط
جانِ ضمیر ہم تو مزاجاً وزیر ہیں

۱۹۸۳ء

❋

کسی سے ملاقات ہونے لگی ہے
تھا ڈر جس سے وہ بات ہونے لگی ہے

الٰہی یہ کیا بات ہونے لگی ہے
سحر ہے مگر رات ہونے لگی ہے

ہلاکت کا سامانِ نَو وضع ہو گا
کہ 'تخفیفِ آلات' ہونے لگی ہے

'لُبوبِ روایات' سے شاعری اب
'سُفوفِ خیالات' ہونے لگی ہے

بڑھاؤ نہ اب اور نفری پولس کی
کہ دنیا حوالات ہونے لگی ہے

سیاست، محبّت — کوئی منطقہ ہو
طویل آجکل رات ہونے لگی ہے

وسائل کا تو آپ کو علم ہوگا
مسائل کی بہتات ہونے لگی ہے

فکاہاتِ منظوم سے پھر ہماری
فعولن فعولات ہونے لگی ہے

ضمیرؔ اپنے جذبات قابو میں رکھنا
کہ تجھ سے تری بات ہونے لگی ہے

۱۹۸۴ء —————

❋

سایہ ہے ساعتوں پہ یہ کن واقعات کا
سورج کی روشنی میں اندھیرا ہے رات کا

بوسہ تو 'ماڈرن لبِ خوباں' کا خوب تھا
کھانا بھی کھا سکو گے کبھی اس کے ہاتھ کا

سادہ سی داستاں ہے حرم کے زوال کی
بے دخلیوں کا ذکر یا 'مدخولیات' کا

اپنی سیاست اپنا نظامِ معاشیات
پگڑی کسی کی ، طُرّہ سکندر حیات کا

کیا پوچھتے ہو گردشِ ایّام کی روش
دیکھا نہیں ہے آپ نے قلعہ رَوات کا

برِّ صغیر ہند میں انسان آج تک
مُھرتا ہے ساگ پات کا یا ذات پات کا

اپنے چمن کا حال یہ ہے جیسے گاؤں میں
کیکر کٹا پڑا ہو کسی شاملات کا

امریکا اور روس نے ، اے ربِّ کائنات!
ٹھیکا لیا ہوا ہے تری کائنات کا

تا حشر ماں کے پیار کو ترسے گی زندگی
ڈھلنے کو ہے خراد سے انسان دھات کا

واعظ بھی کچھ گھٹا تو نہیں علمِ دین میں
مینار ہے عرب کے سلے پارچات کا

دیکھو ضمیرؔ کو کہ غزل کی صراحی سے
کھولے ہوئے ہے درّۂ خیبر حیات کا

———— ۱۹۸۲ء

رातیں مہتاب سے خالی ہیں
یا ساری بھیڑیں کالی ہیں

تُو اپنا دُنبہ سمجھ ہمیں
تیری آنکھیں دُنبالی ہیں

جو باہر جتنے پھیل گئے
اندر سے اتنے خالی ہیں

اقبال کے چیلوں کو دیکھو
اکثر مُجرمِ اقبالی ہیں

اک روٹی اصل حقیقت ہے
باقی اصنام خیالی ہیں

امریکا ہو یا روس میاں
دونوں رفلیں دو نالی ہیں

امیدیں ہیں یا لوگوں کی
اولادیں سے کر پالی ہیں

ورثے میں ملیں جتنی چیزیں
کچھ پی لی ہیں، کچھ کھالی ہیں

———— ۱۹۸۲ء

✺

آدمی جتنا مہذّب ہوگیا
اُتنا ہی بیگانۂ رب ہوگیا

دیکھ کر اُس کو بڑی حیرت ہوئی
جانے وہ اِتنا بڑا کب ہوگیا

شیخ کی ہر 'گل' ادھوری رہ گئی
جو برہمن نے کہا سب ہوگیا

اُس کی اُمّیدوں کی سیرابی نہ پوچھ
جو تمھارے 'ہاتھ کا ٹب' ہوگیا

ہر سڑک پر اَب سنو میری 'بڑک'
شہر داروغہ 'رجاسبؔ' ہوگیا

۱۹۸۲ء

ا؎ محبّی راجہ رجاسب خاں (کپتان پولیس)

زندگی کو راس تُو آیا نہ آیا راس میں
جس قدر بکواس تُو ہے اُس قدر بکواس میں

دے گئی اسلامیوں کو یہ سبق جنگِ یہود
مصر سے مالیشیا تک گھاس تُو ہے گھاس میں

زندگی کا ضابطہ باہر نکلتا ہی نہیں
مدّتوں سے منجمد ہوں فی الصّدورالنّاس میں

کتنی کتنی۔ کس طرح، کس کس کو دُوں جمہوریت
گھر گیا۔ 'نامیٹرک پاسوں' میں 'بی اے پاس' ہیں

ڈیوڑھی ہی میں سہی — کُرسی نشینی تو ملی
مفلسوں کی صف میں ہوں اک فردِ خاص الخاص میں

بے درو دیوار سی ہے میری طبعِ دفتری
محکمہ مَیں — میز مَیں ہُوں، 'باس' مَیں، قرطاس مَیں

شاعری ہے زندگی کے 'کوکا کولا کا پلانٹ'
شعر میری بوتلیں ہیں قلزمِ احساس مَیں

رس ہے جس تن رس نچوڑے، تیل جس کُن تیل دے
گلشنِ امّید کا تربوز تُو خسخاس مَیں

وہ محبّت کی ہو بازی یا سیاست کا ہو کھیل
ہار جاؤں کھیل لیکن جیت جاؤں 'ٹاس' مَیں

عشق لفظوں سے وَرا اک فعل ہے ورنہ ضمیر
وہ تھا پیرس کا پرندہ اور 'خیبر پاس' مَیں

———— ۱۹۸۲ء

کیجیے اسلاف کی قبریں فروخت
اِس طرح مٹّی کو گھی کر لیجیے
اتنے بچّے ہوں کہ گھر میں مُستقل
"گھا گرا پلٹن" کھڑی کر لیجیے

خوب تھے سالک[1] ترے مہمان بھی
کھا گئے روٹی بھی دسترخوان بھی

---

[1] برادرم کیپٹن صدّیق سالک

٭

آدمی تو شہر میں بے حال دیکھا جائے گا
بھینس کا گوبر 'بلند اقبال' دیکھا جائے گا

حشر کے دن نامۂ اعمال دیکھا جائے گا
ہم یہ سمجھے تھے وہاں فُٹ بال دیکھا جائے گا

عشق میں وہ بھی گریباں چاک آوارہ پھریں
کس سے مستورات کا یہ حال دیکھا جائے گا

سج رہی تھی جس جگہ کل تک کتابوں کی دکان
اس جگہ اب 'لکڑیوں کا ٹال' دیکھا جائے گا

آج کے جھنجھٹ سے فرصت ہی نہ پائی آج تک
اگلے دن کا کام اگلے سال دیکھا جائے گا

منحصر اس بات پر ہے فیصلہ اقدار کا
'مانگ' دیکھی جائے گی یا مال دیکھا جائے گا

روس و امریکا کی نیّت غیر مبہم ہے مگر
مچھلیوں سے مانجھیوں کا جال دیکھا جائے گا

روح میں پھیلی ہوئی اس سرد پیلی ریت میں
تجھ سے کیونکر اپنا چہرہ لال دیکھا جائے گا

کھیت سے اُگتی تھی جو، اب وہ کھُلی فرصت کہاں
اب تو گھر گھر وقت کا گھڑیال دیکھا جائے گا

مجلسیں تو دیکھ لی ہیں مجلسِ اقوام تک
اب ذرا 'چوپال' کو بھی 'پال' دیکھا جائے گا

میری اردو میں مری مٹّی کی خوشبو کے طفیل
دیکھنا! بھوپال میں چکوال دیکھا جائے گا

وقت سے کہہ دو کہ آخر تک ضمیرؔ جعفری
جب بھی دیکھا جائے گا چونچال دیکھا جائے گا

۱۹۸۳ء

❋

خوں ہے مگر جنوں نہیں، نیند ہے خواب کے بغیر
جینا ہے محض حاضری، عہدِ شباب کے بغیر

آج کا یہ اُداس زرد بے لباس آدمی
سیخ کباب کے بغیر، جامِ شراب کے بغیر

کون ہے جو کہیں کہیں تھوڑا بہت غلط نہیں
زندگی اک سوال ہے ٹھیک جواب کے بغیر

کیوں نہ ہو کم نم و نمُو ــــ افریقہ اور ایشیا
علم، کتاب کے بغیر ــــ خرچ، حساب کے بغیر

رُوئے زمیں پہ وہ درخت شاید ابھی اُگا نہیں
چڑیاں جہاں چہک سکیں، خوفِ عقاب کے بغیر

اپنی نگاہ اور پسند — ہم کو تو ناپسند ہیں
آب، شراب کے سوا، پھول گلاب کے بغیر

اپنی زمیں ہے اپنی ذات باقی ہیں سب تکلّفات
لاف گزاف میری بات، راوی چناب کے بغیر

کیسے کروں میں اتّباع امریکا اور روس کا
یہ انقلاب کے بغیر، وہ احتساب کے بغیر

کیسے گزار دی ضمیرؔ تو نے یہ نیم سینچری
شب، ماہ تاب کے بغیر، دن آفتاب کے بغیر

—— ۱۹۸۴ء

✻

نظر اُٹھی بھی ہماری اگر کسُو کی طرف
گئی تھی رُو کی طرف جا پڑی گلُو کی طرف

یہ رام نام کی مالا جپن سے کیا حاصل
کہ دھیان مے کی طرف ہے نظر سبُو کی طرف

ہم اک الگ سا جزیرہ ہیں شانت ساگر میں
نہ ماسکو کی طرف ہیں نہ ٹوکیو کی طرف

خدا نہ بدلے گا آئین ایشیا کے لیے
نمو نمو سے ہے پیدا — لہو، لہو کی طرف

ولایتیں ہیں سپر کشوروں کے زیرِ نگیں
یہ اِس وَلی کی طرف ہے وہ اُس گرو کی طرف

ہوائے سیر و سفر تو ہمیں زیادہ نہیں
یہ آبِ جو لیے پھرتا ہے آبِ جو کی طرف

ہمارے پاس تو وہ لوٹ کر نہیں آئی
صبا گئی تو تھی بُستانِ آرزو کی طرف

کہاں چلے ہو کلامِ مبیں سنانے کو
مشاعرہ تو ہے مرغانِ خوش گلو کی طرف

———— ۱۹۸۳ء

منزلوں کی جگہ راستہ لکھ دیا
لکھنے والے مرے حق میں کیا لکھ دیا

درد کو نسخۂ کیمیا لکھ دیا
نام کس چیز کا ارتقا لکھ دیا

میں تو اس کے اک اک لفظ سے جل اُٹھا
خط لکھایا خطِ استوا لکھ دیا

کب کچہری لگی، کب گواہی ہوئی
منصفوں نے مگر فیصلہ لکھ دیا

شیخ صاحب بجا مجھ سے ناراض ہیں
میں نے 'اُستر' کو بھی 'اُسترا' لکھ دیا

سب نگر ایک سے ہیں مگر بام پر
ٹیکسلا لکھ دیا، کوئٹہ لکھ دیا

اے عزیزانِ فردا تمھیں کیا خبر
ہم سے جیسے بھی لکھا گیا لکھ دیا

۱۹۸۲ء ——————

ہم یہ سمجھے تھے کچھ 'ٹک ٹُکا' ہو گیا
اِرتقا تو مگر 'ایشیا' ہو گیا

کیا کروں اے خداوند! میں کیا کروں
سازِ ہستی اگر بے سُرا ہو گیا

آج ہم بے نشاں بے کماں ہی سہی
یہ نہ سمجھو کوئی فیصلہ ہو گیا

ہونٹ چُپ تھے مگر داستاں بن گئی
پاؤں شل تھے مگر فاصلہ ہوگیا

یہ سمجھ لو کوئی گھر سلامت نہیں
سرحدوں میں اگر راستہ ہوگیا

ایسی کج صف نمازوں سے کیا فائدہ
جن سے خود آدمی ہی قضا ہوگیا

چھب جوانی کی یا حکمرانی کی تھی
اک برس ہی میں وہ کیا سے کیا ہوگیا

خود انا اپنے حق میں بلا ہو گئی
آدمی، آدمی کا خُدا ہو گیا

۱۹۸۳ء

٭

جس طرح کوئی حسیں جوگن جواں جوگی کے ساتھ
بعض قومیں ماس کھاتی ہیں مگر گوبھی کے ساتھ

شیخ جی کی بات چل سکتی نہیں اس دور میں
وہ یہ کہتے ہیں کہ موٹر باندھ لو بگھی کے ساتھ

فاصلہ اوصاف میں الفاظ سے پیدا ہوا
ہم اُدیب عالِم کے پیچھے، آپ اُیل ایل بی کے ساتھ

سادگی کی بات مرمر کی سلوں پر بیٹھ کر
جَو کی روٹی جس طرح کھاتا ہو کوئی گھی کے ساتھ

لُطف کی تجدید گویا قتل کی تمہید تھی
امن کا نسخہ لکھا جاتا رہا برچھی کے ساتھ

پھول دھرتی پر، ستارے آسمانوں میں نہیں
وہ 'چندر بنسی' بنے پھرتے ہیں تاریکی کے ساتھ

مشرق و مغرب ہو، وہ اقوام یا افراد ہوں
کون راتیں جاگتا ہے مستقل روگی کے ساتھ

پیر[1] صاحب آپ کو کچھ زیب تو دیتی نہیں
من کی باتیں، تن پہ اس دو تین من چربی کے ساتھ

---

[1] میرے بعض احباب مجھے از راہِ محبت 'پیر و مرشد' بھی کہتے ہیں۔ (ض)

٭

ایک چمچہ دال کا اور ایک ٹکڑا نان کا
امتحاں روزانہ لیتا ہے مرے ایمان کا

کر لیا اک جست میں گو ماہ و انجم کو شکار
پر نہیں پایا ابھی تک بھیڑیا انسان کا

ربط و ضبطِ فرد و ملّت اس لیے بھی خبط ہے
بڑھ گیا مضمون سے رقبہ مرے عنوان کا

کارخانوں کی اُدھاری چمنیوں سے کیا ملا
دھند کچھ برطانیا کی کچھ دھواں جاپان کا

ساحلوں پر کون سنتا تھا پرندوں کی پکار
کشتیاں ڈوبیں تو اندازہ ہوا طوفان کا

بحر و بر چھائے مگر نعم البدل دیکھا نہیں
اپنی ریشم جان کا، اپنے سمندر خان کا

دیدنی ہے بعض نَو آزاد ملکوں کا چلن
پیٹ میں روٹی نہیں ہے، منہ میں پتّا پان کا

زندگی کی ہر پرَت میں بس یہی دیکھا ضمیر
گرد موٹر کار کی ۔ چالان گاڑی بان کا

بائرن ایونیو ۔ ہنولو ۔ لندن ——— ۱۸ ستمبر ۱۹۸۱
آشیانہ غلام علی بلبل کشمیری

؎ بائرن ایونیو ۔ ہنولو ۔ لندن ۔ آشیانہ غلام علی بُلبُل کشمیری

اُن سے اک دن ملاقات ہو جائے گی
جس سے ڈرتے ہیں وہ بات ہو جائے گی

اپنے سورج پہ اتنا بھروسا نہ کر
دن کے ہوتے ہوئے رات ہو جائے گی

اشک پینے سے پرہیز ہے اِس لیے
دل کے اندر 'نباتات' ہو جائے گی

آدمی ذات بھی دھات بن جائے گا
زندگی محض آلات ہو جائے گی

ہے یہی حسِ حرکت تو پھر زندگی
حسرتوں کی حوالات ہو جائے گی

ذہن میں ہو اگر کوئی روشن کرن
وہ ستاروں کی بارات ہو جائے گی

کب تک آفاق و انفاس کی فرصتیں
ایک دن آخری رات ہو جائے گی

شاہ ڈیرے[1] تک ابر آج آیا تو ہے
لگ رہا ہے کہ برسات ہو جائے گی

——— ۲۸ فروری ۱۹۸۳

[1] یہ اشعار حمزہ والی (ضلع مظفر گڑھ) اپنے کھیت چھپر میں کہے گئے۔ (ض)

آدمی

تھا کبھی علم آدمی، دل آدمی، پیار آدمی
آج کل زر آدمی، قصر آدمی، کار آدمی

کلبلاتی بستیاں، مشکل سے دو چار آدمی
کتنا کمیاب آدمی ہے، کتنا بسیار آدمی

پتلی گردن، پتلے ابرو، پتلے لب، پتلی کمر
جتنا بیمار آدمی، اتنا طرحدار آدمی

زندگی نیچے کہیں منھ دیکھتی ہی رہ گئی
کتنا اونچا لے گیا جینے کا معیار آدمی

عمر بھر صحرا نوردی کی، مگر شادی نہ کی
قیس دیوانہ بھی تھا کتنا سمجھ دار آدمی

دانش و حکمت کی ساری روشنی کے باوجود
کم ہی ملتا ہے زمانے میں کم آزار آدمی

دل رہینِ صومعہ، دستار رہنِ میکدہ
تھا ضمیرِ جعفری بھی اک مزیدار آدمی

پہلے کشتی ڈوب جاتی تھی نظر کے سامنے
اب گرے گا بحرِ اوقیانوس کے پار آدمی

حدیثِ دوست

(از: نذیر احمد شیخ)

خاندانی سیّدوں کی آل ہیں میجر ضمیر
نیک ہیں، خوش بخت ہیں، خوشحال ہیں میجر ضمیر
شاعر و افسر بلند اقبال ہیں میجر ضمیر
اِس لیے کچھ 'فیٹ'[١] ہیں کچھ ٹال[٢] ہیں میجر ضمیر

آپ اپنے وقت کے مُلّا نصیر الدّین ہیں
شعر شکر آفریں ہیں، چُٹکلے نمکین ہیں
اِن کی رنگ آرائیوں سے محفلیں رنگین ہیں
قہقہوں کا دائمی بھونچال ہیں میجر ضمیر

١ے FAT ٢ے TALL

شعر خوانی میں ترنّم کا عجب انداز ہے
لَے میں کافی نغمگی ہے گونجتی آواز ہے
خود توانا ہیں پہ سازِ در گلو ناساز ہے
سُر ملاتے ہیں مگر بے تال ہیں میجر ضمیر

آپ کی ہر پارٹی میں ہر ڈنر میں مانگ ہے
خواہ دو سو میل ہے وہ خواہ دو فرلانگ ہے
ایک میں شامل کھڑے ہیں دوسری میں ٹانگ ہے
موٹروں میں جا بجا ارسال ہیں میجر ضمیر

آپ کے طرفہ سخن پر ہر سخن کا خاتمہ
آپ پڑھ لیں تو سمجھ لو انجمن کا خاتمہ
ان سے جو مخصوص ہے اس طرزِ فن کا خاتمہ
دل پسند اشعار کی ٹکسال ہیں میجر ضمیر

دفتروں میں صاحبانِ علم شاگردی کریں
کچھ چڑھا کر 'کیمرے میں فلم' شاگردی کریں
کچھ پکڑ کر سگرٹوں کی چلم شاگردی کریں
کتنے حلقوں کے گرو گھنٹال ہیں میجر ضمیر

مرد و زن ہیں انجمن در انجمن گھیرے ہوئے
کالجوں میں طالبانِ علم و فن گھیرے ہوئے
مدرسوں میں نونہالانِ وطن گھیرے ہوئے
مفت بٹتے لڈّوؤں کا تھال ہیں میجر ضمیر

رُخصتانے، شادیاں 'منظومتے' ہیں آپ بھی
جس جگہ ہو دھوم برپا 'دھومتے' ہیں آپ بھی
گھومتی ہے جب زمیں تو گھومتے ہیں آپ بھی
کوئی برسی ہو، وہاں ہر سال ہیں میجر ضمیر

ہر کسی سے پُر خلوص و با مروّت دوستی
ہر ادیبِ نامور سے بے ضرورت دوستی
ہر مدیر و پبلشر سے خوبصورت دوستی
دوستی میں مردِ استقلال ہیں میجر ضمیر

افسری بھی، شاعری بھی، خلق کی خدمات بھی
مشرقی عادات بھی ہیں مغربی حالات بھی
جانے کتنی الجھنیں ہیں فی الصّدور الذّات بھی
اپنے حق میں سخت مشکل پال ہیں میجر ضمیر

حاضری ناکام گھر میں پُرسشِ یاراں بہت
کار میں صبح و مسا بیگارِ بے کاراں بہت
گھر سے باہر کھینچتی ہے خدمتِ دوراں بہت
فون کھڑکے تو سمجھیے 'کال[1]' ہیں میجر ضمیر

---

[1] CALL

اور اپنی شاعری کا کوئی مطلب ہو نہ ہو
"مَن تُرا حاجی بگویم، تُو مرا مُلّا بگو"
شاعرانِ شوخ گو اب رہ گئے ہیں صرف دو
ایک میں ہوں دوسرے چونچال ہیں میجر ضمیر

واہ چھاؤنی ———— ۱۱ جولائی ۱۹۶۸

واہ رے شیخ نذیر

[پاکستان کے منفرد مزاح نگار شاعر، نذیر احمد شیخ کا منظوم تعارف، جو اُن کے مجموعۂ کلام 'حرفِ بشاشش' میں بھی شامل ہے ۔ (ض،)]

شاعر، سائنسدان، قلندر، رند، امیر، فقیر
شعر طبیعت، سائنس روٹی، رندی شغل کبیر

پیر ستارہ گیر
واہ رے شیخ نذیر

ترک و طلب کی حد سے آگے ہر اُلھڑ ارمان
ہنستا ساحل، بہتا دریا، نغموں کا طوفان

ہر نغمہ گمبھیر
واہ رے شیخ نذیر

پھرتا ہے بازاروں میں، خوش وقت سُبک رفتار
اجلے کپڑے، پیاسی آنکھیں، کالی موٹر کار

جینے کی تدبیر
واہ رے شیخ نذیر

شاعر خوش افکار مگر شہرت کی ہوس سے دور
اپنی شیرینی میں گم اک لڈّو موتی چور

خوشبو گوشہ گیر
واہ رے شیخ نذیر

فکر و فراست کی گرمی میں کرنوں کا سیلاب
ذہن و زباں کی نرمی میں پھولوں کا درخشاں خواب

تیزی میں شمشیر
واہ رے شیخ نذیر

مغرب میں جانے کس رنگ سے گزرے ماہ و سال
مشرق میں جب حضرت آئے غائب سر کے بال

حیرت کی تصویر
واہ رے شیخ نذیر

کالر، ٹائی، دھوبی، نائی سے وحشت دوچند
کرتے اور نہ بند میں خوش، خود نیچے، خودی بلند

پورے بھگت کبیر
واہ رے شیخ نذیر

دفتر میں اِک اعلیٰ افسر، قابل اور متین
یاروں میں وہ نٹ کھٹ سب کی دُم میں باندھے ٹین

گھر میں سید ھا تیر
واہ رے شیخ نذیر

مشرب آزادانہ، دل میٹھا، چہرہ نمکین
رند مگر آئینہ باطن، شیخ مگر بے دین

فیل ہے بے زنجیر
واہ رے شیخ نذیر

شام کو موٹر گشت پہ جب یہ نکلیں بے پرواہ
ساتھ کئی احباب 'بلا پٹرول بلا تنخواہ'

فطرت[۱]، گذن[۲]، ضمیر
واہ رے شیخ نذیر

——— ستمبر ۱۹۵۸ء

---

[۱] شاعرِ پوٹھوار حضرت عبدالعزیز فطرت مرحوم
[۲] ڈاکٹر غضنفر علی گذن مرحوم (راولپنڈی)

ولایتی زعفران

پس منظر

یہ ۲۴ جولائی ۱۹۷۶ء کا ذکر ہے کہ ڈاکیئے نے ایک پیکیٹ لاکر دیا۔ اُس میں سے دو کتابیں نکلیں۔ انگریزی کی منتخب فکاہیہ اور طنزیہ نظموں کے مجموعے۔

1- THE POCKET BOOK OF HUMROUS VERSE

BY DAVID MECORD

اور

2- HUMROUS VERSE

BY E.V.KNOX

مجھے اعتراف ہے کہ اس سے پیشتر انگریزی میں اس نوع کی نظمیں یک جا صورت میں میری نگاہ سے نہیں گزری تھیں۔ ورق گردانی پر ان نظموں کے موضوع، ان کی اُپج، بے تکلفی، جرأت اور اسلوبِ اظہار کی ایک انوکھی سی شگفتگی اور میٹھے مگر گہرے طنز نے دامنِ دل کو ورق ورق پر کھینچنا شروع کر دیا اور میں یہ ایک سچی وابستگی کے جذبے

ے ساتھ ان میں سے بعض منتخب نظموں کو اردو میں منتقل کرنے لگ گیا۔ "منتخب" ان معنوں میں کہ جن نظموں کے مزاج کی گدگدی یا بطن کے درد کی لطیف لہر کے لمس کو میں محسوس کر سکا۔

کسی کتاب کا مطالعہ ایک سیاحت کے مصداق ہے مجھے ان نظموں میں بوقلموں سیاحتوں کا لطف ملا آسودگی حاصل ہوئی اور آگہی بھی کچھ نظمیں ایسی ہیں جو محض خوش وقت کرتی ہیں۔ (میں ایسی نظموں کو بھی سلام کرتا ہوں) مگر بیشتر نظمیں ایسی ہیں کہ وہ بیک وقت زخمی بھی کرتی ہیں اور خوش وقت بھی۔ بعض نظمیں بظاہر بہت معمولی سی معلوم ہوئیں مگر جب غور سے ان کے اندر جھانکا تو اندازہ ہوا کہ ان کی حیثیت تو کسی ––– "قلاشِ عالم" کی سی ہے۔ پیراہن زربفت کا نہ سہی، رُوح میں تو ستارے جگمگا رہے ہیں اسی لیے تو کہنے والوں نے کہا ہے کہ دُنیا وسیلے سے مگر آسودگی فضیلت سے میسّر آتی ہے۔ اِن نظموں کے مزاج میں طنز کی کاٹ تو موجود ہے مگر نفرت کا زہر یا چڑچڑاپن مجھے کہیں محسوس نہیں ہوا۔

آخر میں اس توقع کے ساتھ کہ میری طرح قارئین بھی ان نظموں کی فضا یا مجلس میں کچھ آسودگی محسوس کریں گے میں اس ضمن میں اپنے دفاع سے ہمیشہ کے لیے دستبردار ہوتا ہوں۔ میری طرف سے بے شک ع

دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

انگریزی ادب سے ہمارا سمبندھ کوئی نیا نہیں ہے۔ انگریزی ادبیات کا اچھا خاصا سرمایہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ "آمد و رفت" کے اس عمل میں کچھ عجب نہیں کہ کوئی صاحب مجھ سے پہلے ان میں

سے بعض منظومات کو اردو میں ڈھال کر اپنے تراجم چھپوا بھی چکے ہوں مگر مجھے اس کا علم نہ ہو۔

اپنی زیرِ نظر کاوش کے بارے میں میں یہ وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کو لفظ بہ لفظ ترجمہ نہ سمجھا جائے میں نے اصل کے عکس کو اس کی رُوح کو اپنے لفظوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے میں نے "عبارت" سے زیادہ "اشارت اور ادا" سے سروکار رکھا ہے۔ میں نے اپنے آپ سے یہ ضد بھی نہیں باندھی کہ پانی سر سے ہی کیوں نہ گزر جائے، میں پوری کی پوری نظم کو سر کر کے چھوڑوں گا، اس کے برعکس جس نظم کا جتنا حصّہ میری گرفت میں آ سکا۔ یا جس کی شگفتگی کے مزاج کو اپنے ماحول میں اور زبان اور محسوسات کے مزاج سے ہم آہنگ پایا، میں نے انہیں چند لائنوں کو اپنے مقدر کا موتی سمجھ کر چن لیا۔ بعض مقامات پر، جہاں قسمت ارض و سما کھلتی ہوئی محسوس ہوئی ایسا بھی ہوا کہ میں بنیادی خیال کی روشنی میں آگے بڑھتا ہوا لطف و سرور کی ایک رَو میں، نظم کے پو کھٹے ہی سے باہر نکل گیا اور کبھی کبھی تو باگ ہاتھ سے اس طرح بھی چھوٹی کہ میں اس نظم کو اپنی نظم بھی کہہ سکتا ہوں مگر وہ میری نظم تو جب ہوتی اگر اس کے بنیادی خیال کو بھی میں نے ہی سوچا ہوتا۔ بیشتر منظومات کے عنوان بھی اپنی "گرہ" سے مہیّا کیے ہیں تاکہ مفہوم میں سلاست اور ابلاغ کا جوہر کم از کم میری مقدرت کی حد تک تو کھنکتا رہے، انگریزی نظموں کا متن ساتھ نہیں دیا گیا۔ البتہ شاعر کا نام لکھ دیا ہے تاکہ سرچشمے کی نشاندھی ہو جائے۔ مجموعی طور پر میں اپنی اس کاوش کو آزاد نظموں کا آزاد ترجمہ، بلکہ "ترجمانی" اور بعض صورتوں میں ترجمہ بمع تجاوزات کہوں گا۔ اس

کے باوجود ترجمے کے بارے میں اپنے دوست سیّد عبدالحمید عدمؔ کے ایک شعر کے بمصداق میرا احساس یہ کہ

جو دلکشی گناہ کی نیت میں ہے عدمؔ
وہ دلکشی ملی نہ کبھی ارتکاب میں

اپنے پیارے دوست (اردو زبان کے منفرد مزاح گو شاعر) نذیر احمد شیخ مرحوم کے پوتے عزیزم ارشاد احمد شیخ کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر لازم ہے کہ اس سعادت مند نوجوان نے کتاب کے اشاعتی مراحل میں اس کمال لگاؤ سے میرا ہاتھ بٹایا کہ خود مجھ کو کسی مرحلے پر اپنا ہاتھ لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ حالانکہ یہ وہ دن تھے جب گھر میں میرے کرکٹ کے کھلاڑی بیٹے، امتنان ضمیرؔ کی بلّے بازی اور میری دوڑتی بھاگتی توتلی پوتی ضمارا سیّد کی "یلغار یائی" سے میرے کاغذات کا شیرازہ کھلتے ہی پریشان ہو جاتا تھا۔

کتاب کے بیشتر اجزاء میرے "زعفران رقم" دوست جناب محرم علی مرحوم کے حریر قلم سے سیراب و نمو یافتہ ہیں، مرحوم سے ہماری رفاقت کا سلسلہ ۱۹۴۵ء میں سنگاپور میں قائم ہوا۔ وہ مولانا چراغ حسن حسرتؔ مرحوم کی سرکردگی میں شائع ہونے والے اتحادی فوجیوں کے اردو اخبار روزنامہ "جوان" کی ادارت میں ہمارے رفیقِ کار تھے۔ مرحوم فنِ کتابت میں نہ صرف اپنی خاص "کششِ کاف" ـــــ کے مالک سمجھے جاتے تھے بلکہ ایک شریف النفس انسان، ایک محبت پرور دوست اور ایک عمدہ گلوکار بھی تھے، جن کے نغمے ۱۹۴۰ء میں ریڈیو سے نشر ہوتے تھے۔ مجھے انتہائی قلق سے لکھنا پڑا کہ اس کتاب کی آخری کاپی اُن کے زیر قلم تھی کہ ۲۱ جون ۱۹۷۷ء کی شب کے ایک بجے

راولپنڈی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ آج زندہ ہوتے تو کتاب کے ضمن میں محض ان کا نام لکھ دینا کافی ہوتا۔ مگر ان کے انتقال کے بعد میری وابستگی کے احساس نے مجھے اِس مقام سے سرسری طور پر نہ گزرنے دیا۔

کتابوں کا یہ تحفہ جس کا ذکر میں نے کیا —— مجھے اُردو کے مایۂ ناز مزاح نگار (میجر جنرل) شفیق الرحمٰن نے بھیجا تھا۔ میں اپنی اس کاوش کو موصوف ہی کی نذر کرتا ہوں۔

سیّد ضمیرؔ جعفری

۱۴ر جولائی ۱۹۷۷ء

۶۹۴۔ رمنا ۴/۶

اسلام آباد۔

ہمارا گاؤں

اک چھوٹا سا گاؤں
کُل ساٹھ مکاں ہیں اور ایک دکاں ہے
ہر کھیت کے چوگرد
اشجار کا گھیرا —— چھدرا یا گھنیرا
تنہا کسی خیمہ میں ہے سیّاحوں کا ڈیرا
بستی میں جو اِک سبز کھُلا چوک ہے وسطی
دس بارہ جریبوں میں بچھی گھاس کی تختی

کھَلیان ہے سب کا
میدان ہے سب کا
اِتوار کو ہر منعم و نادار یہاں ہو
تہوار کوئی آئے تو بازار یہاں ہو

عاشق یہاں، دلدار یہاں، یار یہاں ہو
لوگوں میں بہم پیار کہ تکرار یہاں ہو
گاؤں میں جو گھوڑے ہیں، جو گائیں ہیں کہ خچّر
اُن سب کی ملاقات کی "منجدھار" یہاں ہو
چھوروں کے لیے کھیل کی اِک بارہ دری ہے
کرکٹ کے ہیں رسیا
وہ دیکھئے بلّے کو جمالی نے گھمایا
کیا گیند لپک کر قمر عالم نے اٹھایا
اور سامنے وکٹوں کے کوئی گائے کھڑی ہے!

THOMAS HOOD

مصنوعی دانت

اِک شخص لگائے رکھتا تھا
ساری مصنوعی "بتیسی"
اور ان مصنوعی دانتوں سے
ہر چیز چبائے جاتا تھا
بادام مزے سے کھاتا تھا
اخروٹ بھی توڑ دکھاتا تھا

اِک واقف کار نے جب پوچھا
"تیرا تو بڑا نقصان ہوا"
سارا جبڑا ویران ہوا"
اِک روز کہیں وہ کھو آیا
اپنی مصنوعی "بتیسی"
اِس پر اُس نے جبڑا کھولا
ہنس کر بولا
تھے وہ سب دانت کرائے کے
اِک مَرے ہوئے ہمسائے کے

(نامعلوم)

راستے کی چاپ

اس نظم کا ذائقہ مختلف ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی "نبضِ ظرافت" میرے ہاتھ نہ آسکی ہو۔ اس کا ترجمہ کرتے وقت مجھے خود تعجب ہوا کہ اس نوع کی نظم ایسے شگفتہ مجموعے میں کیونکر در آئی، مگر جب میں ایک مرتبہ اس کے اندر اتر گیا تو اس کے حزن میں زندگی کی ایک ایسی حسین صبح مسکراتی ہوئی محسوس ہوئی کہ میں نے اپنے آپ سے کہا۔۔ "میاں اب چلنے دو" (ض)

مِل گئی ایک پرانی کاپی آج مجھے الماری سے
یادوں کا دریا بہہ نکلا، میری خواب پٹاری سے
اک اِک نقش سے چھن چھن نکلی جوت پرانی یادوں کی
کچھ چہرے خوش قد لڑکوں کے، کچھ شکلیں استادوں کی

آڑی ترچھی، نرم لکیریں، دل کی سجل تصویریں ہیں
جن کو چپ چپ پوجا میں نے یہ ان کی تصویریں ہیں

کچھ صفحوں پر پنسل سے جو خاص نشان بنائے تھے
کچھ گلیوں کے نقشے تھے یہ کچھ پیڑوں کے سائے تھے

بول اُٹھے سب نُقطے شوشے یادوں کی تنہائی میں
جاگ پڑا مدّت کا سویا شہر مری تنہائی میں

رنگیں کلغی طاؤسوں کی، پتلے سینگ غزالوں
عکس ہمارے بال پنے کے رنگ برنگ خیالوں کے

دیکھ رہا ہوں چند شناسا نمبر "ٹیلیفونوں" کے
راتوں کو ہنستے تھے جن پر منصوبے "شب خُونوں" کے

تھام مجھے اے وقت کی ظالم گردش، تھم کر تھام مجھے
آج اچانک یاد آئے کیا پیارے پیارے نام مجھے

MORRIS BISHOP

آدمی گیند ہے

زمیں کے نیچے اور اُبھرے ہوئے گنبدِ زرد پر
آدمی گیند ہے

لڑھکتا ہوا ، پھسلتا ہوا ، بچکتا ہوا
نہیں جامۂ جسم اگر تیرے پاس
کوئی غم نہ کر!
قصائی کا "بِل" ہے اگر سَو پچاس
کوئی غم نہ کر!
اگر ٹوٹ جائیں ــ صراحی گلاس
کوئی غم نہ کر!
کوئی چاند چہرہ نہیں آس پاس
کوئی غم نہ کر!
چلا چل ! لڑھکتا ــ پھسلتا ہوا

دُنیا دِلچسپ ٹھکانہ ہے

جی چاہتا ہے
اِنساں سے محبت کرنے کو
بے مزد مشقت کرنے کو
ہر چہرے کو
بے خال سہی
لندن اندر چکوال سہی

گلنار کہوں گلزار کہوں

جس آدم ذات سے بات کروں

ہر جیتی بازی مات کروں

خوشیوں کا ساگر جاگ اٹھے

بجھتا ہوا چولہا روشن ہو

سوئی ہوئی گاگر جاگ اٹھے

کالے بازار کی منڈی میں

گورا سوداگر جاگ اٹھے

آواز آئے

دُنیا دلچسپ ٹھکانہ ہے

وہ سلمیٰ یہ مرجانہ ہے

اس کی آنکھیں مستانی ہیں

اُس کی زُلفیں جانانہ ہیں

رونے کے بہانے لاکھ سہی

دنیا دلچسپ ٹھکانہ ہے

دو صبحیں

اتوار کو گرجے کے اندر
اِک مہ رُخ محوِ دُعا دیکھی
ہم نے بھی اب کے جا دیکھی

جذبات سے گو بھرپور رہی
رُت، رنگت موتی چُور رہی
پر مرد کے ہاتھ سے دُور رہی

تصویرِ مقدس سرتا پا
سانسوں میں خدا — لفظوں میں خدا
تبلیغ کی کنھٹی گردن میں
لیکن نیلی — نورنگ ہمہ آہنگ، نشیلی آنکھوں کے
خوشش کرنے میں
(جوں موتی چمکے سونے میں)
اِک کافر چیز جھمکتی ہے
جو ارض و سما سے رُک نہ سکے!

رسّہ کشی

شوہر ذہنِ جدید کا مالک

بیوی وہم پرست

شادی کے دِن گزریں جیسے — نیست کے اندر ہست

KIETH PRESTON

پُرانی بگھی

حضرتِ آدم

جنّت سے جب نِکلے تھے

اِسی فٹن میں بیٹھے تھے

STRICKLAND GILLIAN

مزاح

میں اُس تبسّم
اُس ایک بے نام مسکراہٹ کو ڈھونڈتا ہوں
جو آدمی کا حصار توڑے
بغیر تیشہ
جو روحِ انساں کے سب مقفّل کواڑ کھولے
بغیر دستک
بغیر زنجیرِ در ہلائے

پتھّر لوگ

قوت والے اور زر والے
ڈالر، کالر، جھالر والے
جھنڈے، ڈنڈے، موٹر والے

اربابِ جواہر پوش ــــــ
کہ باسی ہیں خوش کنگرے محلوں کے
جن کے اندر
(الو بھی مندر)

پتّھر کے تراشے ہاتھی ہیں
کنگرو، گھونگرو، اور گھوڑے ہیں
کیا لمبے ہیں - کیا چوڑے ہیں -
کترے ریشم کے جنگلے بھی
شیشے کے منور بنگلے بھی
فانوس صدف
ہر چار طرف
ان لوگوں کے اپنے سَر بھی
ہوتے ہیں عموماً پتھر کے
مرمر ہی سہی -

پالیسی

قدیمی نوادر کے اسٹور سے
بھیڑیے کی کھال میں نے خریدی
کہ تحفے میں دوں اُس "ببر بھیڑیئے" کو
جو پنجے جما کر
مرے گھر کی دہلیز پر رُوغَر فشاں ہے

CAROLYN WELLS

ظریف

کیا تو نے کبھی چھینکتے دیکھی ہے مرے دوست!
نسوار کی ڈبیہ
جو شوخ رقم، شیوا بیاں جگ کو ہنسائے
وہ خود نہیں ہنستا!

اِنصاف

بارِش تو برستی ہے یکساں
حَق دار پہ بھی، عیّار پہ بھی
لوٹی۔ پگڑی۔ دستار پہ بھی
ٹھیلے پر، موٹر کار پہ بھی،
بھیگے ہے مگر حق دار بُہت
کھائے ہے بچارا مار بہت
کیونکہ اکثر
حَق دار کے گھر جو چھَتری تھی
عیّارنے سینہ زوری سے یا چوری
وہ اپنے سَر پر تانی ہے
مسٹر یہ رِیت پرُانی ہے

(LORD BOWN)

کاہل کسان

ایک شخص !
ایک کاہل کاشتکار
سخت غربت کا شکار
تا کمر ڈوبا ہوا
بھوک کی دلدل کے بیچ
فصل بوتا ہی نہ تھا
رُت بوائی کی جب آتی تھی تو کھا جاتا تھا بیج

(نامعلوم)

بحث

دو چیلیں جن کی چونچوں کی
ہَیئت یکساں
ہَیبت یکساں
قوّت یکساں
یکساں جن کی لمبائی ہو
یکساں چنچل چوڑائی ہو
آنکھوں میں وہی بینائی ہو
پَنجوں میں وہی گیرائی ہو
وہ دونوں چیلیں اگر کبھی
اِک چھوٹا سا کیڑا پکڑیں
اِک دُم مشرق کو لے دَوڑے، اِک سَر مغرب کو لے بھاگے
تو اُس کیڑے کو میلوں کھینچتی لے جائیں!

چالاک مسافر

مسافر کی آواز،

اجازت ہو تو آجاؤں
تمہارے باغ کے اندر
ذرا سی دیر سستا لوں
مسافر ہوں
تھکا ہارا ہُوا بھی ہوں

باغ کا مالک

چلے آؤ چلے آؤ!
مسافر شوق سے آؤ!

مسافر

اجازت ہے سخی داتا

کہ اِن لوکاٹ کے سرسبز پیڑوں سے
یہ میٹھے رس بھرے میوے
یہی دو چار دانے (خیر ہو تیری)
چمن سے توڑ کر کھا لوں
کہ بھوکا ہوں کئی دِن سے

مالک

مسافر! شوق سے کھاؤ　　کچھ اپنے ساتھ لے جاؤ

مسافر

(گرجدار آواز میں)

ارے تو کون ہے گبرُے ۔ یہاں کیا کام ہے تیرا
یہ سارا باغ ہے میرا
نِکل جا مجھ کو باغیچے کا پھاٹک بند کرنا ہے
نِکلتا ہے کہ دوں گردن پہ اِک تھپّڑ کرارا سا

OGDEN NASH

سڑک پر بادشاہ کے کتّے کا لیکچر

راہ رَو !

لو سُنو!

میں ہوں سگ — مگر میں ہوں

بادشاہ کا کُتّا

کج کلاہ کا کُتّا

میرے گرد زرنشاں سپاہیوں کا پہرا ہے

میرا گھر سُنہرا ہے

"بھیرویں" میں گاتا ہوں
"کیک" روز کھاتا ہوں
اِن سیاہ چشم بادشاہ زادکتیا سے
خوش نہاد کتیا سے
دوستی ہماری ہے
میں جنم کا رنڈوا ہوں
وہ ابھی کنواری ہے

ل

عف! عف! عف!

راہ رو سفید پوش
پوچھتا ہوں آپ سے
محترم!
جنابِ من!
کیا ہوئے! کہاں گئے؟
آپ کے دریدہ کوٹ کے بٹن؟

آپ کِس کے کُتّے ہیں
کیوں کہ شہرِ لندن میں
جو بھی آج بَستا ہے
خود کہاں وہ روتا ہے، خود کہاں وہ ہَنستا ہے
یعنی وہ بھی کُتّا ہے
میں تو خیر کُتّا ہوں
آدمی بھی آدمی کا کُتّا ہے۔

شیر

چیتا ساتھ اگر چلتا ہو

جنگل لاکھ ہو اُلجھا، اندھا، گھنا، اندھیرا

ڈر نہیں رہتا

شیر کسی کو سَر نہیں کہتا

G.K. CHESTERTON

انگریز

انگریز کا جی تو چاہتا ہے

گھُل مِل جائے

بامبے۔ رُڑکی، پشاور میں

خرطوم میں بھی پینانگ میں بھی
جوہنسبرگ - پہانگ میں ہانگ اور کانگ میں بھی
گھل مل جائے

سب خطۂ ارض کے لوگوں سے
لیکن وہ سب
بس پانی بھرنے والے ہوں
یہ صاحب ہو وہ نوکر ہوں
وہ اِس کے آگے ٹفن، ٹماٹر، آلو - انڈا دھرتے ہوں
اور — "یس سر! یس سر!" — کرتے ہوں
یہ شہر کا بڑا کلکٹر ہے
انگریز مگر پردھان اُن کا
"خاقان" اُن کا
"کپتان" اُن کا
جب وہسکی پی کر بات کرے

"تم کیسا ہے"

"تم ویسا ہے"

o

انگریز کا جی تو چاہتا ہے

گھُل مل جائے

سب خطۂ ارض کے لوگوں سے

پر اندر سے انگریز لے ہے

اپنے محدود جزیرے کا

قبریں

وہ لوگ جنہوں نے جیتے جی
انگلینڈ کی خاطر، کشٹ اٹھائے، دُکھ جھیلے
جاں پر کھیلے
اُن کی قبریں ــــ دو اک پتھّر
اُکھڑے اُکھڑے ــــ ابتر ابتر
اس مٹی کی آغوش میں ہیں
اور انگلستان کے پنکھ پکھیرو اُن پر سایہ افگن بھی
لیکن اے پیاری ارضِ وطن!
کچھ دور کے دھندلے جزیروں میں
اندھی پردیس گپھاؤں میں
میدانوں میں

دریاؤں میں، صحراؤں میں
تیری آن کی خاطر ڈٹ بھی گئے اور کٹ بھی گئے
اُن بکھے کلُھوں کی قبروں کو،
اُن جاں ہاروں کی جڑوں کو
اُن دُور دراز زمینوں میں
مدفون اپنے شہزادوں کو
خوابوں کو اور ارادوں کو
جو بیٹے تھے
جو بھائی تھے
جو شوہر تھے
جو ہیرے، موتی، گوہر تھے
ہم بھول گئے
اپنے ان ریشم جھُولوں میں
ہم بھول گئے
اُن زخموں کو — اِن پھُولوں میں

غمِ روزگار

نہ جانے کتنا اداس رہتا
میں زندگی بھر
نہ گر غمِ روزگار ہوتا

OGDEN NASH

ہفتم جنگ

خان بہادر ہفتم جنگ
پنچایئت کے موٹے ممبر از کاونٹی "ہمیر اسکنیگ"
جھلمل جھلمل جھلمل جھل
کپڑوں کے چھ سات ہیں رنگ

کھٹ پٹ، کھٹ پٹ، کھٹ پٹ، کھٹ

گھوڑا ایا نکلا — آپ دبنگ

ڈیوڑھی اندر آٹھ ملنگ

چرس اڑا ایک پی کر بھنگ

ہا ہا ہا !

بجے گٹار — من کے تار — شام بہار

سوئے جاگے مست ملنگ

اکثر دیکھے ان کے سنگ

خان بہادر ہفتم جنگ

EDMAND .C. BENTALY

تعلیم

اُستاد، اِستادہ بنچوں پر

دانش دَر کھولے لیکچر دے، حِکمت کے موتی بو جائے

شاگرد یہ موتی چن نہ سکے، ہاں گِنتے گِنتے سو جائے

DAVID MECORD.

مُرغی کا اِنعام

مرغیوں کے اِک خطیبِ خوش بیاں نے ایک مُرغی سے کہا

اے مسری سُندر سَبھا !

اے کہ تو نادر لقا !

حُسن تیرا — واہ وا

سُرمگیں تیری نظر

ریشمیں تیری ادا

کتنے پیارے تیرے پَر
جن پہ قرباں شہر کے مرغانِ نَر
ہر کوئی تجھ پر فدا ــــ واہ وا !
اے کہ تو کتنی سڈول
کچھ تو بول
کچھ تو آخر کُڑ کُڑا ـــــ !
اس پہ مرغی نے پسارے اپنے پر
سارے پَر
اپنے مرغِ خوش لقا کے سامنے
(جو کھڑا تھا اس کی دُم کو تھامنے)
کُڑ کُڑا کر ــ اک "کڑوں" کی
اور اک انڈا دیا
گول گول ــ کیا سڈول
خوش لقا ، خوش ذائقہ !
واہ وا ــ !

راجہ سعادت علی

تھا ہمارے محلّے میں اِک آدمی
نام تھا اُس کا راجہ سعادت علی
پیٹ بھرتا تھا تازہ گجک بیچ کر
دُور تک ، بیچ کر
بیچ بازار اُس کا آرا چلا

برق پارا چلا

کیا کرارا چلا

پہلے سادا ہوا، پھر وہ سیدا ہوا

اپنے یوم ولادت کو پیدا ہوا

زور سے جب وہ آرا دوبارا چلا

سا ہو کارا چلا

پھر وہ راجہ سعادت علی ہوگیا

شہر کا منعمِ منجلی ہوگیا

چہرہ

مِرا چہرہ، اے مِرے دوستو
نہ تو چاند ہے، نہ گُلاب ہے
نہ کسی حسین کا خواب ہے
مگر اے کہ تُم
مِری خَلوتوں کے حبیب ہو
مِری جلوَتوں کے قریب ہو

مری حسرتوں کے نقیب ہو
مرے ہمسفر
مری زندگی کے رفیق بھی
مری راہ بھی، مری چاہ بھی
مری دھڑکنوں کے گواہ بھی

مرے دوستو، مرے آشناؤ تمہی کہو
کہ وہ — "میں جو ہوں"
وہ مری انا — وہ مری وفا — وہ مری نوا
وہ جو میرا جوہرِ ذات ہے
کبھی تابِ رخ سے چھلک سکا؟
کسی شیشہ گر کی دکان میں
کبھی بک سکا — کوئی پا سکا؟
کوئی اس کے دام چکا سکا؟

(TWONEY EUWER)

فن کار

یہ محفل ہے فنکاروں کی
مسیحائی کے اوتاروں کی،
جذبوں کی اچھوتی شبنم میں
دھوئے ہوئے حرف نگاروں کی
ہر مقتل میں
انصاف کے پہرہ داروں کی
اور اس ایوانِ مجلّا کی
زر پیراہن دیواروں پر ؟
تصویریں ہیں
شہزادوں کی ــــ ملکاؤں کی ــــ راجاؤں کی ؟

(F. R. SCOT)

برمنگھم کی میم

برمنگھم میں تھی اک نار
بے ہنگم، پر خوش رفتار
اپنے آپ کو کہے کنواری
(جانے کتنے مردوں ماری)

آدھی جرمن، آدھی رُوسی
انگریزی میں کانا پھوسی
کرے اُدھاری
لائی ایک نئی گُرگابی — شوخ گلابی
چلی شتابی
جیسے چلے جوان چکور
بانکا مور
کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ
جوتا کاٹے کٹ کٹ پاؤں
مانے دھوپ، نہ جانے چھاؤں
جب گھر آئی — لیٹی اوڑھ کے گرم رضائی
مرہم مل مل کرے ٹکور
برمنگھم کی تیز چکور
کیوں لائی جُوتا مُنہ زور؟

(OLVER HERFORi)

حوصلہ افزائی

ایک لڑکی پاس کے گاؤں میں تھی
بولتی تھی جیسے کوئی فاختہ
شام کو ــ ہُو ہُو کرے ــ ہُو ہُو کرے
یا پپیہا صبح کی "ٹھکار" میں
کُو کرے ــ کُو کُو کرے
دوڑ کر پیڑوں پہ چڑھ جاتی تھی وہ
اپنی اِک چھوٹی بہن کو ساتھ لے جاتی تھی وہ
دُور سے تالی بجانے کے لیئے

(ر۔ نا معلوم)

کلکتے کا بابُو

کلکتے کا بابو دیکھا
نام تھا اُس کا لچھّن
کالے کالے بال
جیسے بٹ سن جال
کالا کالا متھّا
منہ میں چُونا کتھّا

[۲]"جَنّ پہاڑوں لتھّا"

باتوں میں ہچکولے

تیز تیز جب بولے

روٹی.... رے، رے...روٹی

بوٹی..... بو ... بو.... بوٹی

مکھّن .... ما .... ما..... کھّن

نام اُس کا تھا ——— لِپھّن

(ثنا معلوم)

---

[۱] بعض سفید فام اہلِ قلم کی تحریروں میں کالے لوگوں کے لیے سیاہ استہزائی دھاریاں ملتی ہیں۔

[۲] پنجابی کی ایک کہاوت۔

چوک کا اسٹور

چوک میں
وہ "سپر اسٹور" دیکھ
گُبندوں کے طور دیکھ
ممٹیوں پر مور دیکھ
یہ کمالِ صنعتِ شیشہ گری
جگمگاتی ساحری

آیئنہ در آیئنہ الماریاں

بانکیاں اور پیاریاں

اطلس وکمخواب بھی ۔ انجم و مہتاب بھی

مشرق و مغرب کی سُندر صورتیں

چاندنی کی مورتیں

نادر و نایاب بھی

پیرہن ۔ موتی ۔ زری جھُومر، حسیں پھُلکاریاں

حسرتوں کی نودمیدہ کیاریاں

فرش شیشہ بند ۔ چھت بِلّور کی

ایک تِنکا بھی گلی سے اُڑ کے آسکتا نہیں

آج کی معلوم دُنیا کی ہر اک شے ہے یہاں

اک صداقت کے سوا

کِتابیں

کتابیں ؟
جن میں گُرُ لکھے ہیں
ہَنسنے اور رونے کے
نہ ہونے اور ہونے کے
مَٹن ۔ کلیجے پکانے یا دہی مکھّن بلونے کے
کسی کو رام کرنے یا کہیں آرام کرنے کے

بھلائی سے برائی ـــــ چھانٹنے چھڑنے کی ترکیبیں
ترقی کے سنہری، آزمودہ کارگر نسخے
نظر جن میں گزر پاتی نہیں ایسے سفرنامے
تہی لفظے، غبی گامے
فقط درمے فقط دامے
میں پڑھ کر ان کتابوں کو
(فراست کے خرابوں کو)
یہ اکثر سوچتا ہوں کتنے سورج بجھ گئے ہوں گے
کتنی صبحیں مر گئی ہوں گی

(IRWIN EDMUND)

اُونچی سبز حویلی میں

(اِک میجر جنرل رہتا ہے)

گاؤں سے باہر
مٹیالی، گدرائی بھوبھل اینٹوں کے اسکول سے ہٹ کر
نیلی سی، باریک سی، اِک خوابیدہ پگ ڈنڈی کے اُوپر
ایک لکیر جو کھیتوں میں بل کھاتی ہے
اِک اُونچی سبز حویلی میں
اِک میجر جنرل رہتا ہے

وہ پہلی بڑی لڑائی میں
لفٹین ہوا، کپتان ہوا
کیا ترچھی ٹوپی رکھتا تھا، جو سیدھی دل میں جا اُترے
کیا لش لش کرتی، چار سنہرے بکلس والی بیلٹ تھی
خود اُس کے اپنے ماتھے پر بھی ماں کے پیار فروزاں تھے
برما پہنچا، جاپان گیا
اسوان گیا، میلان گیا
ترپولی، شط العمارا
ہر منظر آنکھوں کا تارا
صحرا چھانے، ساحل گھومے
موسم چکھے، چہرے چومے
اسمارا سے ایران گیا
وہ جس میدان گیا
دشمن بھی لوہا مان گیا

زخمی بھی ہوا ــــــ قیدی بھی ہوا
جنرل ہو کر ــــ آخر وہ فوج سے گھر آیا

اب کھیتی باڑی کرتا ہے

ہاتھوں میں کھرپا مالی کا
اِک خاکی "نکر" ٹانگوں پر
فصلوں کی نلائی کرتا ہے
مٹی کی کھدائی کرتا ہے
لوگوں کی بھلائی کرتا ہے
"گھڑیال ٹائر" کھاتا ہے
اور گاتا ہے!
ہپ ہپ ہرّے! ہپ ہپ ہرّے

تسکین کا دریا بہتا ہے،

اس اونچی سبز حویلی میں
اِک میجر جنرل رہتا ہے
بالوں پہ سفیدی چھٹکی ہے

کچھ پیٹ کا خط اُبھرا اُبھرا
کچھ ٹھوڑی لٹکی لٹکی سی
جینے کا مگر دستور وہی
انداز وہی ، آواز وہی ، اوقات وہی ، منشور وہی !
دو بیٹے فوج میں افسر ہیں
اِک میجر پیدل پلٹن کا
اِک کرنل کسی رسالے میں
چک لالے میں !
خط آتے ہیں ، خط جاتے ہیں
ایوں لمحے ساز بجاتے ہیں)
اِک ستھرا "شیلف" کتابوں کا

(جھرمٹ انسان کے خوابوں کا)
اور طاقوں میں تصویریں بھی
صف کے جاں ہار جیالوں کی
میدان میں مرنے والوں کی
چھوٹے سے "مویشی خانے" میں
اِک چوکس کتّا بیٹھا ہے
اِک سانڈل گائے تھان بندھی
اِک ڈبلا مُشکی گھوڑا بھی
چائے کے ساتھ پکوڑا بھی

وہ گرم پکوڑا کھاتا ہے
اور گاتا ہے
ہپ ہپ ہُرّے! ہپ ہپ ہُرّے!

اِن سادہ سے دو لفظوں میں

یادوں کی راس رچاتا ہے
خوابوں کے چاند جگاتا ہے،
خوش رہتا ہے
ہر آتے جاتے راہی سے
جو گزری ہے وہ کہتا ہے

اس اونچی سبز حویلی میں
اِک میجر جنرل رہتا ہے

(نامعلوم)

سخت جاں

ڈاکٹر کی دوا سے نہیں جو مرا

اس کو پھانسی کے پھندے، سٹین گن کی گولی سے

ڈرنا عبث ہے!

JKON GRY

بادشاہ سلامت

یہ قبر ہے ملکِ معظم کی
جو نسلاً یا زدُھم بھی تھے
شاید اس سے کچھ کم بھی تھے
راتوں کو عموماً جیتے تھے
جی بھر کر شبنم پیتے تھے

سر تاج لو اُن کا تھا وزنی
موتی جگمگ ۔ ہیرے پگ پگ
پر لفظ میں کوئی وزن نہ تھا
کچھ کارِ حماقت بھی نہ ہوا
نہ عقل کی کوئی بات کری
جب دِن آیا تو دِن بھگتا
جب رات ہوئی تو رات کری

کیبن بوائے

میں کہ اپنی بحریہ کا نامور کپتان ہوں
میں کہ موجوں کی بپھرتی جھاگ میں پالا گیا
ایک تمغۂ خاص میرے نام کا ڈھالا گیا۔
بادباں کُھلتے ہیں میرے حُکم پر
میرے "سِگنل" پر سمندر میں اُتر جاتے ہیں " لانچ "
ساحلوں پر مہوشیں رہتی ہیں میری منتظر

اجنبی دیسوں کی دوشیزاؤں سے یاری میری
پانیوں میں نغمہ خواں رہتا ہوں میں
ساگروں پر حکمراں رہتا ہوں میں
لیکن اِس منصب کے سب طبل و عَلم کے باوجود
بجھ رہا ہے میری فطرت کا سرود
ہائے وہ ایّام جب
ہائے وہ اُجلی، سُبک آسودگی
سادگی کی سرخوشی
دل، کھلے ساگر کی لہروں کی طرح لہرائے تھا
میں جب اس کشتی پہ اک چھوٹا سا "کیبن بوائے" تھا

(KiETH PRESTON)

اپنی تعریف سُن کر

اک ہفتگی میں تیرا کیا چھپ گیا مقالہ
یاروں نے دوستی میں کیا کیا اُسے اُچھالا
تقریب ہو رہی ہے، تقدیم ہو رہی ہے
سچائیوں کی حرمت دو نیم ہو رہی ہے
کیا بانس پر چڑھایا تیرے کمالِ فن کو
کامل قلم گری کو جاذب جمالِ فن کو
باور ہوا تجھے بھی
لہجہ تیرا نیا ہے۔ اسلوب بھی نرالا
ہر صنعتِ سخن میں تو اختصاص والا
تو بائرن کا بُوٹا۔ تو گورکی کا پالا
یہ فیصلہ تو پیارے مرنے کے بعد ہو گا

فیصلہ دِل کا

مختصر سی کوئی سطر
ایک جملہ، ایک لفظ
دفعتاً کردے اُداس
ڈُوب جائے، سارا منظر آس پاس
کوئی جانی دوست کہہ دے — "الوداع"
کوئی یہ لکھے کہ پیسے بھیج دو
یار سے قطعِ محبّت کا پیام
ایک جملہ، ایک لفظ

دِل میں اِک گھمبیر، نَم افسردگی پیدا کرے
زِندگی سے برہمی پیدا کرے

زندگی کے دوسرے رُخ کو بھی دیکھا چاہیئے

کوئی کہہ دے ــــ تو ہے میری زندگی
"چاندنی ــــ راگنی ــــ بانسری"
"باعث آبادئ ماپائے نشست"
"گانٹھ گٹھ نی کی ہے کتنی درست"
"سرخوشی کی موج ہے تیری نظر"
"روشنی کی اوج ہے تیرا ہنر"
"تیرے دانتوں میں نہیں کوئی خلا"
"ایک چیک ملفوف ہے دس پونڈ کا"

ایک جملہ، ایک لفظ
سَر سے پا تک، شہد کا رس گھول دے
اِک نئی اُمید کا در کھول دے

PHYLLIS MCGINLEY

یادوں کی راس

گاؤں سے باہر
گدرائی اور بھوبھل۔ پچھلی صدی کی چھوٹی اینٹوں کے
اسکول سے ہٹ کر
اِک نیلی، باریک سی، خوابیدہ پگ ڈنڈی
کے پگ اُوپر
(ایک لکیر جو کھیتوں میں بَل کھاتی ہے
(بھاگ نگر، یا جھوک سیال کو جاتی ہے)
کچھ دُور جہاں اِک "اکھرّا چشمہ" بہتا ہے
اس چشمے پر
اِک اُونچی سبز حویلی میں
اِک میجر جنرل رہتا ہے

وہ پہلی بڑی لڑائی میں
لفٹین ہوا —— کپتان ہوا
رُسمت سے رستم خان ہوا
قصبے کی اُٹھتی "کچ عمری" —— گلناروں کا دل جان ہوا
کیا ترچھی ٹوپی رکھتا تھا
جو سیدھی دل میں جا اُترے
کیا لَش لَش کرتی، چار سُنہرے بکلس والی
بیچ سے ٹھوڑی کالی — پیٹی تھی
اور چوڑے گورے ماتھے پر
خود ماں کے پیار فروزاں تھے
ممتا کے خالص سونے کے وہ چندن ہار فروزاں تھے

ماں کے قدموں کو چھُو کر وہ گھر سے نکلا
برما پہنچا — جاپان گیا
اَسوان گیا — میلان گیا
ترپولی — شط العمّارا
ہر منظر آنکھوں کو پیارا

صحرا چھانے ـــ ساحل گھومے
موسم چکھے ـــ چہرے چومے
آنکھوں نے محبّت چھلکائی
زلفوں نے جوانی لچکائی
اسمارا سے ایران گیا
وہ جس پلٹن میدان گیا
دشمن بھی لوہا مان گیا
زخمی بھی ہوا ـــــ قیدی بھی ہوا
جنرل ہوکر آخر وہ فوج سے گھر آیا
آسودہ پنشن پر آیا

اب کھیتی باڑی کرنا ہے
مٹی کی کھُدائی کرنا ہے
فصلوں کی نلائی کرنا ہے
تھانے میں، کچہری میں جاکر
لوگوں کی بھلائی کرنا ہے
ہر شخص سے مِلنا جُلنا ہے

چوپال میں آنا جانا ہے
"گھر پال ٹماٹر" کھانا ہے
اور اپنی دوندی بھینس کی گاڑھی
سوندھی سوندھی لسّی پی کر
اپنے دیس کی ماں بولی میں گاتا ہے
بلّے بلّے سجنو
بلّے بلّے سجنو

گجرات اور جھنگ کی نہروں تک
تسکین کا دریا بہتا ہے
اُس اُونچی سبز حویلی میں
اِک میجر جنرل رہتا ہے
کچھ پیٹ کا خط اُبھرا اُبھرا
کچھ ٹھوڑی لٹکی لٹکی سی
کچھ سَر کے بال بھی چھدرے سے
جینے کا مگر دستور وہی
آواز وہی، انداز وہی، اوقات وہی، منشور وہی

ہر روز گجر دم جاگتے ہیں
چائے بستر پر مانگتے ہیں
گوبھی کی باڑ پھلانگتے ہیں
اخبار کا ناغہ ناممکن
ہر چیز ٹھکانے پر دیکھو
پائپ بھی سرہانے پر دیکھو

دو بیٹے فوج میں افسر ہیں
اِک میجر پیدل پلٹن میں
اِک کرنل کسی رسالے میں
(چک لالے میں)
خط آتے ہیں، خط جاتے ہیں
(یُوں لمحے ساز بجاتے ہیں)
اِک ستھرا شیلف کتابوں کا
(جُھرمٹ انسان کے خوابوں کا)
طاقوں میں جو تقدیریں ہیں
(یہ خوابوں کی تعبیریں ہیں)

تصویریں ہیں !
صَف کے جی دار جیالوں کی
میدان میں مرنے والوں کی
جن سے لَو تیز خیالوں کی

چھوٹے سے مویشی خانے میں
دو چوکس کُتّے بیٹھے ہیں
اِک باز ہے پر پھیلائے ہُوئے
خود مار کے چڑیا کھائے ہُوئے
اِک سانولی گائے تھان بندھی
اِک دُبلا مُشکی گھوڑا بھی
چائے کے ساتھ پکوڑا بھی
وہ گرم پکوڑا کھاتا ہے
اور اپنے دیس کی ماں بولی میں گاتا ہے
بلّے بلّے سجنو
بلّے بلّے سجنو

ان سادہ سے دو لفظوں میں
یادوں کی راس رچاتا ہے
خوابوں کے چراغ جلاتا ہے
چہروں کے چاند جگاتا ہے
خوش رہتا ہے
ہر آتے جاتے راہی سے
جو گزری ہے وہ کہتا ہے
اس اُونچی سبز حویلی میں
اِک میجر جنرل رہتا ہے

☙

قبر کتبے

(۱)

(میاں بیوی کی مشترکہ قبر پر)

اس قبر کے قبّے کے نیچے
ہم موت کی نیند میں سوئے ہوئے
یعنی میں اور میری زوجہ
اُس کا منہ مغرب کی جانب، میرا منہ مشرق کی جانب
محشر کے گجر کی " دھپ سن کر
وہ مجھ سے اگر پہلے اُٹھی
میں جاگ کے پھر سو جاؤں

(نامعلوم)

(۲)

ایک جوانا مرگ احمق

آں جہانی ایک
احمق شخص تھے
یہ تو تھا معلوم مر جائیں گے آپ
لیکن اِس پھرتی کے
کیا کہنے جناب؟

(FRANCIS WIHTING MATCH)

(۳)

ایک ماہرِ تعمیرات کی قبر پر

تری تُربت پہ مٹّی کے
گراں تودوں کے گُنبد سے
یہ ظاہر ہے
کہ اب جو اس کے اندر ہے
وہ معماری کا ماہر ہے
وہ جو شے بھی بناتا تھا
بڑی بھاری بناتا تھا
نمک دانی بنانی ہو تو الماری بناتا تھا

بیوی کی قبر پر

میری بیوی
قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
وہ بھی ہے آرام سے
اور میں بھی ہوں آرام سے

(THON DRYDON)

(۲)

لارڈ کلائیو کی قبر کے لئے

کلائیو کی یہ بات آئی پسند
کہ وہ مر گیا

اندازِ دِلبری،

جِس کو عورت کرے پسند

اُس کَن راکھے اَکھیاں بند

کپڑے کِتنے بھی ہوں تنگ

جکڑا ، پکڑا ، اِک اِک اَنگ

جِتنی تنگ اُتنی خُورسَند

کَس کر باندھے چاروں بند

بے شک دو کپڑا دوچند

تنگ لبادہ بڑا پسند،

ROBERT HERRICK

روشنی کے اندھے

بہت لوگ ہوں گے
کہ جو دیکھ لیتے ہیں، دن دوپہر کو
فلک کی کسی کھوہ میں، یا گپھا میں
کوئی دھندلا دھندلا — اکیلا دکیلا
ہمکتا سا اِک ننھا مُنّا ستارہ
مگر ایسے اِنساں بہت کم ملیں گے
کہ جو دیکھ پائیں
دمکتی ہوئی کہکشاں آسماں پر
مسرت کا جو دودھیا راستہ ہے

DAVID MECORD

سخت گیر باپ

جیک اور جِل اور انڈرہِل
تینوں بچّوں نے جب مل کر
گھر میں کھڑ بڑ شور مچایا
اُچھلے کودے، چیخے، دھاڑے
الماری میں برتن توڑے، دروازوں کے پردے پھاڑے
باپ ان کو دریا پر لایا
اِک اِک کر کے پُل اُوپر سے، تینوں کو دریا میں گرایا۔
تیسرا بچّہ شاید جِل یا انڈرہِل تھا
جب دریا میں ڈوب رہا تھا
قبلہ والد ماجد بولے
بچّوں کو بس دیکھا جائے، سُنا نہ جائے!

بادلوں کا کھیل

"وہ بادل پارہ دیکھتے ہو"

"ہاں دیکھتے ہیں"

"جی دیکھتے ہیں"

"اِک اُونٹ ہے بوجھ اُٹھائے ہوئے"

"ہاں! بے شک! بے شک!

"جی بالکل! بالکل بالکل"

"اِک اونٹ ہے بوجھ اُٹھائے ہوئے"

(۲)

"یہ اونٹ نہیں، اِک گیدڑ بھورا

"ہاں! بے شک! بے شک!"

"جی! بالکل! بالکل!"

"یہ اونٹ نہیں ہے"

فی الحقیقت ہے گیدڑ۔ ماں باپ سے گیدڑ

(۳)

"گیدڑ بھی کہاں ہے؟۔ گھوڑا ہے چھریرا"

"ہاں! بے شک! بے شک!"

"جی [illegible] بالکل! بالکل!"

"گھوڑا ہے چھریرہ —— اور ساتھ بچھیرا"

(انیکسپیئر سے ماخوذ)

انگلستان بلاتا ہے

اے سیاحو!

اے گمراہو!

آؤ آؤ! انگلستان بلاتا ہے

پیرس اور نیویارک میں آخر ایسے کون گلابی چہرے

ایسی کون شرابی آنکھیں

لوگوں کو للچاتی ہیں!

ایسی کیا من موہن چیزیں ہیں جو تن پر چھائی ہیں

انگلستان کے شہروں میں بھی

ایک پرانا جادو ہے

دھیمی دھیمی، اُجڑی اُجڑی خوشبو ہے

گلیاں، کٹڑے، کوچے قریے۔

شام پڑے سو جاتے ہیں
جیسے کوئی کام نہیں
کوئی تھکتی رات نہیں ہے، کوئی چیکتی شام نہیں
نیند کے جھونکے یا پھر "انکم ٹیکس" کے کاغذ سستے ہیں
کالے کالے دفتر جن میں موٹے موٹے بستے ہیں
بجلے ہوٹل ___ خواب سرائے
رین بسیرے ___ درپن ڈیرے
نگر نگر کے رنگ مسافر
کالے گورے، سانجھ سویرے
آ سکتے ہیں، جا سکتے ہیں
لیکن "غسل" نہیں کر سکتے
گھنٹی چپ، دیواریں کالی
بہرے بہرے، بوڑھے مالی
ساقط سارے کھیل تماشے
جن میں ایکٹر سوتے وقت بھی

پنڈے پہنیں نرم شلو کے، چھوٹے کُرتے، موٹے جامے
ماہی ـــ کاہی
مرغ ماندے
آلو، قتلے ــــ سڑے بساندے
لیکن اے پیارے سیّاحو!
آؤ آؤ!
اِنگلستان بُلاتا ہے۔

(SiR A.P. HERBERT)

ہوٹل

جو تو مُلتان میری جان جائے
نہ ہوٹل "میم" میں ہرگز ٹھہرنا
نہ ہوگا پیٹ کی خاطر نوالہ
نہ کوئی شخص گھنٹی سننے والا

(TOM HUGHES)

سیدھی لکیر

اَرڈنگ بَٹرنگ

بجلی کا "بل" آتا ہے
گھر والا چلّاتا ہے
پنکھے ، لیمپ ، مشینیں ، یخ الماری ، جھاڑو ، اِستریاں
چکّی ، چولہا ـــ سب بجلی سے چلتے ہیں
بجلی کیونکر بنتی ہے
کیسے آتی جاتی ہے
مجھ کو کچھ معلوم نہیں

(۲)

ٹن ! ٹن ! ٹن ! ٹن !۔۔۔۔۔ ٹیلیفون فون !

"کال سنو !

حال سنو !

آج کے دور کا انساں اپنی آدھی عمر بتاتا ہے

ٹیلی فون ملانے میں

نخرے، دوہے، تخمی، قلمی فقروں کو دوہرانے میں

ٹیلی فون گھمانے میں

"موسم کا کچھ حال کہو"؟

"کھیلو گے فٹ بال کہو" ؟

"کیسا ہے وہ "مال" کہو"؟

"تسلی کی کچھ بات کہو" ؟

"کیسے گزری رات کہو"

"اس ساعت کی بات کرو۔۔۔"

"وہ سوئی ہے یا جاگی ہے"

"کیا کیا کیا کیا ——— کیا کیا؟

"پھر تو کہو"

"روٹھی ہے یا بھاگی ہے"

(۳)

"کیا تم اپنی نیلی ٹوپی، منٹریال سے لائے ہو"

یا چکوال سے لائے ہو"

"چاند گہن کی رات سُنا ہے، بنتو ڈھول بجاتی تھی

"لونگ" کی جوت جگاتی تھی"

"برہن کافی" گاتی تھی،

اللہ بخشے تیری بیوی "پائے" خوب پکاتی تھی

آدھے خود کھا جاتی تھی۔

ٹیلی فون پہ غیبت کرتے آدھی عمر بِتاتی تھی!

اللہ بخشے تیری بیوی!

(FOREST IZARD)

باعثِ تاخیر

صبح کہ شام
ہم بھی دیکھیں، تم بھی دیکھو
گھر گھر ہے یہ منظر عام
گھر سے نکلے جب کوئی نار
کوئی اونچے گھر کی بیگم نیلوفر
جس کی "کوٹی" گز گز بھر
جس کا چلنا بھی دشوار
جس کو کوئی کام نہ کار

چلنے کا ہنگام جب آئے

پہلے بنائے اپنی رائے ــــ جائے نہ جائے ؟

پھر وہ اپنے ہونٹ بنائے

پھر وہ اپنی ناک سجائے

خیمۂ زلف اُٹھائے ، بٹھائے

ناز سے پوچھے کر کے فون

(یہ دہلی وہ ڈیرہ دوُن)

کیسی ہے میری "شیفون"

وہی جو ہے ہلکی "میرون"

پھر کہیں اپنا پرس اُٹھائے

جب کہیں نکلے تب کہیں جائے

بادشاہ کی آمد ہوائی جہاز سے

ایک بوڑھے کسان کا چھپّر
تھا کسی شہر کے مطار کے پاس
اِک ہوائی جہاز سے اِک روز
ملک کا بادشاہ بھی اُترا
راہ چلتے مسافروں کی طرح
یا جگت سیٹھ تاجروں کی طرح
سر سے ننگا چھڑی ہلاتا ہوا
ہاتھ ہر شخص سے ملاتا ہوا
دیکھ کر بادشاہ کا یہ رنگ

سوچتا تھا کسان (دل میں دنگ)
ان کا گھوڑا کہاں گیا یارو!
اِن کی بندوق کیا ہوئی لوگو!
اور وہ جو کمر میں پٹکا تھا؟
لشکرِ رُوم ورُے ہیں جس سے کھٹکا تھا
کوئی خنجر نہ جھول داری ہے
بادشاہوں کی یہ سواری ہے؟
شاہ صاحب - بغیر تاج و کلاہ
واہ وا - واہ وا - اے واہ!
ساحلِ رودبار سے گزرا
شہر سے شہریار سے گزرا
کِسی جا پر قرار بھی نہ کیا
کوئی دربار تو کجا لگتا
راستے کے گھنے ذخیرے میں
تیتروں کا شکار بھی نہ کیا

JHON BETTEMAN

ملّاح

ملّاح کی بیوی ــــ بھاگ بھری
مُدّت سے ہے جس کی گود ہری
گھر بیٹھی کپڑے سیتی ہے
پینیانگ کا شربت پیتی ہے
ریشم کے دوپٹّے
جالی کے دوشالے ــــ (خوابوں کے حوالے)

شیفون شلوکے
(اُمید کے دھوکے)
کچھ بنتی ہے ، کچھ سیتی ہے
شب مرتی ہے ، دِن جیتی ہے

اور پتی سوامی ــ اپنی " نیول وردی" میں
مشرق کی گدلی گرمی میں
مغرب کی جمتی سردی میں
ساگر ساگر ــ ساحل ساحل
رس چوستا ہے
مرعوب ، نزول فضاؤں کا
دوشیزاؤں کا
جو رہتی ہیں
افلاس کی حبس سراؤں میں
یا ڈھونڈتی ہیں اپنے شوہر

بانجے، کٹر یل ملاحوں میں ـــــ سیاحوں میں!

بیوی ـــ گھر آنگن میں بیٹھی
ریشم کے دوپٹے بُنا کرے
اور نٹ کھٹ شوہر، دُور عجائب شہروں میں
چہروں کے موتی چُنا کرے
یہ وِرد شلوکے سنیا کرے
وہ ہر ساحل پر چاند چڑھے
ناروں کے چھلکتے جسموں سے
اک نیا سمندر پیا کرے
یہ مرا کرے، وہ جیا کرے

(WALLACE IRWIN)

دو طبیب

ایک طبیب مریض کے سر پر اگر پدھارے
وہ بیمار کو ڈوجے یا تیجے دن مارے

دو طبیب اگر مل جل کر کسی مرض کا نسخہ ڈھونڈیں
مرنے والا کل کا مرتا آج ہی سمجھو گور کنارے

JOSEPH JEKYLL

روشنی کی سحر

ذہن میں رِس بس کرتی ہے یہ ایک ترنگ جوانی کی
بن جائے یہ ساری دھرتی سیج کسی مستانی کی
گلیوں گلیوں گھومے پاگل، گھر گھر کی دربانی کی
دل میں اُترے کوئی سُندری مندری پیت نشانی کی
اِس کارن ہر کشٹ اُٹھایا، ہر مشکل قربانی کی

کون فقط آنکھوں کا سودا، کون ہے دل کا پیار میاں!
اصل حقیقت کھلتی ہے چالیس کے برس کے پار میاں!
ہشیار میاں!

کھڑ کھڑ جو من بنجارے لڑکے بالے پھرتے ہیں
بے نیلے سر مرد ڈالے چیتر نکلے پھرتے ہیں
کھبرو نوخیزوں کے رنگا رنگ رسالے پھرتے ہیں
جن مکھڑوں پر لمبے لمبے بالوں والے پھرتے ہیں

ان پر جان نہ وار کڑے "مرت جیون بازی ہار کڑے
اصل حقیقت کھلتی ہے چالیس برس کے پار کڑے
ہشیار کڑے،

W.M.D.THAKERY

پنجابی لفظ ــــــ بمعنی مانگ
پنجابی لفظ ــــــ بمعنی لڑکی

آرٹسٹ

یہ مصوّر زماں کا بِنیدہ
ہمہ مُردہ مگر ہمہ زِند
ایک بیوی بھی ہے رفیقِ حیات
(مر گئی جس میں عورت ذات)
جِتنی اب تک حیات گزری ہے
بَرسرِ کائنات گزُری ہے،
بے پَر و بال رچات گزُری ہے

ریگِ غربت کی سرد چادر میں
ایک تاریک سے کھنڈر گھر میں

○

چار جانب کھڑی ہیں تصویریں
ذہن کی نو بہار تصویریں
دل کی پروردگار تصویریں
یہ اَمر ـــــ یادگار تصویریں
فن کی یہ شاہکار تصویریں
بے شمار و قطار تصویریں
مارکیٹ میں نہیں ہے جن کی مانگ
کیونکہ سیدھی نہیں کسی کی ٹانگ
آنکھ سے مفلسی ہویدا ہے
ناک سے بھی خناق پیدا ہے
نقش ہے زندگی کا آئینہ
شہر کا سا ہو کار نابینا

○

یہ جہاں لاکھ خوبصورت ہو
آرٹسٹ کو ذرا پسند نہیں
دخل دے کر خدا کے کاموں میں
صبح رکھ دے اداس شاموں میں
اس کے نقدِ حیات کی پونجی
ہیں یہی نقش اوٹ پٹانگ
(مارکٹ میں نہیں ہے جن کی مانگ)
راہِ آسان پر نہیں چلتا
جس پہ قادر رہے وہ نہیں کرتا
اس کا دامن کبھی نہیں بھرتا
جو نہ بن پائے وہ بناتا ہے
زندگی کا دَرُوں دکھاتا ہے
اور اس "جرم" پر زمانے سے
آرزوئے بہا بھی رکھتا ہے؟

(SIR WALTER RELICH)

پکّی ڈور

ہم میاں بیوی تو تھے
مختلف دونوں کے تھے رسم و رواج
مختلف نہجِ مزاج
بندھ گیا چھلنی سے چھاج
"ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دِن
یعنی تکرار سی لڑائی ہو گئی
شام وہ ـــ شامِ جدائی ہو گئی

لیکن اگلی صبح جب میں جا رہا تھا کام پر
کھا کے نانِ خشک پر سوکھا "بٹر"[1]۔ لوٹا مٹر
بس کے اڈّے پر کھڑے دیکھا اُسے باچشمِ تر
اُڑ گیا تھا چہرۂ زیبا کا رنگ

میرے دل میں بھی رمک اٹھی رفاقت کی اُمنگ
مَیں نے لوٹی ہاتھ میں لے کر کہا۔ "گڈ مارننگ
جَل کے بولی — چل یہاں سے دُور ہو
دُور ہو — مقہور ہو

لیکن اک لحظہ کے بعد
میرے پہلو میں لپک کر جھم جھماتی آ گئی
"پرس" پر طبلہ بجاتی آ گئی
میری صبحِ تابدار
مجھ سے جو بچھڑی تھی کل شب — جگمگاتی آ گئی
دیکھ لی تھی اُس نے بھی میری نگاہوں میں نمی

[1] BUTTER

اِنسان اور بندر

اس قبر کے اندر سوتا ہے جو بندہ — پہلے بندر تھا

○

صد ہا صدیوں کی بات ہے یہ
صد ہا صدیاں جب بیت چکیں
قُدرت نے جب دیکھا پرچہ
بندر کی کارگزاری کا
تو حُکم دیا — قُدرت نے "بندر ماری" کا
تب بندر سے اِنسان بنا،
تب یہ بندر کے اندر تھا
اب بندر اِس کے اندر ہے

(انگریزی سے ماخوذ)

لیڈی رِشی کی عمر

رشی کی عمر؟
تیرا بھلا ہے کیا خیال؟
نہیں جواب کچھ محال

لباس بہترین ہو جب، جُراب ریشمیں ہو جب
گلے میں پھول ہار ہو، کلائی دل بہار ہو
نظر شراب سے سرخ گال
رشی کی عمر بیس سال

اگر نہ ہو رشی کے پاس
زری جواہری لباس
شرابِ ناب کا گلاس
قریب قدر داں کوئی

دَھنی نہ ہو
وہ خود بھی ٹھَنی نہ ہو
رشی کی عمر کیا خیال ؟
تین کم پچاس سال

(METHEW PRIOR)

جنرل منٹگمری کے نام

[فیلڈ مارشل منٹگمری دوسری عالمگیر جنگ میں
برطانیہ کے کامیاب ترین سپہ سالار
مانے گئے تھے __________ ض]

ہم نے بھیجا ہے اِک تحفہ
ایک قمیض اور اِک پاجامہ
سسلی ہو یا روم، سلرنو

اِٹّی، پٹّی، پھر بھی اس کی دُلدُل کافر
کچّی خندق، پکّا "بنکر"
آپ جہاں ہوں ___ باہر اندر
جنرل صاحب کام آئے گا
یہ کُرتا اور یہ پاجامہ
یکم مئی تا یکم دسمبر

H.F.ELLIS

پادری صاحب کا گھوڑا

ایک بوڑھا پادری
جا رہا تھا اپنے گھوڑے پر سوار
راستے میں ایک بستی کے قریب
اِک کسانِ سادہ ان سے پوچھ بیٹھا اِک سوال
پادری صاحب نے فوراً روک لی گھوڑے کی باگ

اور اُتر کر ایک نیلے کھیت میں
ایک بلبلی عالمانہ بحث کی اس مسئلے کے بیچ میں
آخری جملہ تھا سن اے نیک مرد
"ماس بھی ہوتا ہے گھاس"
یہ سنا تو چلبلے گھوڑے نے گردن موڑ کر
کاٹ کھائی پادری صاحب کی ٹانگ

(نامعلوم)

نوحہ

(ایک خود غرض سیاستدان کی موت پر)

گھر کے دالان میں لاش رکھی ہوئی ہے
لاش لپٹی ہوئی ہے
بڑی قیمتی، ریشمی چادروں میں
اچانک ہی کل

ایک کیلے کے چھلکے سے پھسلا

گرا اور گِر کر نہ اُٹھا

زن و مرد کا اِک ہجوم فراواں

کھڑا ہے سرہانے

مگر اس ہجوم فراواں میں بس ایک میں ہوں فسردہ

فقط ایک مَیں رو رہا ہوں

کہ یہ شخص پھانسی کے پھندے سے کیوں بچ گیا ہے

HILAIRE BELLOC

عجائب گھر میں

(ایک انسانی ڈھانچے سے خطاب)

اے بزرگِ محترم!
بات دُکھ والی ہے، لیکن کتنی سچّی بات ہے،
(چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے)
میں کہ ہوں زندہ، مگر

"میں بھی" ـــــ اے بابائے ابنائے بشر
اپنے اندر سے ہوں دیمک زدہ ـــــ کھوکھلا
بخت اگر یاور ہوا تو ایک دن تیری طرح
میں بھی تاریخی تو ادر میں کھڑا ہو جاؤں گا

اے بزرگِ محترم !
بابائے ابنائے بشر !

(RICHARD)

سردار

سر دار ہمارا
جب دھوپ میں بیٹھا
کہنے لگا ——— "گرمی"
جب سائے میں لیٹا
کہنے لگا ——— "سردی"
گرمی پہ بھی ——— "اُف اُف"
سردی پہ بھی ——— "تُف تُف"
سرتاج ہمارا
مہراج ہمارا
سردار ہمارا
آزار ہمارا

پائلٹ کا پیام

(ہوائی جہاز سے اپنی محبوبہ کے نام)

مری جان سلمٰے!
سنوار اپنا جلوہ
پکا میرا حلوہ
کہ میں آسمانوں کی پہنائیوں سے
"قلا کھائیوں" — بادلوں کی لگاتار پرچھائیوں سے
ہواؤں کی بے ہودہ پژ واکیوں سے

اُڑا آ رہا ہوں

تیرے آستانِ محبت کی جانب
زمیں پر قدم رینگتے رکھ کے آؤں
مسافت ــــ فُٹوں اور انچوں میں ناپوں

مری بے کلی کو گوارا نہیں ہے
مجھے سست گامی کا یارا نہیں ہے

سنوار اپنا جلوہ
پکا میرا حلوہ

سَحرخیزی

صُبح کو جب بے کل، پاگل چینچل چڑیوں نے

شور مچایا

چوں چوں چوں!

ہمیں بھی عقل کے جھمالوں نے آن جگایا

چادر چھوڑو!

جاگو! جاگو!

○

بستہ ڈھونڈ ھو!

اب اسکول کا رستہ پکڑو
بابو ــــ دفتر کو بھاگے ہیں
فوجی تو کب کے جاگے ہیں،

○

سارا دن ــــ "چوں چوں" میں گزرا
آدھی رات کو جا کر ہم نے خود کو محوِ خواب کیا
اس دنیا میں سب سے پہلے جس نے سحر بیداری سوچی
جو بھی تھا وہ
جو کچھ بھی تھا
اُس ظالم نے ہم کو سخت خراب کیا

دوزخ

آدمی جو شراب پیتے ہیں
سَو[1] برس تک بھی مست جیتے ہیں
بُزِ بُزدل جو آب پیتی ہے
شاذ ہی بیس[2] سال جیتی ہے

(نامعلوم)

احمق ترین پاگل

حمد خدا کی جس نے بنایا
" انگلش مین" سا پاگل الناس
نوعِ بشر میں
سب سے زیادہ احمق پاگل

RUDYARD KIPLING

سینما ہال میں

چل رہی تھی فلم — ہم بیٹھے تھے "سینما ہال" میں
چار سُو اِک گھُپ اندھیرے کی شبِ سیاؔں میں
————— ناگہاں!
میرا گھٹنا، داہنی جانب برابر ایک گھٹنے سے لگا
آج تک
شاعروں نے ایسا "سانیٹ"، کب لکھا!

جس میں ہو عنوانِ محبوبی سے "گھٹنوں" کی ثنا

میں کہاں سے لاؤں ایسی "پھول پتّوں کی زباں"
کر سکوں جس سے بیاں
وہ حرارت، وہ چمک، وہ سحر، وہ چنگاریاں
جو تھیں اس نادیدنی پیکر کے "گھٹنوں" میں نہاں
گھپ اندھیرے کی شبِ سیّال میں
چل رہی تھی فلم - ہم بیٹھے تھے "سینما ہال" میں

SIR. A.P. HERBERT

مَرد کا دِل، عورت کی زباں

جب اجل آتی ہے اور مَرتا ہے مرد
زندگی کی آخری ساعت تلک دھڑکے گا دِل
ہر نفس کے مُتّصل
جب کوئیَ خاتون طے کرنے لگے کارِ جہاں
آخری ساعت تلک چلتی رہے اُسکی زباں

بس ڈرائیور کا مسئلہ

مَیں جِس سے محبت کرتا ہُوں
وہ نارِ غضب کی تیزمیاں
گُفتار میں قینچی کی لَپ شَپ
رَفتار میں اِک آندھی چکرّ
جب وصل کا وعدہ کرتی ہے

(تیزی "اَس" کی فطرت ٹھہری)
اِک شَب پہ پہلے آجاتی ہے
اور شب بھی وہ شب ،
جب پہ چکّر میں ہو "روٹ" مرا
اُترا ہوا کالر سَوٹ مرا
ٹوٹا ہوا "بوڑھا" "بوٹ" مرا
جب بس ہو دُور منتوڑے تے سے
پھٹ جاتے ٹا سَر روڑے سے

سوانعمری

کوٹ سَن اکیسؔ کا، پتلون سَن بائیسؔ کی
ہیٹ اک میلہ چکٹ ڈھنڈھار، ماضی کا کھنڈر
"بوٹ بھی ہیں بھا بڑا بازار سے آئے ہوئے
ہیں مگر پالش کا دگڑا دے کے چمکائے ہوئے
میں کہ رہتا ہوں منافق شہر میں، نامنصفی کی لہر میں
زندگی گزری ہے اس انداز سے
جسم اور بنیان میلے تھے، مگر کالر سفید

(DORTHY PARKER)

اِنتقام

حضرتِ آدم کو حوّا نے
خُلدِ بَریں سے نکلوایا تھا
دانۂ گندم کِھلوایا تھا
جب بھی یاد آیا یہ قِصّہ
اپنی زوجہ سے ہم بولے
(بول کو بے سمجھے، بے تولے)
یاد ہے تُجھ کو بھی وہ قِصّہ
لے تو بھی اب اپنا حصّہ

اپنا قرض اُتارا ہم نے
بیوی کو دے مارا ہم نے

(A.E NUSMAN)

ٹیلر کا عشق

ٹیلر اور اس کی رفیقِ زندگی
(روح کی تابندگی)

گاؤں کے سادہ سے خوش پنگھٹ کی نار
جسم پر شرم و حیا کا ایک رنگیلا حصار
نام میری تھا، پہ مریانہ بھی کہتے تھے جسے

ایک شہرِ خورد وساماں برُ دیس رہتے تھے وہ
زندگی کو دو دلوں کی چاندنی کہتے تھے وہ
صبح کو جاتا تھا ٹیلر ماسٹر جب کام پر
اپنا فیتہ تھام کر
چوُم کر جاتا تھا، مریا کے لب و رخسار کو
وقت تھم کر دیکھتا تھا ان کے اُجلے پیار کو

کیا خبر ان کو کہ پیرس کی حسینانِ جواں
عہدِ نَو کی بجلیاں

بیچتی ہیں اپنے جسم
سینچتی ہیں اپنی جاں
خوش رویانِ سربلند
جن کے دروازوں پہ دیناروں کے توڑوں کو لیئے
منتظر رہتے ہیں، شیخانِ سباء تا تاشقند

ان کو کیا معلوم ان کے جِسم پر
اب کہاں تک کھُل گئے ہیں ان کے "اِسکرٹوں" کے بنَد

ō

ٹیلر اک چھوٹا سا ٹیلر ماسٹر
جو فقط سِیتا ہے چھ آنے میں بچوں کے فراک
مار دیا ، اک گاؤں کے سادہ سے خوش پنگھٹ کی نار

نُقطۂ نگاہ

اللہ بچائے !
اُس نثرِ غبی سے
جس میں نہ ہو منطق
اِس نظمِ تہی سے
جس میں نہ حلاوت ہو، نہ تاثیر، نہ سنگیت

J. K STEPHEN

سیّاح خاتون

آئی ہے کسی ولایت سے
اک بھونڈی بھدّی، موٹی ناری گول مٹول
جرمن ڈھول
دیکھ رہی ہے اجنبی شہر کی
اِک اِک چیز کو دیدے پھاڑے
نظریں گاڑے

حیراں حیراں لوگوں کی عُریانی پر
چوک، چمن میں چھلکے چھلکے اندھے جوشِ جوانی پر
اس کے گرد بھی اجنبی شہر کے لوگوں کا
اک حلقہ تھا
وہ بھی خاصا چھلکا تھا۔
ان کی نظر میں حیرت تھی
ان سڑکوں پر،
اتنی بھاری مُوسل ٹانگیں
لوگوں نے کب دیکھی تھیں

(P.R. SCOTT)

تلافی

اتوار کے دن توبہ کرلی
نادم بھی ہوئے
سچّے دل سے
ہفتے بھر کی ہر لغزش پر
ہر سہو پہ ہر نادانی پر

○

لغزش جو ہوئی تھی کل سرزد
پھر کل ہو گی
بالکل ہو گی
ہاں کل ہو گی ــــ پرسوں ہو گی
پیاروں کے کتابی چہروں پر یاروں کی نظر کب رکتی ہے
اس باغی سرکش سورج کی مسرور سحر کب رکتی ہے،

خود کلامی

میں خود سے کہہ رہا ہوں اور کب سے کہہ رہا ہوں
اے شخصِ سر نہادہ
ہے کیا ترا ارادہ
اس شہر سے نکل چل!
شائد کہ حل ہی جائے

اک صبحِ خوش دَمیدہ
اک سروِ سرکِشیدہ
اک شامِ خوش لِبادہ
اک آفتابِ تازہ
اک نجمِ برق زادہ

اِک لمَحہ، بے سلاسل

اِک موجِ پاکشادہ
نیلے سمندروں میں
میں خود سے کہہ رہا ہوں، اور کب سے کہہ رہا ہوں
اے شخصِ سر نہادہ
اِس شہر سے نکل چل

(EDMOND LEAR)

پلوتڑوں کے رئیس

راؤ صاحب رئیس زادے ہیں،
ان کے محکوم پا پیادے ہیں
پیر حاکم۔ جوان حاکم ہے،
ان کا سب خاندان حاکم ہے
ان کے جوتے کھرب سے آتے ہیں
ان کے گھوڑے عرب سے آتے ہیں

دُور تک باغ و راغ ان کے ہیں
شہر میں سب چراغ اِن کے ہیں
کھیت میں شاذ شاذ آتے ہیں
لوگ بوتے ہیں آپ کھاتے ہیں
بات جب بھی کریں پہیلی میں
بندر ہتے ہیں اک حویلی میں
جس کے اندر ہوَا نہیں آتی
جس کے باہر صدا نہیں آتی

(J.C.)

پاگل کُتّا اور انگریز

پاگل کُتّا اور انگریز
گھومیں گرم دوپہروں میں
بپھری جیون لہروں میں
ویرانوں میں، شہروں میں
جن خطّوں، ڈھوکوں ڈھاروں، قصبوں، پاڑوں میں
اور شہروں میں

موسم ہیں مرطوب بہت
اَبر فزا داں، دُھوپ بہت
اُن خِطّوں، مُلکوں، نگروں کی اُمسی گرم دوپہروں میں
نیند لگے مرغوب بہت

گھر سے باہر کم کم نکلیں
چینی بھی جاپانی بھی
کالے ہندوستانی بھی
برمی اور ملائی بھی
تھائی بھی
ہانگ کانگ کے باسی، ارجن ٹینی اور اسپینی بھی
دُھوپ پسینے گرمی سے کترائیں لوگ
گھر آکر بنیان پہن، سارونگ اُڑس کر لمبے پڑ پڑ جائیں لوگ
جی بھر کر سستائیں لوگ

لیکن اس مرطوب ہوا

اِس چُبھتی دھوپ ، اِن خواب آور ہلکوروں میں

چھلکے نیند کٹوروں میں

پاگل کُتّے اور انگریز

گھومیں گرم دوپہروں میں

ویرانوں اور شہروں میں

سڑک بند ہے

بورڈ لگا ہے اے رہرو
رستہ ہے دشوار گزار
آدم ذات تو آدم ذات
آدم کی کیا کیجیے بات
گیدڑ بھی دیکھا لاچار
رستہ ہے دشوار گزار

لوہے کی فتح

جس مکاں میں وکیل رہتا تھا
اب وہاں اک لوہار رہتا ہے
موت تانبے کی فتح لوہے کی

محبّت

محبّت!

جو ملتی ہے ذہنِ بشر میں

دلوں کی سحر میں

بڑی دِلبُربا ہے، بڑی دیرپا ہے

بڑھے اس سے انسان کا مرتبہ بھی

چلے جس سے اولاد کا سلسلہ بھی

مگر یہ

مرے شوق کے جذبۂ جسم جُو کی

نگاہوں کی فرمائشِ رنگ و بُو کی

انیسِ دل و جان ہوتی نہیں یہ

کرتا رقصِ آخر

میرے تن لہو میں

ارادوں کے شعلے پروتی نہیں یہ

درست نادرست

کچھ دانا، کچھ پنڈت لوگ
اکثر کہتے رہتے ہیں
اس رُت میں
جو کچھ بھی ہم دیکھ رہے ہیں
دُور اور پاس — سب بکواس
البتہ وہ ساری چیزیں — وہ سب باتیں
جو ابھی انساں کر نہیں پایا
سب ہیں روا
سب ہیں درست
ہائے وہ چیزیں — ہائے وہ باتیں!

سطرِ امروز

مختصر سی کوئی سطر
ایک جملہ، ایک لفظ
دفعتاً کر دے اداس
کوئی جانی دوست کہہ دے "الوداع"
کوئی یہ لکھے ــــــ "رقم کچھ بھیجئے"

مری موت پر

مری موت پر!
یہ کہیں گے لوگ ــــ بطورِ شخص
یہ شخص حُسن پرست تھا
کٹی عُمر اس کی گناہ میں
شب و روز کارِ سیاہ
مگر اس کی جو بھی کتاب تھی
وہ ہر ایک گھر میں پڑھی گئی

سڑک کا گیت

خوبصورت بورڈ پر لکھے ہوئے یہ اشتہار
خوبصورت لفظ، خوش خط، خوش کنار
آرٹ کے نقش و نگار
"بورڈوں" کے خال و خد
اِن کے قد، اِن کے قرینے، ناک نقشے، طول عرض
مجھ کو حسرت ہے کہ میں پھر دیکھ لوں
اپنے پہلو میں درختوں کی قطار

اُستاد شاگرد

آداب ہے استاد جی !

کیسے بجاتے بانسُری

شاگرِد کو سِکھلائیے

لیکن ذرا فرمائیے

خود سُر بجانا سہل ہے ؟

یا ہم سے ناکندہ تراشوں کو سکھانا سہل ہے ؟

ہاں ! بانسُری تو لائیے !

اُستاد جی !

اُفق

زندگی کی منزلِ پیری میں یہ محسوس ہوتا ہے مجھے
بڑھ گئی ہے عمر لیکن گھٹ گیا ہے اعتماد
تھم گئی بادِ مُراد
جتنی عقل آتی رہی اتنی خوشی جاتی رہی
زندگی کے رنگ دھارے سو گئے
شہر کے دونوں کنارے سو گئے
جو خوشی تھی میری ساعت آشنا
وہ خوشی جاتی رہی
چاند ٹھوکر میں ہے لیکن چاندنی جاتی رہی

ووٹ

لوٹری ہو یا کوئی اَور
بے شک لاکھ لگائیں زور
بے شک روز مچائیں شور
میں تو جب ڈالوں گا ووٹ
پہلے دیکھوں گا منشور
امن کی خوشبو کتنی پاس
جنگ کا شعلہ کتنا دور

سُخن فہمی

آڈن[1] کی شاعری
صدیوں کی چاندنی ـــــ ذہنوں کی روشنی
اِنسان کے نام رُفق رفاقت کا اِک پیام
.....
ہر بات سوم رَس
وہ رَمز ہے کہ بَس
ہر شعر شہد رَس

لیکن جنابِ من !

اک عام آدمی تو جو بیچتا ہے روٹی

جو باندھتا ہے دھوتی

جو ہانکتا ہے "کھوتی"[۲]

مہمل یہ سب کلام

مبہم ہے "شین قاف" ۔ مشکل ہے "میم لام"

---

[۱] آڈن ۔ انگریزی زبان کا ایک ممتاز مگر مشکل گو شاعر

[۲] پنجابی لفظ ۔ گدھی

عوام و خواص

عجلت و اضطراب و جوش و خروش
یہ تو شیوہ ہے عام لوگوں کا
چہرے زرد، ان کے جسم سرد ان کے
کارخانوں میں کام کرتے ہیں
آپ کو وہ سلام کرتے ہیں

○

آپ ہیں خواجگانِ خاصِ زمیں

آپ کے کان ___ "موتیوں کی کان"

آپ کی ناک زندگی کا نشان

آپ کی آنکھ روشنی کا مکان

آپ گھر میں بخدمت بیٹھے ہوئے

اپنی عینک کو صاف کرتے رہو

کرسیوں کا طواف کرتے رہو

(نامعلوم)

محنت اور فرصت

محنت، خوشبودار پسینہ
فرصت، قرض کا اُلٹا زینہ
محنت، گندم دھان اُگائے
فرصت، بھوک اور فاقہ لائے
محنت، اِک پیہم خوش حالی
فرصت کرے خزانے والی

محنت !

شام کے آٹھ بجے گھر بستر لینا

چین سے سونا

فرصت !

اپنی اکثر راتیں جاگ جاگ بسر کر دینا

صحت کھونا

محنت !

جتنی بڑھتی جائے، اتنی برکت، عظمت لائے

فرصت !

جتنے پر پھیلائے، اندر سے انسان اتنا ہی گھٹتا جائے

لیکن جس سے پوچھو پیارے

یہی پکارے۔ فرصت ! فرصت !! فرصت !!

خودنگر رئیس

اِک رئیسِ خودنگر کو دی خبر اِک شخص نے
آپ کا نوکر کمیٹی گھر کی لاری کے تلے کچلا گیا
دوپہر کو شارعِ فردوس پر
حادثہ کچھ اس دھماکے سے ہُوا کہ اُس کا جسم
کٹ کے دو ٹکڑوں میں اِک شیشم کی جڑ پر جا گرا

سُن کے یہ خونی خبر — بولا رئیسِ خود نگر

اے میرے اچّھے نامہ بر!

مجھ کو وہ ٹکڑا اٹھا لا دے

اس کے مسکے اور پگھلے جسم کا

اے میاں!

جس میں تھیں میرے "کچن" کی چابیاں!

SPTAN BARRY GRHAM

گھوڑا اور لگام

(جنوبی افریقہ کے ناول نگاروں سے)

ٹھیک ہے
ضبط اچھی چیز ہے
لیکن اتنی بھی نہ کھینچ جائے لگام
جس پہ اک دن ناگہاں
صبح کو معلوم ہو
آپ کا گھوڑا گزشتہ شب
اچانک مر گیا

ROY CAMPBELL

ایک پہیلی

اُس نے اپنے آپ کو
اُس نے اپنے بیٹے کو
اُس نے اپنی بیوی کو
اُس نے اپنے کُتّے کو
زندگی کے راز سمجھائے بہت

نکتہ ہائے نازک و باریک بتلائے بہت
اَبْ بتاؤ تم کہ اِس عقل و خِرد کے باب کو
زِندگی بھر اپنے روز و شب میں چمکائے گا کون ؟
ڈھال کر سُر تال میں، گائے گا کون ؟
ہر قدم پر یاد کرتا، بھول جائے گا کون ؟
اور ہاں جھنجھلا کے ٹھکرائے گا کون ؟

RALPH HODGSON

گرمی کا موسم

کاہلی میں شور بور

کام چور

سر گراں وحشت کا زور

ذہن میں چھا جوں پسینہ ہے رواں

بعض وقت

مجھ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں

ٹوٹ جاؤں گا کرن کے بوجھ سے

DON MARQUIS

شہر کولوُن

میں فنَ کار
گلے میں ڈالے
سات سروں کا تاشہ باجَا
گلی گلی سے گاتا گزُروں
شہر میں دیکھے دو ہی ٹھکانے
جن میں دِل کچھ اٹکا ، بھٹکا
اِک گرجا ہے ، اِک مے خانہ !!

SAMUEL THYLOR COLIRRIDGE

اپنی آواز

کیٹسؔ کا لہجہ نشیلا بھی — رسیلا بھی بہت
آنچلوں کا رنگ نیلا بھی بہت
دھڑکنوں کا لمس گیلا بھی بہت
اور — شیلےؔ کا بھی ہے اسلوب خوب
زندگی کی نرم دوج

لیکن اے طبع رسا
تجھ کو جو کہنا ہے اپنے خاص ـــ
احساسِ زیاں کے واسطے
اپنے دل کے رابطے سے، اپنی جاں کے واسطے
لفظ اپنی سانس کی خوشبو سے بُن
اپنے موتی آپ چُن
خاص اپنے ساز کی آواز لا
طبعِ رسا

لے انگریزی زبان کے ممتاز شعراء

پیَسہ

مزدور کماتا ہے پیَسہ
مخمور لٹاتا ہے پیَسہ
بنکار بیاج پہ دے اس کو
ڈاکو لوٹیں اور ٹھگ ٹھونگیں
مُنعم دولت ایزاد کرے
دَھندے پھَندے اِیجاد کرے

آئے جب ہاتھ جواری کے

وہ بھک سے اُڑاتا ہے پیسہ
کنجوس بچاتا ہے پیسہ
اور وارث کھاتا ہے پیسہ

تاجر اس کے صندوق بھریں
اور ناریں اس کو خرچ کریں

کم لوگ جہاں میں ہیں صاحب!!
جو پیسہ استعمال کریں

RICHARD ARMOUR

تلاش

چچی فرحت کنوئیں میں گر گئی ہیں
جہاں پہلے گئی تھیں، پھر گئی ہیں
کنواں یہ خود ہی کھدوایا تھا گھر میں
لگی ہے چوٹ مہلک اب کے سر میں
چناں چہ ــــ مر گئی ہیں
خدا بخشے بہت لاغر بدن تھیں
ارے لڑکو ذرا چھلنی تو لانا

(HAAR GRAHAM)

چیمپئن

وہ ہے شہر چیمپئن !

جانِ من !

اُس کو جانئے جوان

اُس کی مانئے اُٹھان

رُعب داب۔ آن بان

جس کو شہر کا قصاب

بوٹی گول دے !

پُورا تول دے !

تَشکّر

ہم فسادی چڑ چڑے لوگوں کے سَر پر دُھوپ میں
اِتنا پیارا ـــــ اِس قدر رنگین ابرِ نوجواں
ـــــــ سایہ کُناں !

اے خدُائے مہرباں !
تیرا کرم ، تیری عطا !
میرے خدُا ، سب کے خدُا !
اس چلچلاتی دھوپ میں !
یہ سایۂ ابرِ جواں !

(E. E. WHITE)

دستورِ جہاں

کچھ لوگ ایسے بھی مِلے
جو دل کے مندر توڑ دیں
یاروں کے رستے چھوڑ دیں

کچھ لوگ ایسے بھی مِلے

جو دِل سے دِل داری کریں
دکھیوں کی غم خواری کریں

لمحات پر، جذبات پر
اِک سَر خوشی طاری کریں

کچھ لوگ ایسے بھی مِلے
میری طرف جب ہو گزر
دیکھیں نہ مجھ کو دیکھ کر

وہ بھی بشر — یہ بھی بشر
لیکن تفاوت کِس قدر؟

کِتنا کھرا، کِتنا کھرا —
دستورِ بازارِ جہاں!

DOROTR PARKER

زاویے

اِک شخص کنواں کھودے
اِک شخص مشینوں سے دیکھے ہے ستاروں کو
آکاش نگاروں کو

اِس کی نظریں نیچی
اُس کی نظریں اُونچی
دونوں کی ریاضت کا مقصود صداقت
یہ گوہرِ تابندہ کس شخص کے ہاتھ آیا؟

ناخلف اولاد

بارش میں کل دادا جان
گھر سے نکلے پہن کے نکّر اور بنیان
پھسلے مینہ کے جھالے میں
گر گئے گندے نالے میں
سارے شہر کا ہے نقصان
ہو گیا کم اک ۔۔۔ "دادا جان"

HARRY GRAHAM

وارنٹ افسر جیکسن

لو دھاڑا، سر پھرا، وارنٹ افسر جیکسن
"فورلے فورم" ــ "فور فورم" ــ ایک دم
یعنی ہر صف چار چار!
پھر دھاڑا ــ "طاق نمبر" اپنے قدموں پر،
ــــ وہیں ساکت رہیں
ایک دم!

(”طاق نمبر“ میری قسمت میں کبھی آتا نہیں)
پھر دَھاڑا — ”جُفت نمبر“ — اِک قدم پیچھے ہٹیں
اِک قَدَم — ایک دَم!
پھر وہ کڑکا — میرے ”کالم“ کی طرف مُنہ کھول کر
دل میں سب ’لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ بول کر
اپنی رفلیں تول کر
اب چلو! آگے بڑھو!!
یک قَدَم ایک دَم
دَھم دَھماں دَھم، دھم دَھماں دھم، دھم دھماں
اپنی محکم چال پر، بینڈ کی سُرتال پر
ایک! دو!! ہاں چلو! ہاں ہاں چلو!!
سب سے آگے کارپول، ”ڈبلیو-ایس-رین بو“[۲]

جیکسن، وارنٹ افسر ہے پُرانی چال کا
تیسرے ایڈورڈ کی ٹکسال کا

لو سُنو ! اوّلاً بایاں قدم ثانیاً دایاں قدم"

" دائیں اور بائیں کا پورا ناپ ہو"

" چھاؤنی سے چار چھ فرسنگ باہر چاپ ہو"

لیجئے کالم چلا

ٹامؔ کا پہلا قدم دایاں قدم

اُس کے ساتھ ! میرا ہاتھ !!

FRANK SIDWICK

لذیذ ترین لُقمہ

وہ لقمہ سب سے بہتر ہے

کہ جس کو آدمی خود اپنی محنت سے کماتا ہے

وہ لُقمہ زندگی کی نعمتوں میں سب سے افضل ہے

کہ جس کو آدمی

بے ساختہ رغبت سے کھاتا ہے

(عربی سے ماخوذ)

دو شاعر

اتفاقاً ایک شاعر سے مری
آشنائی ہوگئی
مَیں کہ تھا نا واقفِ اسرارِ فنِ شاعری
ناشناسائے رموزِ نغمگی
قافیہ کیا چیز ہے، کیا ہے ردیف
کون سا شوشہ کثیف اور کون سا نکتہ لطیف

کس بلا کا نام ابلاغِ عام

جب ہوئی اس شاعرِ غرّا سے ملنے کی سبیل

پھوٹ نکلی شاعری کی رودِ نیل

گوش برآواز میں تھا وہ صحیفہ در بغل

نغمگی کا اک محل

گیت، ملرک، نظم، قطعات و غزل

شیشۂ اشعار میں

ناخنِ فن کی حنا بندی دکھائے

لفظ کے پاتال میں

"سوزِ دردِ آرزومندی" دکھائے

مغزِ معنی کا تھا یا اظہار کا اُسلوب تھا

خوب تھا

میں بہت مرعوب تھا

ایک دن

مُلک کے اِک دوسرے شاعر کے سَاتھ
دونوں شاعر شہر کے چھوٹے سے ریستوران میں
چائے کے سامان پر، دونوں کی یک جائی ہوئی
نطق آرائی ہوئی

سُن رہا تھا میں بھی ان کی گفتگو
(میں کہ تھا اب لفظ جُو)

پہلے شاعر (میرے یارِ نکتہ پرور) نے کہا
"جس پہ تم بیٹھے ہو یہ کُرسی مجھے محبوب ہے
"گود ہے اس کی فراخ"
"گدّیاں اس کی گداز"
"اس کا بھُرکس خوب ہے"
"ذہن چوکس، جسم سُست"
"جس سے رہتا ہے نظامِ ہضمِ انساں تندرست"
دوسرے شاعر نے یہ سُن کر کہا

" دوستا "

کیا کہوں میرا نظامِ ہضم ہے ابتر بہت

" گیس اندر ہے بہت "

"ہو نظامِ ہضمِ اِنساں میں اگر کچھ اَلتہاب"

" سلسلۂ نظمِ عالم ہو خراب "

" اِنقلاب اے اِنقلاب "

پہلے شاعر نے کہا

" اس کے یہ معنی کہ تم میری طرح "

" بکسلے کی شاپ کے سِگریٹ پیو "

" یہ مکاں ہے کوچۂ گمٹی گراں کی کوکھ میں "

" اس کا مالک ایک کبڑا امردِ زرد "

"نام اس کا بکسلے "

" ایک سگریٹ لو یہیں مجھ سے پیو "

دوسرے شاعر نے سگریٹ تھام کر

اس کو سُلگایا، جلایا، کش لگایا اور کہا
"شہرِ لندن اب تو پہچانا نہ جائے"
گاڑیوں اور موٹروں کی بھیڑ میں
راستہ مِلتا نہیں!

R. C. LEHMANN

فاصلہ

اچھی چیز، پیاری چیز
اکثر دور سے آتی ہے
دن کی کرنیں
چاند کی چاندی
اُجلی برف پہاڑوں کی

اچھی چیز پیاری چیز
اکثر دور سے آتی ہے

محویت

مجلسِ ارشاد میں
میں نے اپنے پادری صاحب کی آنکھ
آج تک دیکھی نہیں
جوش وجذبے کا وہ دریائے رواں
بے کراں
جب ادا کرتے ہیں، من میں ڈوب کر، حرفِ دُعا
اُن کی آنکھیں بند ہوں
جب وہ محوِ پند ہوں
میری آنکھیں بند ہوں

(نامعلوم)

نکتہ فہم گھوڑا

ایک بوڑھا پادری
جا رہا تھا اپنے گھوڑے پر سوار
راستے میں ایک بستی کے قریب
اک کسان سادہ ان سے پوچھ بیٹھا اک سوال
" تھک گیا ہوں میں تو کھا کے یہ گھاس "
"یعنی ساگ "

پادری صاحب نے فوراً روک لی گھوڑے کی باگ
اور نیلے کھیت میں
ایک لمبی عالمانہ بحث کی — اس مسئلے کے بیچ میں
آخر جملہ تھا — "سن اے نیک مرد"

"تو دل آزردہ نہ ہو"
"معرفت کے ربط سے"
"ماس بھی ہوتا ہے گھاس"
"گھاس بھی ہوتا ہے ماس"
یہ سنا، تو نکتہ رس گھوڑے نے گردن موڑ کر
کاٹ کھائی پادری صاحب کی ٹانگ

(نامعلوم)

میں رکھوالا

میں رکھوالا
اُونچی بلبی، کلغی والا
امَن کا بھی   قانوُن کا بھی
انگریزی پتلُون کا بھی
اِنگلستان کا شاہ زمن
اس کے تخت و تاج پر قرباں

میرا تَن
تیرا دَھن
تَخت پہ جو بھی راج کرے
بندہ اپنا کاج کرے
پر جا بھری کچہری میں
کھڑکی دار کٹہری میں
اُجلا ، صاف لبادہ ہو
علم سے ٹھاٹھ زیادہ ہو
کلکتے سے لاٹ آئے
دو گھوڑے کی لمبی چوڑی ، چکنی بمبو کاٹ آئے
میں اُس سے
باتیں فر فر کرتا ہوں
"یِس سَر" — "یس سَر" کرتا ہوں

راہولڈ

اے غمِ دل کیا کروں؟

[ریڈن کی اس نظم میں اردو کے مشہور شاعر اسرار الحق مجاز کی ایک بہت مقبول نظم (اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں) کی تکنیکی بُنّت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ فکری اپیچ قطعاً تفریحی ہے کہ ریڈن تو شاعری کو اپنی ملازمت کا گرد غبار جھاڑنے کے لیے جھاڑو کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ ض]

میں کچہری لگانے میں پُر جوش ہوں
صاحبِ ہوش ہوں
ویسے خاموش ہوں

دیکھ کالر مرا

اُس پہ جھالر مرا

لٹوپ، کنٹوپ ہے

آدمی، توپ ہے

توس کھاتا ہوں میں

اس پہ گاڑھی ملائی بچھاتا ہوں میں

غسل کرتے ہوئے، گنگناتا ہوں میں

اور اس کے سوا کیا کروں، کیا کروں ؟

ہدایات

اک ہوٹل تھا چار اسٹار
نام تھا اُس کا "صبحِ بہار"
ساحل پر" چاندی کا تار"
ٹیلی فون کے ساتھ نتھی
ایک ہدایت نامہ تھا
اے مسٹر!

صاف نہ کریئو اپنے بُوٹ
ہوٹل کے اُجلے ، ٹاول سے
مچھلی کھانا چاول سے
پانی کا نل رکھنا بند
اے ہمدم
کپڑے ہو جائیں گے نم
کھانے میں گر ہو خامی
ذکر نہ کر
ہوگی تیری بدنامی
شور نہ کر
"بور" نہ کر

(مسقط)

۲۲ اگست ۱۹۸۳ء

(نامعلوم)

گردِ غمِ دوراں

ہندوستان میں برطانوی تسلّط کے زمانے میں "انڈین سول سروس" کے بعض انگریز افسر تفریحی شاعری کرتے رہے ہیں۔ ان میں، فرنیک بگ ہولڈ" (FRANK BiG HOLD) اور سیسل ریڈن (CECiL READEN) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں افسر گزشتہ صدی کے وسط میں صوبہ بنگال میں کمشنر کے منصب پر فائز رہے۔

ذیل کی نظمیں، تفریحی طنزیہ انداز میں ان کی سرکاری زندگی کے افکار و حوادث کی عکاسی کرتی ہیں۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کے طنز کا ہدف عموماً ان کے صوبے کا گورنر ہوتا تھا۔

(ضمیر)

ہم روتے ہیں

(بنگال کے گورنر ہالی ڈے کے بارے میں)

جب ہالی ڈے آتا ہے
چین ہمارا جاتا ہے
جنگل میں منگل ہوتا ہے
کھیل تماشے
ڈھولک تاشے

بٹر - ٹماٹر

کیلے - نارنگی - "لوکاٹ"

کیمپ میں سب کچھ ہوتا ہے

بالی ڈے خود سوتا ہے

بہترین

کانسی رام اور احمد دین

پہنے اپنی دیسی جین

آتے ہیں

پھولوں کے ہار پروتے ہیں

"لاٹ" ان کو دیکھ کے ہنستا ہے

ہم اندر اندر روتے ہیں

(ہولڈ)   (۱۸۵۳ء)

جشنِ مسند نشینی

[گورنر بنگال سرولیم گرے (GREY) کی
ڈیوڑھی میں ٹکانے کے لیئے ۔ دیڈن]

تیری مسند نشینی کا دن آگیا
اِقتدار آفرینی کا دِن آگیا

سب سلامی کریں
دھوم دھامی کریں

برفیاں بانٹ کر
نیک نامی کریں

ہوں ضیافت کی پرجوش تیاریاں
شہرِ کلکتہ میں اپنا "ٹاور" ہے جو
ہند میں "تاج" کا یارک شاٹر ہے جو

دعوتیں پیاریاں

والیانِ ریاست سے بھی یاریاں

ہم اکٹھی کریں شہر و دیہات سے

لکڑیاں، بکریاں

مرغ و ماہی کی سالم کڑاہی چلے

خوش نگاہی چلے

تاکہ تیری نمائش فروزاں رہے

تاکہ اپنی ستائش کا ساماں رہے

کارِ مشکل کریں بھی تو آساں رہے

یہ نہ سوچا کبھی

ان غریبوں، غلیظوں۔ مریضوں کے۔

تاریک ماحول میں

تاجِ زر جگمگانے سے کیا فائدہ

جشنِ عشرت سجانے سے کیا فائدہ

(۱۹۶۷ء)

○

رات دن، رات دن

سخت مصروف ہوں
سخت ماؤف ہوں

کاغذ اُوپر تلے کرتا رہتا ہوں میں

پیٹ مِثلوں کے بس بھرتا رہتا ہوں میں

" خواب تالاب " میں تَرتا رہتا ہوں میں

زندگی کے لیے مرتا رہتا ہوں میں

کتنے چوروں لٹیروں کو اک سال میں

سارے بنگال میں

قید کرتا رہا

اپنے گھڑسال میں بھی مُقفّل کیا

اُن کو لوٹھا کیا

خود کو پاگل کیا

چوکیداروں کی پھر بھی ضرورت رہی
میں کلکٹر سہی
میں کمشنر سہی
لیکن اس کے سوا۔ کیا کروں! کیا کروں! (۱۸۶۷ء) رریڈن

جیون رس

ایک لڑکی پاس کے اِک گاؤں میں
پل رہی تھی چھپروں کی چھاؤں میں
جب جواں ہونے لگی
یہ زمیں بھی آسماں ہونے لگی
بولتی تھی ___ جیسے کوئی فاختہ ___ بے ساختہ

شام کو ہُو ہُو کرے

یا پپیہا - صبح کی چہکار میں

کُو کُو کرے

دوڑ کر - سر بر فلک پیڑوں پہ چڑھ جاتی تھی وہ

دیر تک گاتی تھی وہ

اپنی اک چھوٹی بہن کو ساتھ لے جاتی تھی وہ

تالی بجانے کے لیئے

زندگی رس کے لیئے

اک لفظ گانے کے لیئے

اک جسم، اپنا رس لٹانے کے لیے

(نامعلوم)

ضمیریات

"مُسدّسِ بدحالی"

سیاست کا ہر پہلواں لڑ رہا ہے
یہاں لڑ رہا ہے، وہاں لڑ رہا ہے
بیاں کے مقابل بیاں لڑ رہا ہے
"حسابِ دلِ دوستاں" لڑ رہا ہے
ستارہ نظر مہ جبیں لڑ رہے ہیں
یہ حد ہے کہ پردہ نشیں لڑ رہے ہیں

مزاجوں میں یُوں "لیڈری" آگئی ہے
کہ گھر گھر کی اپنی الگ "پارٹی" ہے
کوئی "شیر" ہے تو کوئی "لُومڑی" ہے
یہی اپنی لے دے کے "اِنڈسٹری" ہے
نہ منزل نہ جادہ نہ کوئی اِرادہ
رضا کار کم یاب، لیڈر زیادہ

اگر گھر میں ہیں خیر سے چار بھائی
تو اِک اِک نے ڈفلی الگ ہے اُٹھائی
بچھی ہے سیاست کی پتلی چٹائی
"بہ ہر تخت پوش و بہ ہر چار پائی"

سلیٹی کوئی، تو تیائی ہے کوئی
کوئی سُرخ ہے، فاختائی ہے کوئی

جلوس اور جلسے پہ تکرار، اِن میں
فساد و فتن کے "نمک خوار" اِن میں
بپا مُستقل جُوت پیزار، اِن میں
"یُونہی چلتی رہتی ہے تلوار اِن میں"

جو زِندہ مہینا تو مُردہ مہینا
یہ کیا زندگی ہے نہ مرنا نہ جینا

مِلوں، پرمٹوں، کارخانوں کے جھگڑے
سیاست کے "نو دولتانوں" کے جھگڑے
زبانوں، بیانوں، ترانوں کے جھگڑے
فسانوں پہ ہم داستانوں کے جھگڑے

سرِ خوان لقمہ اُٹھانے پہ جھگڑا
وُہ جھگڑا کہ ہر زانے دانے پہ جھگڑا

حقائق کے آثار دُھندلانے والے
جرائد میں شہ سُرخیاں پانے والے
یہ ہر قول دے کر مُکر جانے والے
یہ ہر "میز کُرسی" پہ مَر جانے والے

بیاباں کو صحنِ چمن جانتے ہیں
قیادت کو خوراکِ تن جانتے ہیں

مکیں گُم شدہ ہیں، مکاں لڑ رہے ہیں
زمیں چُپ مگر آسماں لڑ رہے ہیں
خود اپنی صفوں میں جواں لڑ رہے ہیں
کہاں لڑنے والے، کہاں لڑ رہے ہیں

فسادات کی سُرخیاں اور بھی ہیں
"مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں"

مقاصد کو زیر و زبر کر کے لڑنا
نتائج سے قطعِ نظر کر کے لڑنا

سنان و تبر تیز کر کر کے، لڑنا
اگر کر کے لڑنا، مگر کر کے لڑنا

کہیں دو "وڈیرے" جو لڑ بیٹھتے ہیں
تو سارے "بٹیرے" بگڑ بیٹھتے ہیں

امامت کے تھے مُدّعی خشک و تر میں
سیاست میں، دانش میں، فکر و نظر میں
مقام اِن کا اونچا ہے نوعِ بشر میں
کہ رہتا ہے اکثر فساد ان کے گھر میں

ہوس کی غلامی، شکم کی خدائی
گلا کاٹ دیتا ہے بھائی کا بھائی

مقدّر میں بھوک اور گردِ سفر ہے
بسیرا اگر ہے تو "فٹ پاتھ" پر ہے
نہ کھانے کو روٹی نہ رہنے کو گھر ہے
گزر زندگی کا سرِ رہگزر ہے

وہ مُردہ پڑا ہے یہ گھائل پڑا ہے
سرِ راہ "حلِّ مسائل" پڑا ہے

دفاتر کا آئین و دستور، رشوت
تہی دست لوگوں سے بھرپور، رشوت
وہی بیشِ توفیق و مقدور رشوت
جوانی پہ ہے "چشمِ بد دُور" رشوت

عجب حرصِ دولت کا یہ رقص و رم ہے
کہ جیسے ضرورت بہت، وقت کم ہے

مہاجر کی آبادکاری پہ رشوت
دساور کی "لیسنسداری" پہ رشوت
الیکشن کی اُمّیدواری پہ رشوت
وزارت کی "پروردگاری" پہ رشوت

جو سائل اصُولی، مثالی رہے گا
وہ بھرپور دُنیا میں، خالی رہے گا

مکانوں کی آرائشیں بڑھ گئی ہیں
مکینوں کی آسائشیں بڑھ گئی ہیں
خیانت کی گنجائشیں بڑھ گئی ہیں
کہ بیگم کی فرمائشیں بڑھ گئی ہیں

حدیں کچھ ورائے گماں اور بھی ہیں
"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

امیر اپنے، آرام فرمانے والے
ہر اک ساحلِ تو پہ "رقصانے" والے
مے ناب و برفاب و جھنجانے والے
غریبانِ ملّت سے کٹ جانے والے

یہ دُوری کوئی بے سبب تو نہیں ہے!
محلّے کی مسجد، کلب تو نہیں ہے!

یہ رَم اور رمّی کے بیمار صاحب
جوئے اور گھڑدوڑ کے یار صاحب
سمور اور ریشم کے مینار صاحب
رباط اور روما کے میار صاحب

وُہ رشیری دھری ہے یہ وِسکی کھڑی ہے
شراب ان کی گھٹّی میں گویا پڑی ہے

نہ یہ کارواں میں، نہ یہ کارواں سے
نہ جانے یہ لوگ آ گئے ہیں کہاں سے

جو اپنی زباں میں کہیں کچھ زباں سے
تو بس پھڑپھڑاتے رہیں رائیگاں سے
شلر اور شیلے تو سب جانتے ہیں
مگر میرؔ و غالبؔ کو کب جانتے ہیں؟
زمیں دار کاروں کو دوڑانے والے
زر و مالِ مجروں پہ برسانے والے
کلف دار شملوں کو لہرانے والے
نمک خوار کتّوں کو لڑوانے والے
لگاؤ ادب سے، ہنر سے، نہ فن سے
دھواں اٹھ رہا ہے دلِ انجمن سے
یہ مانا بشر دیوتا بھی نہیں ہے
یہ جینا نری اک سزا بھی نہیں ہے
فراغت شئے ناروا بھی نہیں ہے
حیاتِ بشر دیرپا بھی نہیں ہے
مگر دین و ملّت کا احساس کچھ تو!
غریبوں کی ذلّت کا احساس کچھ تو!

جو بینا ہو تم رہ نمائی کرو تم
جو دانا ہو عقدہ کشائی کرو تم
غنی ہو تو حاجت روائی کرو تم
بڑائی یہی ہے بھلائی کرو تم

بڑے شوق سے اپنے جلسے مناؤ
امیرو! غریبوں کے بھی کام آؤ

تمنّا کہ ہر شے کی تجدید کیجے
تمنّا کہ ذرّوں کو خورشید کیجے
عمل سے نہ جذبے کی تائید کیجے
بیاں دیجیے اور تردید کیجے

طلب یہ کہ دنیا میں اونچی ہو "نیشن"
عمل یہ کہ جلسے میں اک "ریزولیوشن"

نہ منشور اپنا، نہ دستور اپنا
قدم راہ چلنے سے معذور اپنا
مگر شور ہے دُور سے دُور اپنا
گلا کام کرتا ہے بھرپور اپنا

یہ "ناز" اپنے "انداز" میں دب چلا ہے
کہ ساز اپنی آواز میں دب چلا ہے

تعصّب کا فتنہ ہُوا پا رہا ہے
تغلب کا پرچم کُھلا جا رہا ہے
اُجالا، اندھیرے سے شرما رہا ہے
یہ سورج نکلتے ہی گہنا رہا ہے

گلے مِل رہے ہیں بچھڑنے کی خاطر؟
یہ میلا لگا تھا اُجڑنے کی خاطر؟

کوئی اپنے کلچر کو شلوار سمجھے
کوئی اپنی ساڑھی کو اَوتار سمجھے
کوئی اپنی ٹوپی کو سردار سمجھے
کوئی اپنے طرّے کو طرّار سمجھے

مِلا آ کے جہلم میں پدما کا پانی
مگر ہے الگ، اپنی اپنی روانی

کوئی دھان کے نرم کھلیان میں گُم
کوئی اپنے گیہوں کے گھمسان میں گُم

کوئی اپنے شہروں کے بُستان میں گُم
کوئی اپنی نہروں کے رُومان میں گُم
عجب کیا اگر قافلہ کھوگیا ہے
حُدی خوان کو ہاں پر سوگیا ہے

کہیں معرضِ جنگ میں "نوکری" ہے
کہیں "لیڈری" سان پر لگ رہی ہے
نہایت یہ ایمان و ایقان کی ہے
"وہ نوفی صدی ہے کہ دس فیصدی ہے"

الگ جھولیاں ہیں الگ بولیاں ہیں
یہ اک قوم ہے یا کئی ٹولیاں ہیں؟

خُدا ایک ہے برملا مانتے ہیں
مُحمّد کو سب پیشوا مانتے ہیں
صحیفہ کلامِ خدا مانتے ہیں
پیمبر کو سب رہنما مانتے ہیں

اِدھر بدگمانی، اُدھر بدگمانی
اخوّت کا دعویٰ زبانی زبانی

مُسلماں برادر برادر یہی ہیں؟
یہ ہم یار و انصار و یاور یہی ہیں؟
سزاوارِ الطافِ داور یہی ہیں؟
نگہدارِ خُلقِ پیمبر یہی ہیں؟
دِلوں میں ہے فصل اور فصل اِس بلا کا؟
یہی کیا ہے وہ خاص کُنبہ خدا کا؟

زر و سیم و دام و درم بِک رہے ہیں
حریر و کُلاہ و عَلم بِک رہے ہیں
ہَوا و ہَوَس کے صنم بِک رہے ہیں
حرم میں، خدا کی قسم بِک رہے ہیں
پریشان و برہم سب اقدارِ محکم
الٰہی! کہاں سے کہاں آگئے ہم

طلب، کچھ مقامات پر رُک گئی ہے
"نظر" کچھ حجابات پر رُک گئی ہے
محبّت، مفادات پر رُک گئی ہے
سَحر، آخری رات پر رُک گئی ہے

سلامت جو طوفان سے آگئی ہے
وہ کشتی کنارے سے ٹکرا گئی ہے

حدود و مکاں کی پرستاریاں ہیں
وہی ذہن کی "تنگ دیواریاں" ہیں
کم آمیزیاں، زُود آزاریاں ہیں
یہی روگ قوموں کی بیماریاں ہیں

در و آستاں منتہا بن گئے ہیں
کہ پتّھر کے بُت پھر خدا بن گئے ہیں

یہ صُورت ہے جب اوّلیں مرحلوں میں
تو کیا ہو گا اے دل کٹھن مرحلوں میں
یہی بدظنی گر رہی قافلوں میں
تو اک روز کھنڈت پڑے گی دِلوں میں

دِلوں کی کدورت سے ڈر اے مسافر!
حَذَر اُس گھڑی سے حَذَر اے مسافر!

۱۹۵۴ء

مردِ مومن

(رُوحِ اقبالؒ سے ندامت کے ساتھ)

"ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن — نئی شان"
تولا کبھی ماشہ — کبھی سکّھر کبھی کاغان

بُت خانہ میں اِک ایک کو تھا دعویِٰ ایمان
کعبہ جو بنایا تو نہیں کوئی مُسلمان

سہما ہُوا — دُبکا ہُوا — حیران، پشیمان
جیسے کسی کنجوس کے گھر میں کوئی مہمان

کرسی پہ ہے مومن کبھی مومن پہ ہے کرسی
ایوان کی زینت کبھی رُسوا سرِ میدان

سیّد، کوئی مرزا، کوئی راجہ، کوئی راؤ
لاؤ ذرا دیکھوں تو کوئی صرف مسلمان

مُلّا ہے تو اِس کاٹھ کا مُلّا ہے کہ الحق
حیران ہے اسلام تو قرآن پریشان

افسر ہے تو اس ٹھاٹھ کا افسر ہے کہ جیسے
اک چیز ہے بالاترِ نسلِ بنی انسان

تاجر ہے تو اِس جونجھ کا تاجر ہے کہ اکثر
ایمان کو بھی تول کے رکھ دے سرِ میزان

مُفتی ہے تو تکفیر سے چھوٹی ہُوئی نکسیر
شاعر ہے تو بس عذرا و سلمیٰ کا حُدی خوان

لیڈر ہے تو اِس شور کا لیڈر ہے کہ گویا
مامُور من اللہ ہے وزارت پہ یہ طوفان

دِل اس کا ہے پنجابی و بنگالی و سِندھی
گھر اس کا بخارا نہ سمرقند نہ ملتان

"سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ"
لو دست و گریبان ہے سُبحان سے رمضان

وحشت تو فرنگی مدنیّت سے مُسلّم
گھر آنے کی توفیق نہ ارمان نہ سامان

میری و وزیری و سفیری و اسیری
"یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان"

——— ۱۹۵۴ء

نظر کی عیب جوئی دل کی ویرانی نہیں جاتی
یہ دو صدیوں کی عادت ہے بہ آسانی نہیں جاتی

مسلمانوں کے سر پر خواہ ٹوپی ہو نہ ہو، لیکن
مسلمانوں کے سر سے بُوئے سلطانی نہیں جاتی

یہ اچھّی فقر و استغنا کی صورت ہے معاذ اللہ
کہ پوری قوم کی صورت ہی پہچانی نہیں جاتی

"خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں"
کہ پیدا ہو گئے ہیں اور حیرانی نہیں جاتی

جہاں تک کثرتِ اولاد نے پہنچا دیا اس کو
وہاں تک بندہ پرور نسلِ انسانی نہیں جاتی

یہی جمہوریت کی مغربی معراج ہے شاید
کہ اب ہم سے خدا کی بات بھی مانی نہیں جاتی

مجرّد آرٹ کی شہکار عورت بھی عجب شے ہے
جو اس کو دیکھ لو پھر وہ پشیمانی نہیں جاتی

——————— ۱۹۵۴ء

سڑک چل رہی ہے

ہر قدم کی اپنی اپنی چال ہے
آدمی لُڑھکا ہُوا فُٹ بال ہے
خستہ و برگشتہ و بد حال ہے
یہ ہماری پیاری اصغرؔ مال ہے
چہرہ بنگلوں کا بظاہر لال ہے
بیچ سے دیکھو تو پتلا حال ہے
اپنے اپنے مچھّروں کی جھیل ہے
اپنی اپنی مکھیوں کا ٹال ہے

ف راولپنڈی شہر کی ایک معتبر سڑک

بھنگنیں اس پہ بچھا جاتی ہیں روز
جس کے گھر میں جتنا جتنا مال ہے
گھر کی ہر نالی بتا دیتی ہے روز
آج گھر میں گوشت ہے یا دال ہے
زیدؔ کی دہلیز پر جو چیز تھی
یہ بکرؔ کا "نامۂ اعمال" ہے
ترگڑھوں کا اِک علی گڑھ ہر طرف
ہر گڑھا تاریخِ ماہ و سال ہے
آدمی سے بڑھ کے اصغر مالؔ پر
بھینس کا گوبر بلند اقبال ہے

۱۹۵۰ء ———————

پرنس گُل اندام

(ملتان سے مجتبیٰ ایس عثمان کی طرف سے آموں کے تحفے پر)

آم جو میرے نام بھیجے ہیں
کتنے شیریں پیام بھیجے ہیں
لُطف و لذّت کے صبح و شام آئے
آم آئے کرمے کے جام آئے
جشن برپا ہے خاص آموں کا
رنگ نکھرا ہماری شاموں کا

دن کو گھر میں سُرور کا میلا
شب کو راوی پہ موج کا میلا
کیف جس سے اُمنگ پیدا ہو
رنگ جس سے ترنگ پیدا ہو
مہ وشوں کو کھلا کے کھائے ہیں
چاندنی میں رلا کے کھائے ہیں
قند میں یہ سجل مٹھاس کہاں؟
شہد میں یہ کنوّل کی باس کہاں؟
ان کی خوشبو، سرِ نسیمِ بہار
مہک اُٹھا ہے خطّۂ پوٹھوہار
آم اور برشگال کی راتیں
آم اور حُسنِ یار کی باتیں
آؤ اے دوستو کہ میرے پاس
سوم رس کے ہیں سر بہ مُہر گلاس

گدگدے، شوخ، کجکُلاہ یہ آم
سارے آموں کے بادشاہ یہ آم

ہوں گے اِس شے کے شائق وطالب
باغِ رضواں میں حضرتِ غالب
شال دھانی بھی زعفرانی بھی
کیف بھی، حُسن بھی، جوانی بھی
خواہ تُخمی ہیں، خواہ پیوندی
ہمہ لذّت، تمام خورسندی
گُٹھلیاں، چشمِ مُرغ و ماہی ہیں
آم کی سرسری گواہی ہیں
جسمِ نازک میں کوئی تار نہیں
تار ہے بھی تو خار دار نہیں
چھَب منوہر ہے، شکل پیاری ہے
کِشت کاری میں دستکاری ہے
رُوئے رنگیں پہ تازگی کی پھبن
جانِ شیریں میں اِک سنہرا پن
تن پہ باریک، دل نشیں چھلکا
جیسے ریشم "ولایتی" مِل کا

کوئی ممتاز خانوادہ ہے
جو بھی دانہ ہے شاہزادہ ہے
جانے کس نام سے ہیں یہ بدنام
میں کہوں گا — "پرنس گُل اندام"
نازشِ رودِ سندھ ہیں یہ آم
فاتحِ مُلکِ ہند ہیں یہ آم
ساتھ ان کے بہ حُسن و زیبائی
یادِ آں یارِ دل نواز آئی

—————— ۱۹۶۸ء

پرائی موٹر کا چسکا

منفرد مزاح نگار نذیر احمد شیخ کی نذر
جن کی موٹر ایک عرصے تک یاروں کی سواری کے لیے وقف رہی۔

دوست بدظن ہیں کہ اُن سے بدگماں رہتا ہوں میں
ماہ و مہر و مشتری کے درمیاں رہتا ہوں میں
کیا بتاؤں دوستوں کو اب کہاں رہتا ہوں میں
شیخ کی شب رنگ موٹر میں رواں رہتا ہوں میں

دوستوں سے ترکِ ربطِ دوستانہ ہو گیا
ہوتے ہوتے میں ضمیرِ غائبانہ ہو گیا

میں یہ کہتا ہوں کہ مصری خان ہوگا ٹال پر
وہ یہ کہتا ہے میاں اقبال ہوگا مال پر
میں یہ کہتا ہوں کہ چل مرغابیوں کے تال پر
وہ یہ کہتا ہے کہ لہرا دیکھیے "فُٹ بال" پر
میں یہ کہتا ہوں سفارش کے لیے تھانے کو چل
وہ یہ کہتا ہے کہ خارش ہے شفاخانے کو چل
میں یہ کہتا ہوں کہ راول کی طرف لے چل مجھے
وہ لیے جاتا ہے سُوئے مشہد و موصل مجھے
میں یہ کہتا ہوں ذرا فطرت کے دو اک پل مجھے
وہ یہ کہتا ہے محمد خان ہے افضل مجھے
کیا کروں حالات کو اوقات پر قابو نہیں
اندریں حالات اپنی ذات پر قابو نہیں
جب سے ارزاں ہوگئی یہ "کار" بے دام و دِرم
کُوچہ و بازار میں چلنے سے گھُٹ جاتا ہے دَم
سَیلِ انبوہِ بشر؟ کُوچے میں دریا، کُو میں یَم
ران پر ٹھیلے کا پہیا، کان پر تانگے کا بَم

گھر سے تو اکثر بہ قصدِ دوستاں آتا ہوں میں
پھر جدھر موٹر چلی جائے چلا جاتا ہوں میں

دو قدم چلنا ہوا دشوار یارو کیا کروں
حوصلہ کم فاصلہ بسیار یارو کیا کروں
بن گئی رفتار ہی دیوار یارو کیا کروں

وہ بھی ہیں میری طرح شاید اِسی ادبار میں
پھر رہی ہیں آج جو قومیں "پَرائی کار" میں

———— ۱۹۵۸ء

کر دیا اِس کار نے بے کار، یارو کیا کروں

غنیمت ہے تری خوش چہرگی اور سادگی اپنی
کر اِن چیزوں سے رہتی ہے طبیعت رُو غنی اپنی

زِ راہِ دل نوازی ہے برہمن دوستی اپنی
سیاست میں نہیں کوئی وصیت آخری اپنی

عبوری دَور میں اس طرح گزری زندگی
نہ محکم ممبری اپنی ، نہ پکّی نوکری

پریشاں ہی نہ کر دے وحدتِ ملّی
خدا کے گھر کی دیواروں میں یہ صورت

اُدھر مُرغانِ صنعت بانگ دُنیا بھر میں دے آئے
اِدھر انڈوں سے نکلی ہی نہیں "انڈسٹری" اپنی

ہماری کشتِ پُرنم تھی مگر دو چار قسطوں میں
غٹا غٹ پی گئے ہم آپ ہی ساری نمی اپنی

مجھے وہ گُم صُم اِک خط ناکشیدہ فلسفی سمجھے
چلو اچھّا ہوا ، کام آ گئی آوارگی اپنی

ضمیرؔ ان سے سخن اپنی زباں میں کر نہیں سکتے
بیانِ حالِ دل کیا ہو، "نہ" کا "اپنا نہ" کی" اپنی

۱۹۸۲ء

معذرت نامہ

[محبّی مولوی محمّد سعید، ایڈیٹر روزنامہ "پاکستان ٹائمز" راولپنڈی کے فرزند
کی شادی کے دعوت نامے کے جواب میں]

سعیدِ محترم نے اب کے اتوار
رچایا منجھلے بیٹے کا ولیمہ
مجھے بھی یاد فرمایا انھوں نے
زِ راہِ لطفِ اخلاقِ قدیمہ
بہت جی چاہتا تھا حاضری کو
بپاسِ ربطِ اخلاصِ قدیمہ

لہک کر شعر پڑھتے اور کھاتے
پُلاؤ— قورمہ، مُرغاب و قیمہ
سفر سرآمد آیا کوئٹے کا
اسی دن اور بہ خطِ مُستقیمہ
مبارک ہوں انھیں بچّوں کی خوشیاں
دعا نکلی یہ از قلبِ صمیمہ

——— ۱۹۶۸ء

فورٹ منرو

صدیوں کی یہ ویرانی، یہ ریگ بیابانی
میلوں میں نہیں دانہ، کوسوں میں نہیں پانی
فطرت[1] کے "مقابر" کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

---

[1] حضرت علامہ اقبال کا شعر، بہ تحریف

اتفاقِ رائے

تحفے میں بیوی کو اِک ریشم کی ساری لا تو دی
ساتھ ہی کھینچی مگر شوہر نے لمبی ہائے بھی
اس پہ بیوی نے فسردہ رنگ شوہر سے کہا
کتنا بے معنی ہے ایسا اتفاقِ رائے بھی

اِلزام

پولیس کے ایک سپاہی نے
اک شخص کو جب ماخوذ کیا
تو اُس کو یہ الزام دِیا
ترا جرم ہے یہ
اے شخص تُو رشوت دینے میں ناکام رہا

دفتر نامہ

منشی و منتہدی و اورنگ و افسر دیکھیے
دو تہائی ۔ نصف، چوتھائی سکتر دیکھیے
اپنی آنکھوں سے بھی خود اپنا منسٹر دیکھیے
دور جاکر دیکھیے — نزدیک آکر دیکھیے
لوگ باہر دیکھیے، اور لوگ اندر دیکھیے
اک بڑی سرکار کے دفتر کا منظر دیکھیے

کوئی بیٹا لائے ہے، کوئی بھتیجا لائے ہے
کوئی 'پرمٹ' کے کسی چکّر میں چکّر کھائے ہے
صورتِ شام و سحر اک آئے ہے اک جائے ہے
"مژدہ اے جوشِ جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے"
اک 'ہجومِ وڈراں' — لشکر بہ لشکر دیکھیے
اک بڑی سرکار کے دفتر کا منظر دیکھیے

جس قدر افسر نگاہِ معدلت گستر میں ہیں
حضرتِ ابنِ بطوطا کی طرح چکّر میں ہیں
مصر میں، ایران میں، لبنان میں، بربر میں ہیں،
بعض پیدائش سے "یو این او" کے گھنٹا گھر میں ہیں
اُن کے کالر، اُن کے جھالر، اُن کے ڈالر دیکھیے
اک بڑی سرکار کے دفتر کا منظر دیکھیے

"فائلیں" آتی ہیں، مر جاتی ہیں اندر ہی کہیں
کھا گئی ہے کتنے منصوبوں کو دفتر کی زمیں
اس کا شکوہ بے محل ہے اے زبانِ نکتہ چیں
'پالیسی' ہی اپنی 'درآمد' ہے 'برآمد' نہیں

اپنے تخمینے ذرا نمبر بہ نمبر دیکھیے
اک بڑی سرکار کے دفتر کا منظر دیکھیے

ہیں یہاں ایسے بھی کچھ مبروص فطرت کے بشر
"چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر"
نیند آتی ہی نہیں رشوت کی دھن میں رات بھر
یہ جبلّت دیکھ کر یہ قتلِ ملّت دیکھ کر

پھر جبیں پر مسجد و محراب و منبر دیکھیے
اک بڑی سرکار کے دفتر کا منظر دیکھیے

—— ۱۹۵۴ء

خودی

پیہم سنتے ہیں یہ پند
خودی بلند۔ خودی بلند
ہم سے اَلّم غَلّم لوگ
'بس' میں بے بس
ریل میں بند
خودی کہاں سے کریں بلند؟

عبادت

گھٹنوں گِر کر ــــ معبد میں
حمد ترانے گاتے جاؤ
خلق و تپاک سے بچھتے بچھتے
کچھ ــــ بارود بچھاتے جاؤ

قبر کتبے

(۱)

ایک شاعر ہے یہاں مصروفِ خواب
جس پہ تھے اسرارِ قدرت بے حجاب
آستیں میں ماہتاب و آفتاب
اُس نے اپنے ذہن سے
لفظ سے
اک خدا کی ذات سے قطعِ نظر

ہر کسی پر بر ملا تنقید کی ——
بے انتہا تنقید کی
حضرتِ یزداں بھی محض
اتفاقاً بچ گئے
کیوں کہ ربِّ دوسرا سے آپ کی
صاحب سلامت ہی نہ تھی
واقفیّت ہی نہ تھی

(۲)

یہ ہے رلزلے جیک کی قبر
کندہ جس پر آیۂ صبر
جسماً نازک، نرم نحیف
قسماً، قولاً بڑا ظریف
ڈربی کے بازاروں میں
جوتے پالش کرتا تھا

لوگ ہوئے ریٹائر جب
بھر گیا 'ڈربی شائر' جب
مہنگے ہو گئے 'ٹائر' جب
گونگے ہو گئے شاعر جب
لڑکے گنجے پنشنروں کے سر کی مالش کرتا تھا
اب بھی گویا ایک طرح کے جُوتے پالش کرتا تھا

(انگریزی سے) ——————— ۱۵ اگست ۱۹۸۲

بسلسلہ سلسلہ

[اسلام آباد کی محدود ادبی انجمن "سلسلہ" کی تیسری سالگرہ پر ــ ممتاز شاعرہ
محترمہ ادا جعفری اس کی بانی تھیں اور محترم قدرت اللہ شہاب صدر]

قورمے پر قلم آزمائی ہوئی
اس بہانے مگر خوش نوائی ہوئی

چند جگنو تو شب میں چمکتے رہے
شامِ احباب کچھ تو حنائی ہوئی

اک برس سلسلہ اور چلتا رہا
سوچیے تو بڑی کاروائی ہوئی

غیبت و جگ ہنسائی کے ماحول میں
کیا یہ کم ہے یہاں ــ گھر ہنسائی ہوئی

ـــــــــــ ۲۸ جنوری ۱۹۸۲

علمی چوکے چھکّے

میں نے ثابت کر دیا ہر طور ہر آئین سے
آئی تھی اُردو زباں کابل کے رستے چین سے
کوئی پورس ہی سکندر کے فسانے میں نہیں
اس سے پہلے ہو تو ہو اس کے زمانے میں نہیں
قصّہء فردوسی و محمود بھی یکسر غلط
بلکہ فردوسی کی ہست و بود بھی یکسر غلط

چھپ گیا ہے جو کلامِ خوب اس کے نام سے
وہ اُڑایا اس نے اِک متنبّی المرغام سے
میں نے یہ ثابت کیا جہلم کے قبرستان سے
آریا برما سے آئے اور ہُن جاپان سے
وہ نیا پتّھر جو نکلا ہے پُرانے غار سے
کتنی تہذیبوں کو دے مارے گا اپنی مار سے

۱۹۵۰ء ————

قول و عمل

قول و عمل کا ربط ہے محکم
آج نہ بدلا اپنا آج اگر تُو نے
تیرا کل تبدیل نہ ہو گا
قدرت کا دستور اٹل ہے
بیج کا پھل تبدیل نہ ہو گا

لاس اینجلس (امریکا) ——————— (جرمن ادب سے ماخوذ)
۱۹ اگست ۱۹۸۱

موازنہ

کُتّے کی عادتوں کو
جب بھی بغور دیکھا
قائل تو ہوگیا ہوں
انساں کی برتری کا
لیکن جنابِ عالی
انساں کی خصلتوں کو جب بھی بغور دیکھا
شرمندہ ہوگیا ہوں

(ازرا پاؤنڈ سے ماخوذ) ———— نیوجرسی - امریکا
۲۲ اگست ۱۹۸۱

ہاں اور نہیں

[امریکی طنز نگار اوڈگن ناش کی نظم "YES AND NO" کا عکس]

کاش مَیں ہوتا سیاسی کارکن
ابتدا میں کارکن
بعد میں — دو چار ہڑتالوں کے بعد
افسروں کے ساتھ پڑتالوں کے بعد
فرد سے بطلِ جلیل
اِک زعیمِ خوش لباس و خوش کلام
کانگرس میں صبح — مے خانے میں شام
'قصرِ ابیض'[1] میں سہ پہری نُقلِ خاص
صدرِ امریکا کے ساتھ
گردنِ مینا پہ ہاتھ

---

[1] وائٹ ہال (واشنگٹن)

ناشتہ بھی گاہ گاہ

واہ واہ

چین کے منقوش آئینوں کے بیندہ گلاس

نائیجر کے زرد امرودوں کی ساسؔ[1]

گردشِ عالم کے ساتھ

گردش آدم کے ساتھ

کتنا خوش — کس قدر آسودہ حال

مقتدر — فرخندہ خاطر — بامراد

ہاں مگر !

ہاں اگر !

تجھ کو ہوتا کاش اپنے آپ پر کچھ اعتماد

(نیویارک) ———— ۶ ستمبر ۱۹۸۱

---

[1] چٹنی

نسخہ

نوازش، پرسشِ صحت کا یارو
ابھی مضبوط ہے اپنا ارادہ
ہے نسخہ تندرستی کا یہ سادہ
مشقّت کم مگر سونا زیادہ

تسلسل

صبح دم یہی منظر
مدتوں سے ہوتا ہے
باباجان کھانستے ہیں
بیٹا رام سوتا ہے

قومی لباس

افرنگیوں کے جاکٹ و پتلون و جین میں
عبدالودود کا ہے کو عبدالودود تھا
ڈھانپا اب اچکنوں نے عیوبِ برہنگی
"ورنہ وہ ہر لباس میں ننگا وجود تھا"

۱۹۸۱ء ________

دوستو آئیے کام کوئی کریں
کچھ نہیں اور تو ــــ عیب جوئی کریں

ہمارے مسائل کو آسان کر
برزنیف[1] کو یارب مسلمان کر

کون ہے پکّا جیون سنگی
گنجے پنشنروں کی کنگھی

اِک شیر سے ہمارے بھی دو ہاتھ ہو گئے
انجام یہ ہوا ہے کہ اِک ہاتھ رہ گیا

۱۔ روسی لیڈر

ایک ڈپٹی کمشنر کی ڈائری سے

آج چھیڑی ہی تھی اک بوجھل سی بوسیدہ اپیل
پل رہے ہیں جس کی رزاقی پہ دو موٹے وکیل

آگیا اتنے میں اُوپر سے بڑا 'ارجنٹ تار'
جس میں لکھّا تھا کہ "اے ڈپٹی کمشنر ہوشیار"

دو وزیرانِ گرامی آ رہے ہیں دفعتاً
تم پہ لازم ہے ابھی روشن کرو دشت و دمن

ساتھ اُن کے شین بھی ہے، جیم بھی ہے، میم بھی
غیر ملکی ماہروں کی گشت والی ٹیم بھی

کیجیے اُن کے قیامِ محتشم کا اہتمام
دُور تک ہو شامیانوں کا مجلّہ انتظام
طبعِ نازک بھی نصیبِ دشمناں ناخوب ہے
آج کل یخنی پرندوں کی فقط مرغوب ہے
بہرِ عرضِ شوق جتنے بھی 'وڈیرے' آئیں گے
یہ وڈیرے اپنے ڈیرے سے 'بٹیرے' لائیں گے
مکڑیاں مروائیے، شادابیاں پھیلائیے
جھیل پر کچھ کُشتنی مرغابیاں بندھوائیے
سب مقامی مسئلوں کا حل شتابی چاہیے
ایک جلسہ بھی بشرطِ کامیابی چاہیے
مسجدِ جامع میں پڑھوانی ہے اک پبلک نماز
لیکن اپنی اپنی صف میں ہوں گے محمود و ایاز
پیر صاحب سے بھی رسم و راہ پیدا کیجیے
جس طرح بھی ہو کوئی درگاہ پیدا کیجیے
خوش عقیدہ 'ووٹروں' میں نیک نامی کے لیے
نوگزے کی قبر سج جائے سلامی کے لیے

کم سے کم چالیس گھوڑے بھی فراہم کیجیے
اس علاقے میں اگرچہ کم ہیں تاہم کیجیے

کام یہ ہے قوم کو پیغام دینے آئیں گے
ایک نیلی گائے کو انعام دینے آئیں گے

پا کے اس معقول و مربوط و مفصّل تار کو
میں نے پھر بندھوا دیا فائل کے اس انبار کو

۱۵، ۷ کومیلا لائن، ملیر چھاؤنی ——————— ۱۹۵۳ء

ہم آزاد ہیں

فرد ہو یا ملک تنہائی کا یارا بھی نہیں
بھائی چارے کے بہ جز کچھ اور چارہ بھی نہیں
ہم نے یہ مانا اکیلے میں گزارا بھی نہیں
بات ہو جائے کسی سے یہ گوارا بھی نہیں

ہم عجب آزاد ہیں ہم کس قدر آزاد ہیں
ہم زمانے سے بہ اندازِ دگر آزاد ہیں

آج کل دُنیا سمٹ کر ایک کاخ و کُو میں ہے
اک قدم لاہور میں ہے ایک ٹمبکٹو میں ہے
بم شکاگو میں، دھمک سارے ہنولولو میں ہے
لالہ مصری خان لیکن اپنی ہاؤ ہُو میں ہے

وہ یہ کہتا ہے کہ ہم مردانِ تُر، آزاد ہیں
ہم زمانے سے بہ اندازِ دِگر آزاد ہیں

آیئے اب گھر میں آزادی کا منظر دیکھیے
جُز بہ جُز بکھرا ہوا، دفتر کا دفتر دیکھیے
اپنی صورت اپنے آئینے کے اندر دیکھیے
شرم آئے گی مگر جانِ برادر دیکھیے

ہم تو آزادی سے بھی کچھ بیش تر آزاد ہیں
ہم زمانے سے بہ اندازِ دگر آزاد ہیں

خوابِ آزادی کی یہ تعبیر سمجھے ہیں ضمیرؔ
یار ماری، چور بازاری، سمگلنگ، دار و گیر
گھات میں بیٹھا ہوا ہے کیا پیادہ، کیا وزیر
اپنا اپنا کوہکن ہے، اپنی اپنی جوئے شیر

بے نیازِ امتیازِ خیر و شر آزاد ہیں
ہم زمانے سے بہ اندازِ دگر آزاد ہیں

۱۵۲۔ میکسن روڈ، راولپنڈی ——— ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸

میں رکھوالا

میں رکھوالا
اونچی لمبی کلغی والا
امن کا بھی قانون کا بھی
انگریزی پتلون کا بھی
انگلستان کا شاہِ زمن
اس کے تاج و تخت پہ قرباں
میرا تن ـــــ
لوگوں کا دَھن

تخت پہ جو بھی راج کرے

بندہ اپنا کاج کرے

پرجا بھری کچہری میں

کھڑکی دار کٹہری میں

اُجلا صاف لبادہ ہو

علم سے ٹھاٹھ زیادہ ہو

کلکتے سے لاٹ آئے

دو گھوڑے کی لمبی چوڑی چکنی بمبو کاٹ آئے

باتیں فرفر کرتا ہے۔"یس سر۔یس سر" کرتا ہے

(بگ ہولڈن سے ماخوذ) ———————— ۱۹۵۳ء

ڈاکٹر کا نسخہ

ڈاکٹر نے اک مریضہ سے کہا
غسلِ آبِ صاف روزانہ کرو
پیرہن اُجلا رہے
صبح کو تازہ ہَوا کھایا کرو
بیوی نے گھر آ کے شوہر سے کہا
ڈاکٹر کہتا ہے رِم جھم ساریاں پہنا کرو
بازؤں کو پور تک گہنا کرو

سردیوں میں ایک لمبا پُرسکوں بحری سفر
بحرِ اوقیانوس کے بانکے جہازِ خاص پر
گرمیوں میں 'سَیرگاہِ برف' میں جایا کرو

اور جب
لوُٹ کر آیا کرو
نبض دکھلایا کرو

فندق الخلیج ۔ مسقط ——————— (انگریزی سے ماخوذ)
۲۱ اگست ۱۹۸۴ء

جشن مسند نشینی

[بنگال کے گورنر سر ولیم گرے (GREY) کی ڈیوڑھی میں لٹکانے کے لیے]

تیری مسند نشینی کا دن آگیا
سب سلامی کریں
دھوم دھامی کریں
نیک نامی کریں
ہوں ضیافت کی پُر جوش تیّاریاں
دعوتیں پیاریاں
کام کی یاریاں

ہم اکٹھی کریں شہر و دیہات سے
نرم تن بکریاں
مرغ ماہی کی سالم 'کڑاہی' چلے
تاکہ تیری نمائش فروزاں رہے
تاکہ اپنی ستائش کا ساماں رہے
کارِ مشکل کریں بھی تو آساں رہے
یہ نہ سوچا کبھی
ان غریبوں ___ غلیظوں ___ مریضوں کے
تاریک ماحول میں
'تاجِ زر' جگمگانے سے کیا فائدہ !
جشنِ عشرت منانے سے کیا فائدہ !

(سیسل ریڈن) ____________ ۶۱۸۶۷

❋

آگ جب تک جلے نہ جانوں میں
آنچ ڈھلتی نہیں ترانوں میں

وعدۂ یار جاں فزا ہے — مگر
پھول کھلتے نہیں چٹانوں میں

خواب کے نرم تار کیا ٹوٹے
تیر بھی مڑ گئے کمانوں میں

آدمی بھی تو کیڑیوں کی طرح
بٹ گئے تنگ خانوں میں

نسلِ نَو کو سدھارنے کے لیے
مدرسے کُھل گئے ہیں تھانوں میں

لوگ اب یوں گھروں میں رہتے ہیں
جس طرح بوتلیں دکانوں میں

پیر صاحب کی گفتگو سن لی
کچھ زمینوں، کچھ آسمانوں میں

دوستوں کی منافقت، جیسے
کوکو کولا ــــ شراب خانوں میں

ہم نے دیکھا ضمیر صاحب کو
سرکشیدہ تھے درمیانوں میں

سہیلی بُوجھ پہیلی

اگر پھر کبھی وہ ترے پاس آئے
انگوٹھا اٹھا کر ــــ انگوٹھی بٹھائے
نہ کھائے نہ گائے
نہ تجھ کو ہلائے ، نہ خود کسمسائے
کسی ملک کی اجنبی ریختہ میں
محبّت جتائے

نگاہوں سے تم اس کا قد ناپ لینا
اگر قامتِ یار چھ فٹ سے کم ہو
تو پیاری سہیلی اسے ہاں نہ کہنا
کنواری ہی رہنا!

اگر ہونٹ اس کے گلابی نہیں ہیں
غرض مند آنکھیں شرابی نہیں ہیں!
نظر میں سندیسے جوابی نہیں ہیں!
ارادوں کے رُخ نیم خوابی نہیں ہیں!
خیالوں کے چہرے کتابی نہیں ہیں!
نہیں ہاتھ اگر اس کے اُجلے اچھوتے
کہ جیسے
نئی برف ہو اپنی کوہِ مری میں
ملاحت نہیں، خوش بیانی نہیں ہے!
صباحت کی چھب بھی سہانی نہیں ہے!
حمائل گلے کی پرانی نہیں ہے!

بزرگوں کی کوئی نشانی نہیں ہے!
تفکّر تو ہے، ترکمانی نہیں ہے!
نظر میں شفق آسمانی نہیں ہے!
بھرے بازوؤں میں گرانی نہیں ہے!
کسی کام کی وہ جوانی نہیں ہے
تو پیاری سہیلی اسے ہاں نہ کہنا
کنوّاری ہی رہنا!

اگر ساگ خوش ہو کے کھاتا نہیں وہ
منوہر تو ہے، مُسکراتا نہیں وہ!
مکمّل کبھی ہاتھ آتا نہیں وہ!
کسی چیز سے رُوح رغبت نہ رکھّے!
نہ پھُولوں کو دیکھے!
نہ میووں کو چکھّے!
گدُاز اس کی دھڑکن میں بولے تو کیسے!
کہ ابیات باہو کے گاتا نہیں وہ!

نہ پھیلا عبث اپنی جھولی کو بھولی !
تراشے ہوئے سنگِ ابیض کے آگے
سمٹتا نہیں وہ — سماتا نہیں وہ !
تو پیاری سہیلی اسے ہاں نہ کہنا
کنّواری ہی رہنا !

وہ آئے اور اس کم سخن کے لیے تُو
ٹرالی سے پیالی میں چائے بنائے
سموسے کھلائے
جوار اور جَو اور مکّی کے دانے
مشینوں میں چھانے
بھُنے اور بھُنائے
مگر وہ
نہ دیکھے نہ کھائے
کوئی روز مرّہ کا اخبار لے کر
سیاسی مسائل کے افکار لے کر

معاشی وسائل کے انبار لے کر
ترے نرم صوفے میں دھم ڈوب جائے
(کمر تا قدم — کم سے کم — ڈوب جائے)
وہ خود ڈوب جائے، تو اس کی بَلا سے
عرب ڈوب جائے عجم ڈوب جائے
تو اے جان — اے میری معصوم روزی!
یہ سمجھو کہ ہے کوئی مصروف بندہ

امیرِ ریاست
وزیرِ وزارت
شہیرِ سیاست
خطیرِ خطابت
مدیرِ صحافت
مشیرِ مشقّت
نفیرِ ثقافت
حجیرِ[1] حجامت

---

[1] حجّام کا سہل ترین تابع مہمل

کسی محکمے کا دبیر و سکتّر
بُہتّر تہتّر
کوئی رکنِ ایوانِ بالائے بلّی
کہ چوُہوں میں بلّی
کوئی پشت در پشت ممتاز شہری
طبیعت کا لہری
کوئی لکھ پتی سیٹھ — صابون والا
کہ دَھن بھی ہے کالا تو دِل بھی ہے کالا
نہیں تر نوالہ
کوئی زر نوالہ
تو اے جان! اے میری معصوم روزی!
یہ تم جان لینا
کہ وہ ہے مفکّر، مصوّر، سخن ور
خود اپنی تہوں کا نہفتہ شناور
خیالوں کا خلّاق — جذبوں کا داور
گھڑی میں پشین اور گھڑی میں پشاور

سَما کا سمندر
خلا کا مسافر
جو سُوکھا ستمبر تو بھُوکا نومبر
دَما دَم قلندر
تو اے جان اے میری معصوم روزی!
اسے ہاں نہ کہنا
کنواری ہی رہنا ——————— (انگریزی سے)

کالے چھپرے کا مرثیہ

یہ نظم کراچی ہوا میدان کے قریب ہوائی جہازوں کے وسیع و عریض آہنی اصطبل کے مسمار کیے جانے پر لکھی گئی۔

یہ بلند و بالا ڈھانچا جو عرفِ عام میں "کالا چھپرا" کہلاتا تھا، کراچی کی شاہراہ پر ایک معروف نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں میرے مکرّم دوست کرنل مقبول الٰہی درویش نے وزارتِ دفاع کے فیصلے کے مطابق اس کو نیلام کیا۔ جن دِنوں اس چھپر کی آہنی چمڑی ادھیڑی جا رہی تھی راقم الحروف ڈرگ روڈ چھاؤنی میں اس کے سایۂ عاطفت میں رہتا تھا۔ (ض)

کالے چھپرے کی جو کل جامہ دری ہونے لگی
جعفریؔ کے گھر کے آگے "جا فری" ہونے لگی
برہمی سے شاعری میں نغمگی ہونے لگی
یعنی اس لوہے سے یہ چاندی کھری ہونے لگی

اُس طرف چھپّر کا اک اک تارِ جاں بجنے لگا
اِس طرف نغموں سے شاعر کا مکاں بجنے لگا

آہ وہ "چھپرا" ـــــ کراچی کا پُرانا مہرباں
شہر کا مکھڑا ـــــ سوادِ شہر کا قومی نشاں
سندھ میں سابق فصیلِ کشورِ ہندوستاں
آہن و فولاد میں انگریز کا "چنگیز خاں"

شام کے صحرا میں وہ گویا چراغِ شام تھا
شہر اپنا مصر تھا وہ مصر کا اہرام تھا

وہ جہازوں کا دلیلِ راہ بلکہ سربراہ
آہ وہ "پی آئی اے" کی "ہائی وے" کا بادشاہ
کس کو جنگشاہی سے ڈھونڈے گی مسافر کی نگاہ
کون ہوگا اب کراچی کی حقیقت پر گواہ

پائیں گی اب کس کی دیواروں کے سائے میں اماں
ادھ بسی آبادیوں کی گائیں بھینسیں بکریاں

قیمتی لوہے کا زنگ آلود مینارِ بلند
قصرِ قیصر بے ضیا، سلطانِ جابر درد مند
کھویا کھویا، سویا سویا، رویا رویا، بند بند
اپنی اُردو شاعری کی طرح طبعاً غم پسند

ظرفِ عالی سے تہی آغوش بھی خاموش تھا
فقر و استغنا میں اِک درویش کمبل پوش تھا

"کالا چھپرا" اب چھپرکھٹ سے نکالا جائے گا
جو سنبھلنے میں نہ آتا تھا — سنبھالا جائے گا
پیچ، پیمانوں میں — پُر، پُرزوں میں ڈھالا جائے گا
آنے والا آئے گا، اور جانے والا جائے گا

زندگی — اِک ہاتھ آگے کانپتا بلّور ہے
آدمی — دو گام پیچھے ہانپتا مزدور ہے

بنگلے کا ڈھانچا

راقم الحروف کو ملازمت کے دوران میں کچھ عرصہ راولپنڈی میں 'ریس کورس' کے نواح میں ایک عارضی چوبی گھروندے (HUT) میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس 'گھروندے' کا منظوم احوال ایک نظم میں جو 'ضمیر کا گھر' کے عنوان سے میرے مجموعۂ کلام 'مافی الضمیر' میں شامل ہے بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم کی پیش کش کے بعد اربابِ اختیار کی طرف سے ہمیں جس بنگلے سے نوازا گیا، اس کی جھلک ذیل کے اشعار میں پیش کی گئی ہے۔ (ضمیرؔ)

ٹین کے چھجّوں سے دو کمرے ہیں بنگلائے ہوئے
جیسے انڈوں پر ہوں پَر مرغی نے پھیلائے ہُوئے
اک کھلا در ہے جو کُھلتا ہے کھلے میدان میں
گھر میں بھی رہتا ہوں پوری قوم کے گھمسان میں
پردۂ دیوار تا حدِّ نظر ــــــ کچھ بھی نہیں
زلیست اس منزل میں جُز ذوقِ سفر ـــ کچھ بھی نہیں
کھیلتے ہیں گیند بَلّا بھی یہیں مردانہ وار
لال کُرتی کے حنیف و امتیاز و کاردار

دیدنی ہوتا ہے منظر ضربِ تند و تیز پر
"فیلڈر" میرے کچن میں، گیند میری میز پر

ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی طرح پھرتی ہیں یہاں
چھاؤنی بھر کی سہاگن، گائیں، بھینسیں، بکریاں

ماجرا کیسے کہوں دیوار و در کے رنگ کا
مُنھ کو آپہنچا کلیجہ چوب و خشت و سنگ کا

یہ مکاں، یہ مغربی تہذیب کا لختِ جگر
چہرہ روشن — اندروں چنگیز سے تاریک تر

ہم سے پہلے جن کے زیرِ پا تھی یہ 'خلدِ بریں'
وہ نکل جانے پہ بھی پوری طرح نکلے نہیں

اس کی دیواروں پہ مُرغے ہیں، کواڑوں پر حساب
لکھ گئے ہیں ان کے بچّے سب سوالوں کا جواب

چپّا چپّا اس مکاں کے استخوانِ پیر کا
نقش فریادی[۱] کسی کی کاپیتی، تعمیر کا

۹۴- یونیک روڈ، راولپنڈی چھاؤنی
———— ۱۹۵۴ء

۱؎ غالبؔ کے ایک مصرعے میں وحشیانہ تصرّف

نُورن کے نام

(شملے سے ایک خط)

شملے کے مناظر دیکھ ذرا ہر چیز ہے ناہموار یہاں
ہر وضع کا سنت جہنت یہاں، ہر قطع کا دنیا دار یہاں
انسان یہاں، لنگور یہاں، انگریز یہاں، سرکار یہاں
اونچے اونچے دیودار یہاں، ٹیڑھے میڑھے بازار یہاں
نُورن! میری پیاری نُورن آتو بھی کبھی اک بار یہاں

تُو آئے تو اس کافرنگری کی نئی نئی باتیں دیکھے
دھندلے دھندلے سے دن دیکھے روشن روشن راتیں دیکھے
ہر باسی تازے چہرے پر غازے کی کراماتیں دیکھے
جاگی — چت لاگی راتوں میں من موہن کاروبار یہاں
نُورن! میری پیاری نُورن آ تو بھی کبھی اک بار یہاں

کب اپنے منڈی میلے میں شملے کی 'مال' کے نظّارے
انگریز کی خوش بختی، خوش وقتی اور اقبال کے نقارے
گجرات کی مدھ ماتی آنکھیں، زلفِ بنگال کے نظّارے
پنجاب کے کڑیل مرد یہاں، دکّن کی سلونی نار یہاں
نُورن! میری پیاری نُورن آ تو بھی کبھی اک بار یہاں

اُڑتی ہُوئی برف کے ریشم پر پڑُوپ سروپ اُجالوں کے
چلتے ہوئے جادو منظروں کے تپتے ہوئے تختے گالوں کے
چاندی کی چمک میں مدّھم مدّھم چہرے رِکشا والوں کے
رِکشا کے اندر ایک یہاں، رِکشا کے باہر چار یہاں
نُورن! میری پیاری نُورن! آ تو بھی کبھی اک بار یہاں،

ہر رام سرن، ہر رام چرن، ہر دریودھن ہے شملے میں
دِلّی کا ہر اک اونچا صاحب، مع میم مٹن ہے شملے میں
پنجاب سے بھی اک آدھ وُزیرِ خوش ایکن، ہے شملے میں
سجتے ہیں بھرے بازار یہاں، لگتے ہیں بڑے دربار یہاں
نُورن میری پیاری نُورن آ تُو بھی کبھی اک بار یہاں
ٹاٹوں سے نکل کر دیکھ کبھی تُو بھی "لِسنٹاٹوں"[1] کی بستی
یہ کھیل تماشوں کا میلا، یہ سیر سپاٹوں کی بستی
دیسی سمراٹوں کا رمنا، افرنگی لاٹوں کی بستی!
ہر شام ہے شامِ بہار یہاں ہر رات شبِ بیدار یہاں
نُورن میری پیاری نُورن! آ تُو بھی کبھی اک بار یہاں

دارالسلام۔ (ٹوٹی کنڈی) ——————— ۱۹۴۳ء

---

[1] لِسنٹاٹ: شملے کی ایک طرب گاہ

اُلّو اور بُلبل

دانا ہی سہی
اُلّو سے نہ رائے مانگ کبھی ——
سُننی ہے تو سن ——
مَن بانی —— شاخ پہ جھُولتی گاتی بُلبل کی
یا —— سبزہ و گُل میں گھلی ہوئی
اور رِکھلی ہوئی
ست رنگ پَروں کی لاٹی[1] سے
اس بے فکری دیوانی سے

---

[1] آسٹن کی "لارک" کو "لالی" بنا لیا۔

مستانی کلغی والی سے
تجھے آس ملے
تری پیاس بجھے
تسکین، سُرور، مٹھاس ملے
جیسے شاعر کے بول کر من میں جا اُتریں
اور 'بور' کتھا پرچارک کی

(انگریز شاعر آسٹن سے ماخوذ) ———— ۸ جولائی ۱۹۸۲

الوداع دندانِ ما

ذیل کے اشعار 'برزخ' کے اس عرصے میں لکھے گئے جب اصلی دانت نکلوائے جا چکے تھے اور مصنوعی دانت لگائے نہیں گئے تھے۔ (ص)

رخصت اے میرے اصلی دانتو!
اصلی، وصلی، نسلی دانتو!
اے میری سابق بتیسی
ساٹھ برس تک چکّی پیسی
کُلچے، تکّے، آلو، چھولے
گنّے، گنڈے، سخت اور پولے
موٹھ، مرنڈے، مرغی داتے
لڈو، پیڑے، مٹر، مکھانے

پان پروسے ، چاٹ کھلائی
ہر موسم کی چوگ چگائی
روٹی ، بوٹی ، مُرغ ، پلاؤ
سر بکرے کا ، دُمچہ گاؤ
رسّے کاٹے ، ڈنٹھل توڑے
دانت درانتی ، دانت ہتھوڑے
لوہا ، پتّھر ، سخت نوالہ
کُٹ کُٹ کترا ، منھ میں ڈالا
قصرِ شکم کی ڈیوٹی کرنا
خالی کرنا اور پھر بھرنا
بند درازیں ، تیز کٹاری
منھ پھاٹک کی چوکیداری
دائیں بائیں — ہلتے والی
دو اک داڑھیں تھیں ہڑتالی
ظاہر سالم ، باطن خالی
جیسے جادوگر کی تھالی

وائے غفلت، اُف نادانی
کارگروں کی قدر نہ جانی
اُٹھّے، بیٹھے، جاگے، سوئے
داڑھ نہ مانجھی۔ دانت نہ دھوئے
دانتوں سے تھی شوبھا ساری
بجُھ گئی چہرے کی پھُلواری

لوگ کرے ہیں کانا پھُوسی
دیکھو آم کی گٹھلی چُوسی
شکل ہوئی حیا پانی اپنی
ہنسی لگے کھسیانی اپنی
بابا بابا کہہ کے پکاریں
'گڑیاں' کیا— پختہ مٹیاریں
بول ہوئے بے تول ہمارے
کون اب بیٹھے 'کول' ہمارے
'چ' بولو تو چُوک بہت ہو
'تھے' میں 'تھ' کم 'تھُوک' بہت ہو

ب میں کوئی بندوق چلے ہے
ک میں لمبی ہوک چلے ہے
مسندِ شعر پہ آ تو براجے
دانت بنا اب تانت نہ باجے
گیا ترنّم کا وہ افسوں
شعر پڑھوں تو شُر شُر شوں شوں
پیاس لگی تو شاعر بولا
کو کو کو کو ــــ کو کا ــــ کولا
ہم یہ بولے ــ "چائے بیگم"
بیگم بولی ــــ "ہائے بیگم؟"
ہم نے کہا ــ "رومال اٹھاؤ"
بیگم بولی ــــ "دال پکاؤ؟"

کچھ اعضا ــ منھ زور بہت تھے
جسم کے اندر چور بہت تھے

دادا جان

اپنے تنہا کمرے میں
دل ویران — نظر سنسان
وہ بیٹھے ہیں دادا جان

باسی خبر

اک سیاست دان نے
اک جریدے کے ایڈیٹر سے کہا
آپ کے اخبار نے لکھا کہ میں
اپنے پیندے پر کھڑا رہتا نہیں
اپنی رائے برملا کہتا نہیں
اس لیے خوش حال ہوں

کیوں کر بازارِ سیاست کا بکاؤ مال ہوں
سن کے یہ شکوہ — ایڈیٹر نے کہا
ہے عبث مجھ سے گلہ
یہ بھٹیچر چیتھڑا ہو گا کوئی
میرے پرچے میں کوئی باسی خبر چھپتی نہیں

(انگریزی سے) ———————— ۱۹۸۳ء

٭

ہم 'نیوٹرل' ہیں خارجہ حکمت کے باب میں
"نے ہاتھ باگ پر ہیں نہ پا ہیں رکاب میں"

یوں کانپتا ہے شیخ خیالِ شراب سے
جیسے کبھی یہ ڈوب گیا تھا شراب میں

اس بات پر بھی ہم نے کئی باب لکھ دیے
جو بات رہ گئی تھی خدا کی کتاب میں

تنقیدِ جام و مے تو بہت ہو چکی حضور
اب کیا خیال ہے غمِ ہستی کے باب میں؟

رِندوں کی بے ہُشی بھی خبردار چیز تھی
اکثر جھگڑ پڑے ہیں حساب و کتاب میں

لُطف اِس مشاعرے میں ملا کاک ٹیل کا
جمنا کا رس بھی آن ملا ہے چناب میں

ؔ یہ اشعار ۱۹۵۳ء میں گارڈن کالج راولپنڈی کے جشن طلائی کے مشاعرہ کے لیے کہے گئے۔ اس مشاعرے میں ہندوستان سے اُردو کے بزرگ شاعر پنڈت تلوک چند محرومؔ اور اُن کے سپوت نامور شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ شریک تھے۔

شوہر فریادی

کر لی شادی
قید کڑی اور بے میعادی
ختم ہُوا سب دھوم دھڑکّا
آدم زادہ ہکّا بکّا
سلب ہوئی ساری آزادی
کر لی شادی

اکثر تو چُپ چُپ رہتا ہے
کہتا ہے تو یہ کہتا ہے
بیوی سے شوہر فریادی
انتِ مولا ــــ انتِ ہادی

ہم روتے ہیں

(بنگال کے گورنر "ہالی ڈے" کے بارے میں)

جب ہالی ڈے آتا ہے
تو چین ہمارا جاتا ہے
جنگل میں منگل ہوتا ہے
کھیل تماشے
ڈھولک تاشے

کمپ میں سب کچھ ہوتا ہے
'ہالی ڈے' سوتا ہے

معتبرین
پہنے اپنی دیسی 'جین'
آتے ہیں
پھولوں کے ہار پروتے ہیں
وہ ہنستے ہیں
ہم روتے ہیں

(دیگ ہولڈن)———— ۶۱۸۵۴

غروبِ آفتاب کے بعد

گیا میں اتفاقاً کل جو اک تصویر خانے میں
تو سر 'ہربٹ[1] ایمرسن' مل گئے کل چار آنے میں
وہی تصویر جو پہلے بہ حرمت کام آتی تھی
کچہری میں، کلنڈر میں، شفا خانے میں، تھانے میں
کہیں 'مسرور' موتی چور ایوانوں کی زینت تھی
کہیں یہ لازمی تھی دفتروں کے دفترانے میں
وہی اب ٹنگ رہی تھی اک کباڑی کے دریچے پر
وہی اب بِک رہی تھی اور بہ منّت، چار آنے میں

(مری) ——————— ۱۹۴۸ء

[1] سر ہربرٹ ایمرسن: صوبہ پنجاب کا ایک انگریز گورنر

سوزِ غم، جوشِ جنوں، عشقِ بتاں رہنے دیا
یعنی دل میں اک نہ اک چنگیز خاں رہنے دیا

مدرسوں میں بند کر کے حلقۂ اربابِ ذوق
مطبخوں میں حلقۂ باورچیاں رہنے دیا

ایشیا کے مطمئن بندوں کی یارب داد دے
ابر کو ابر — آسماں کو آسماں رہنے دیا

ایسی نازک پرورش، اتنی ملائم تربیت
ہم نے شاہیں میں کبوتر بھی کہاں رہنے دیا

اب وہ حسرت ہو کہ حیرت ہو کہ عبرت ہو ضمیرؔ
ہم وہیں رہنے لگے اس نے جہاں رہنے دیا

—————— ۱۹۶۳ء

او دیس سے آنے والے بتا!

(شاعرِ رُومان حضرت اختر شیرانی کی ایک مقبول نظم کی تقلید میں۔ ضمیر)

او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یارانِ وطن!
کیا اب بھی وہی دو شنبے کو 'راشن' کے ذخیرے کھُلتے ہیں
مٹّی کے مرکّب، گندم کیا سونے کے برابر تُلتے ہیں
دو چُٹکی چاول کی خاطر چھ چھ دن رُلتے گھُلتے ہیں
پتلے 'فضل الدّینانِ وطن' موٹے 'بدری ناتھانِ وطن'

او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یارانِ وطن!
کیا مُہر بہ در تہ خانوں میں ہیں بنیوں کے گودام اب بھی
من میں ہے لوبھ کی چاہ وہی اور لُوٹ کھسوٹ ہے عام اب بھی!

لڑتا ہے کسانوں کی خاطر چھوٹا سا 'چھوٹو رام'[1] اب بھی!
اُس جاٹ سے کیا دیتے ہیں ابھی وہ "لالۂ رُخ لالانِ وطن"

او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یارانِ وطن!

اب بھی جنگی[2] مہنگائی سے مخلوقِ خدا بے تاب سی ہے!
ہر کالی رات غریبوں کی، بے چین سی ہے، بے خواب سی ہے!
تمباکو بھی ناپید سا ہے اور ماچس بھی نایاب سی ہے!
اور حُقّہ پینا فرضِ وطن، ہاں دینِ وطن، ایمانِ وطن

او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یارانِ وطن!

کچھ گاؤں کی باتیں، کیا اب بھی منگلا پر بادل چھاتا ہے؟
روہتاس میں بیساکھی رُت میں میلا اب بھی بھر جاتا ہے؟
بصرے اور سنگاپور سے پلٹن والوں کا خط آتا ہے؟
وہ کھیت میں رستم خانِ وطن اور گھر میں "ریشم جانِ وطن"؟

(شملہ) ——— ۱۹۴۲ء

---

[1] متحدہ پنجاب میں سر سکندر حیات کی کابینہ کے وزیر چوہدری سر چھوٹو رام جو کسانوں کے ہمدرد تھے۔
[2] دوسری جنگِ عالمگیر۔

چوری کا مال

اِک مردِ مجرّد کے گھر سے
چوروں کے ہاتھ جو مال آیا
اس مال کو دیکھ کے
بیاہے ہوؤں کو حال آیا
رنگین 'بلاؤز' جاپانی
مسکے مسکے — درقے درقے

کچھ شب جامے
درکے ــــ درکے
کچھ نیم شلوکے یونانی
جن سے جھلکے گوری کا بدن
آویزے ــ فرغل ــ بال کلپ
اُودے اُودے ، دھانی دھانی
اس مردِ مجرّد کے گھر سے
ہر شَے نکلی ــــ نامَردانی

ــــــــــــــ ۱۹۸۲ء

ایک آرزو

کاش اُن سے یوں ملاقاتیں کریں
کُلبلاتی ہیں جو دل میں صبح و شام
کھول کر دل ــــ پیار کی باتیں کریں
شب کی چلمن صبح تک جاگی رہے
صبحوں کو
زلفوں کی چادر ڈال کر راتیں کریں

ہوں نہ اپنے درمیاں
یہ زمین و آسماں
کوئی شے باہر نہ ہو ' اندر نہ ہو
چُپ رہے اس کی کلائی کی گھڑی
اور دیواروں پہ کیلنڈر نہ ہو

گیلا چیک

اِک بنک میں اِک بیاہی عورت
'چیک' لائی کیش کرانے کو
'چیک' گیلا تھا
نَم دیدہ ـــــ نیلا نیلا تھا
بابو نے جو اس کا سبب پوچھا
عورت بولی
میرے شوہر نے جب 'چیک' لکھا
اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے

(انگریزی سے ماخوذ) ـــــــــــ مسقط۔ ۲۰ اگست ۱۹۸۳

رہگزر

پانی یا شراب ہو
پی گئے
کھا گئے
ساگ کی پرات ہو
مولیوں کے پات ہوں
چَر گئے
پھر جناب مر گئے

(جاپانی ادب سے) ———— ۱۷ جون ۱۹۸۳

سرِ راہ گزر

سرِ راہ گزر
اِک بھک منگا یہ کرے صدا
ہاں نامِ خدا
کر دس دس کے چھ نوٹ عطا
مرے پاس میاں!
نے آنا ہے، نے ہلدی ہے
اور گھر جانے کی جلدی ہے

(فندق الفلج۔ مسقط) ——————— ۱۹۔ اگست ۱۹۸۳

مِسز ولیم

مِسز ولیم، عجب انداز کی خاتون تھی یارو
کبھی مکھّن، کبھی پتّھر، کبھی صابون تھی یارو

فرانسیسی مِلی انگریزیوں میں بات کرتی تھی
وہ دِن گلیوں میں پھِرتی تھی، کلب میں رات کرتی تھی
تکلّم میں پُرانی بُلبلوں کو مات کرتی تھی
گئی گزری سہی — لیکن گزر اوقات کرتی تھی

تلوّن کیش اتنی — جنوری میں جُون تھی یارو
مسز ولیم، عجب انداز کی خاتون تھی یارو

وہ آنکھیں بحرِ اطلانتک کے نیلے پانیوں جیسی
بدن یونانیوں جیسا، نظر مصرانیوں جیسی

جوانی میں بکنگھم کی حسیں مَلکانیوں جیسی
صلابت کم گندھے میدے کی باقرخانیوں جیسی
طبیعت نا ملائم — مستقل استانیوں جیسی
وہ خود منصف بھی، خود مجرم بھی، خود قانون بھی یارو
مسز ولیم، عجب انداز کی خاتون بھی یارو

فرنگ و ایشیا میں بانکپن مشہور تھا اس کا
دلوں میں آگ سُلگانے کا فن مشہور تھا اس کا
دَہن معدوم تھا لیکن سخن مشہور تھا اس کا
وہ جب گبھرُو نہ تھی اس وقت بھی گبھرُون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

بڑی بی زندگی سے والہانہ پیار رکھتی تھی
رسیلی آنکھ، تازہ روغنی رُخسار رکھتی تھی
گھڑی، پرس، اور چھتری ہر گھڑی تیار رکھتی تھی
گھر انگلستان میں، عاشق سمندر پار رکھتی تھی

وہ کھانا بے حساب اس کا وہ پینا بے ہراس اس کا
بھرا رہتا تھا ہر مشروبِ رنگیں سے گلاس اس کا
بدلتا تھا بہر تقریب غازہ اور لباس اس کا

کبھی گھگرا — کبھی پتلون ہی پتلون تھی یارو
مسز ولیم ، عجب انداز کی خاتون تھی یارو

زباں زد عام تھیں لندن میں خوش اندامیاں اس کی
انوکھی تھیں ہر اک مادام سے مادامیاں اس کی
کئی تھانوں کے اندر مشتہر تھیں خامیاں اس کی
کہ شہزادوں سے بھی منسوب تھیں بدنامیاں اس کی

ابھی دانتوں میں تھیں موتی کی لڑیاں لوچ باہنوں میں
ابھی کچھ ساحلی کونجوں کی حسرت تھی نگاہوں میں
وہ اس سن میں بھی اک سروِ رواں تھی سیرگاہوں میں
کبھی لندن ، کبھی دہلی کبھی رنگون تھی یارو
مسز ولیم ، عجب انداز کی خاتون تھی یارو

شبِ آدینہ جب سرجان ینگ آتے تھے گھر اس کے
کئی کوٹھوں سے اُڑ اُڑ کر پتنگ آتے تھے گھر اس کے
بڑے نامی گرامی شیر جنگ آتے تھے گھر اس کے
ملنگ آتے تھے اور پی پی کے بھنگ آتے تھے گھر اس کے
گریجوایٹ' ایل ایل - بی' لفنگ' آتے تھے گھر اس کے

کئی شاعر فقط دیدارِ منگ آتے تھے گھر اس کے
رُسول سروسؔ کے مرغان و ملنگ آتے تھے گھر اس کے
پولس کے محرمانِ خشت و سنگ آتے تھے گھر اس کے
پہاڑی توپ خانے کے تفنگ آتے تھے گھر اس کے
امیر البحر نیوی کے تفنگ آتے تھے گھر اس کے
کئی جرنیل اپنے گھر سے تنگ آتے تھے گھر اس کے
زر و زیور جواہر رنگ رنگ آتے تھے گھر اس کے
شِلنگ آتے تھے اور بھرتے شلنگ آتے تھے گھر اس کے

وہ شب گردوں کے حق میں منتظر شب خُون تھی یارو
محلّے بھر کی افواہوں کا ٹیلی فون تھی یارو
مسز ولیم، عجب انداز کی خاتون تھی یارو
مسٹر ولیم کا ولیم اک برائے نام شوہر تھا
کثیر الحلم انساں تھا، مگر ناکام شوہر تھا
وہ اپنے عہد میں افیون کی پرچون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

——— (انگریزی سے ماخوذ)

کچھ اس دریا دِلی سے آج کل آرام کرتے ہیں
کہ تھک جاتے ہیں ہم جب لوگ کوئی کام کرتے ہیں

عبارت ہر لحد کی لوح پر لکھی نہیں جاتی
وہ خود گمنام ہیں جو نامیوں کا نام کرتے ہیں

پئے باغِ ارم بنجر گزار و زندگی اپنی
جو گُل چنتے ہیں پہلے پتّھروں میں کام کرتے ہیں

نہ دو سائنس کو الزامِ آتش آفرینی کا
خدا کے نام پر بھی لوگ قتلِ عام کرتے ہیں

کوئی اُن کے وصال و ہجر کی ترتیب کیا سمجھے
جو بعد اللّیل کا ہر کام قبل از شام کرتے ہیں

ہماری راہ مت دیکھو ــــ "ستارو تم تو سو جاؤ"
کہ ہم فی الحال ابنِ تیمیہ پر کام کرتے ہیں

"گلیمِ بُوذرؓ و دَلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ"
کئی بدبخت، اِس وِرثے کو بھی نیلام کرتے ہیں

نہیں شکوہ جنابِ شیخ ہی کی کج روائی کا
جو راون سے نہ ہو پایا وہ سیتا رام کرتے ہیں

محبّت اوّلین بوسہ تھا ــــ اس کے بعد شادی ہیں
اُسی بوسے کا استقلال و استحکام کرتے ہیں

اگر ہے اختلاف اتنا ہی اربابِ کلیسا سے
چلو ہم اپنا ابراہیم ــــ "اُبراہام" کرتے ہیں

نفاق و کذب و غیبت، ناامیدی، نارضامندی
ہمارے پاس جو کچھ ہے تمھارے نام کرتے ہیں

کرشمہ اِس صدی کا چین اور جاپان میں دیکھا
ربڑ کے لوگ ہیں اور کتنا 'لوہا کام' کرتے ہیں

(ڈیرہ شاہ جی، علی پور، ضلع مظفر گڑھ) ــــ ۱۰ فروری ۱۹۸۴

ضمیرظرافت

داخلِ دفتر ہونا

ہاتھوں پہ جو دیکھو گے تو دستانے بھی ہوں گے
شانوں پہ گراں کوٹ کے کاشانے بھی ہوں گے
پتلون میں سگرٹ کے لیے خانے بھی ہوں گے
آنکھوں پہ سبک شیشے و پیمانے بھی ہوں گے
لیکن غمِ دَوراں سے پریشاں ہے کلرکی
چہرے پہ کلرکوں کے نمایاں ہے کلرکی

غرّاتی ہے بیوی کہ غرارا مجھے لا دو
گوٹا نہیں ملتا تو کنارا مجھے لا دو
صلّو کے لیے چاند ستارا مجھے لا دو
بھلّو کے لیے 'تاج منارا' مجھے لا دو

یہ رات ہے وہ جس میں ستارے نہیں ہوتے
ہوتے بھی اگر ہیں تو ہمارے نہیں ہوتے

ملبوس ہے کالج کے زمانے کی کمائی
'بی اے' ہے اگر بوٹ تو 'ایف اے' نکٹائی
جو چیز بھی اچھی ہے، پرانی یا پرائی
بولا نہیں جاتا پہ کلرکی کی دہائی

سالم ہے پہننے کو نہ کھانے کو ہے پورا
فدوی ہے کسی سابقہ انسان کا چورا

بیوی سے بھی دفتر ہی کے افکار کی باتیں
ہر بات میں وہ حسرتِ لاچار کی باتیں
آساں نہ ہوئیں 'افسرِ دشوار' کی باتیں
ہائے وہ جمعرات میں اتوار کی باتیں

اوجھل ہوئے آنکھوں سے وہ اوراق ادب کے
بیگانہ ہوئے غالب و اقبال سے کب کے
ہونٹوں پہ کسی 'کیس' کی 'ارجنٹ کہانی'
ٹکتی ہی نہیں ناک پہ عینک کی کمانی
ڈھلکی ہوئی پتلون میں سمٹی سی جوانی
چہرہ ہے کہ جیسے کوئی فائل ہو پرانی
کالج کے شب و روز کا انجام کلرکی
انگریز کے دفتر کی یہ کم دام کلرکی

شملہ ——— ۱۹۴۲ء

سنگاپور

چینی اور ملائی دیکھے
یورپ کے ہرجائی دیکھے
چھل بل سارنگوں کے لہنگے
جتنے ہلکے اُتنے منھگے
چلپٹے ناک اور گہری آنکھیں
کالی، سبز، سنہری آنکھیں

ترشے گیسو، جھٹکے پھٹکے
گوش سے لٹکے دوش پہ اٹکے
تنگ لبادے، چمٹے چمٹے
اُٹھتے جوبن سمٹے سمٹے
سُرخی، مستّی، غازے دیکھے
باسی چہرے تازے دیکھے
پٹے ہوے جاپانی دیکھے
پتّھر پانی پانی دیکھے
بالی[1] کی متوالی دیکھی
رُوپ کی جوت نرالی دیکھی
سندھی تاجر — کاروباری
اُبھرے پیٹ بڑے بیوپاری
بنجارے پٹیالے والے
گُوجر — گوجرانوالے والے
شیشوں کے سوداگر دیکھے
ماڑی، محل، اُجاگر دیکھے

---

[1] انڈونیشیا کا خوبصورت جزیرہ

تارا سنگھ[1] کا لشکر دیکھا

گلی گلی امرت سر دیکھا

ق

رکشا، موٹر، لاری والے

پہرے چوکیداری والے

موجیں دیکھیں، دھارے دیکھے

بجرے اور شکارے دیکھے

گھاٹ کو دیکھا پاٹ کو دیکھا

ماؤنٹ بیٹن[2] لاٹ کو دیکھا

ہالینڈ پارک، سنگاپور ——— ۲۲ ستمبر ۱۹۴۵

---

۱ سنگاپور میں سکھ فرقے کے لوگ کافی تعداد میں آباد ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر ٹرانسپورٹ اور چوکیداری کا کام کرتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بڑے بڑے سوداگر بھی موجود ہیں۔ ہندوستان میں ماسٹر تارا سنگھ اس قوم کے لیڈر۔

۲ ایڈمرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن جو دوسری عالمی جنگ میں، جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے سپریم کمانڈر تھے۔ ان کا ہیڈکوارٹر سنگاپور میں تھا۔ لارڈ مونٹ بیٹن بعد میں ہندوستان کے آخری انگریز وائسرائے ہوئے۔

٭

جا وا نظر آتا ہے برما نظر آتا ہے
معشوق کے چہرے پر کیا کیا نظر آتا ہے

خالِ رُخِ جاناں کو آواز ذرا دینا
چہرے پہ تو ملبا ہی ملبا نظر آتا ہے

وہ فرطِ ارادت سے عاشق کا بِچھے جانا
اور اُن کا یہ فرمانا — کُبڑا نظر آتا ہے

اوّل تو محبّت میں محبوب نہیں ملتا
ملتا ہے تو جلوہ بھی پردہ نظر آتا ہے

بیداداری کیمپ، سنگاپور ——— ۱۹۴۵ء

ریل پیل

الیکشن کے لیے پر تول کر تیار ہیں لیڈر
اگر بے کار تھے پہلے تو اب ’با کار‘ ہیں لیڈر

قیادت کی علامت صرف دولت یا امارت ہے
وہ ساہوکار ہیں لیڈر یہ ٹھیکیدار ہیں لیڈر

زباں ایوان میں جا کر جو سِل جائے تو سِل جائے
مگر بازار تک تو گرمیِ بازار ہیں لیڈر

سنبھل اے قوم اب یہ لیڈروں کا دَور چالو ہے
جو گھر میں تین رہتے ہیں تو ان میں چار ہیں لیڈر

۱۹۷۹ء ——————

دل عبث بدنام ہے

دل عبث بدنام ہے ناصح عبث بدنام ہے
دل کا اپنا کام ہے ، گُردے کا اپنا کام ہے

فکرِ صبح و شام ، نے پروائے ننگ و نام ہے
عشق اگر یہ ہے تو یہ سب سے بڑا آرام ہے

پیچ اندر پیچ ہے ' ابہام در ابہام ہے
آپ کا خط 'لارڈ ہیلی فیکس' کا پیغام ہے

ابتری تو نقش و حرف و صوت پھیلاتے رہیں
'شارعِ قائد' کا "ٹیلر ماسٹر" بدنام ہے

ایک نعرہ داغ کر لیڈر نے لوگوں سے کہا
ہم یہاں کام آ گئے آگے تمھارا کام ہے

اس سے زعمِ دوستی ہے جس نے میرے نام پر
یہ کہا — "ہاں ہاں کوئی جغرافیے کا نام ہے"

اتنا سورج، اتنے صحرا، اتنی دھوپ، اتنی تپش
ایشیا کی سرزمینِ خام پھر بھی خام ہے

کچھ خرابی ہے ہمارے شہر کی تعمیر میں
گھر میں آٹا کم ہے، بازاروں میں جلوہ عام ہے

آرزوئیں جنگ میں اُجڑے ہوئے شہروں کے گھر
دل ہے یا امریکنوں کا 'بم زدہ ویتنام' ہے

مدتوں سے اہلِ محفل کو ہنساتا ہے ضمیرؔ
ہو نہ ہو یہ شخص رہنِ گردشِ ایام ہے

۲۲۲۔ کلائیڈ روڈ ————— ۷ مئی ۱۹۵۰
راولپنڈی چھاؤنی

نئی وزارت کے لیے دُعا

(وزارتوں کے بننے اور ٹوٹنے کی ریل پیل میں)

یہ وزارت خلوص کی تصویر
یہ حکومت حیات کی تدبیر
یہ سلامت رہے ہزار برس
ہر برس کے ہوں دس ہزار وزیر

———— ۱۹۵۴ء

وقت کا فتویٰ

تیغِ تاتاری ہوئی بغداد پر جب بے نیام
مُفتیانِ فرع میں برپا تھی اک جنگِ کلام
دیکھ کر یہ وقت کے ظالم مورّخ نے کہا
مرغیاں را مژدہ کارِ ملّتِ بیضا تمام

۱۹۵۳ء

شیر اور کھال

(مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی شکست پر)

معجزہ صادر ہوا کیا دیکھیے بنگال سے
شیر[1] پھر باہر نکل آیا ہے اپنی کھال سے

پھیر لیے منھ میر و مومن غالب و اقبال سے
اب تو بھاشانی[2] کی بھاشا گائیے سُر تال سے

غیر ممکن تھا کہ مسلم لیگ کو ہوتی شکست
ہاں مگر خود اس کے اپنے نامۂ اعمال سے

بات یہ نکلی کہ روٹی سب سے موٹی قدر ہے
ماسکو سے آئے یا لندن سے یا چکوال سے

مارچ ۱۹۵۴ ——

۱؎ شیرِ بنگال مولوی فضل الحق ۲؎ مولانا بھاشانی

درد و درماں

اے دلِ زار نہیں تیرے پنپنے کے یہ ڈھب
درد بھی تیرا عجب، درد کا درماں بھی عجب
دشمنِ جاں تھے جو صدیوں سے وہی دوست ہیں اب
"میرؔ کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطّار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں"

۱۹۵۴ء ———

دُعا

اے خدا میرے وطن کو خرّم و خوشحال کر
اے خُدا میرے وطن کو عزّت و اکرام دے
اس دعا کے بعد صبح و شام بس یہ کام ہے
میں تجھے الزام دوں اور تُو مجھے دشنام دے

۱۹۵۴ء

دستور

(پہلا دستوری خاکہ جو منظور نہ ہوسکا)

یہ کیا عجیب سا دستور اے حضور بنا!
کہ سر یہاں کے لیے ہے تو دھڑ وہاں کے لیے

تصوّرات فرنگی، نکات امریکی
خدا کا نام فقط غازۂ بُتاں کے لیے

لگا کے جُبّہ و ریش و کلاہ چرچلؔ کے[1]
یہ ادّعا کہ نمونہ ہے دو جہاں کے لیے

راولپنڈی ——— ۱۹۵۴ء

---

[1] برطانیہ کے وزیراعظم سر ونسٹن چرچل

درسِ عبرت

[اُستاد، جماعت کو تاریخ کا سبق پڑھا رہا ہے
مگر اس کا اپنا ذہن کہیں کہیں سبق کو چھوڑ کر اپنی
پریشاں خیالیوں کے ساتھ ساتھ گھومنے لگتا ہے]

دَورِ اکبر مغلیہ تاریخ کا دَورِ کمال
آج بیوی کہہ رہی تھی گھر میں دلیا ہے نہ دال

نو رتن اکبر کے سب مَردانِ عالی جاہ تھے
حضرتِ فیضی مگر ان سب میں کم تنخواہ تھے

میرزا کوکے تھے بیرم خان تھے خانانہ تھے
یہ بزرگانِ گرامی جانے کیا تھے کیا نہ تھے

اُس کا سیلِ فتح تا قنوّج و کالنجر گیا
ماسٹر رمضان بھی لو آج چھُٹی، کر گیا

اپنا ثانی آپ تھا گفتار میں کردار میں
آج آٹا اور مہنگا ہوگیا بازار میں

ناک مُغلانہ تھی، شہپر مونچھ کا تُرکانہ تھا
"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا"

سب سے پہلا شاہ جس کی فوج باتنخواہ تھی
اس سے پہلے ورنہ بس اک ضربِ اِلّا اللہ تھی

دیکھنا نقشے پہ اُنگلی ہے مری لاہور پر
اے دلِ مرحوم اک اچھی سی 'ٹیوشن' اور کر

شربتِ کافور و صندل سے بُجھاتا تھا وہ پیاس
آج اے دل تُو بھی پی لے ایک لسّی کا گلاس

اُس کی دانش پر رسالے سیکڑوں لکھ ڈالیے
جی میں ہے اب چھوڑ کر اکبرؔ کو مُرغے پالیے

لرزہ بر اندام اُس کے دبدبے سے روم و چین
کاش کالج میں لگاتے ڈاڑھی کی مشین

آخرش گُل ہو گئی وہ شمعِ ہستی ایک دن
"رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دِن"

آگہی افکارِ ژولیدہ میں ضم ہوتی گئی
مدرسے بڑھتے گئے تعلیم کم ہوتی گئی

اپر ٹوپا، مَری ———— ۱۲ جولائی ۱۹۵۷ء

مانسر کیمپ

دل کا صحرا ہے بیابانِ نظر ہے مانسر
کچھ سفر ہے اور کچھ گردِ سفر ہے مانسر
آریوں، تاتاریوں کی رہ گزر ہے مانسر
اَن گِنت صدیوں سے تقدیرِ بشر ہے مانسر
آج کل اک شاعرِ رنگیں کا گھر ہے مانسر

ماورائے گنبد و دیوار و دَر ہے مانسر
کچھ شکستہ جھونپڑوں کا مُختصر ہے مانسر
بادِ صحرائی سے یوں زیر و زبر ہے مانسر
ریت میں آدھا تو آدھا بانس پر ہے مانسر
آج کل اک شاعرِ رنگیں کا گھر ہے مانسر

ہے اگرچہ رُودِ کوہستان میں پانی بہت
آہ یہ دریا کہ دریا کم ہے طغیانی بہت
دل کی تنہائی بہت، آنکھوں کی ویرانی بہت
دشت ہے اور دشتِ بے مادر پدر ہے مانسر
آج کل اک شاعرِ رنگیں کا گھر ہے مانسر

کُشتگانِ دشت اسکندر یہاں دارا یہاں
جس کو خوش دیکھا فلک نے اس کو دے مارا یہاں
ریت آوارہ یہاں اور کھیت بے چارہ یہاں
مشرقِ وسطیٰ کا اک لختِ جگر ہے مانسر
آج کل اِک شاعرِ رنگیں کا گھر ہے مانسر

چوبِ کُہنہ کے مکاں دیوار و در کوئی نہیں
شانہ و سر کا تو کیا شِکوہ، کمر کوئی نہیں
آدمی موجود —— آبادی مگر کوئی نہیں
مانسر میں کوئی بتلاؤ کدھر ہے مانسر
آج کل اک شاعرِ رنگیں کا گھر ہے مانسر

ہم مذاق و ہم زبان و ہم سخن کوئی نہیں
جس سے دل زندہ ہو وہ دیوانہ پن کوئی نہیں
انجمن کیا ہو کہ شمعِ انجمن کوئی نہیں
اِک مکمّل بیشۂ شیرانِ نَر ہے مانسر
آج کل اِک شاعرِ رنگیں کا گھر ہے مانسر

یاد آئیں گی جو گزریں چاندنی راتیں یہاں
دل نے کی ہیں فطرتِ بیدار سے باتیں یہاں
ہم نہ جب ہوں گے تو پھر ٹوٹیں گی برساتیں یہاں
موسمِ برسات میں رومان سَر ہے مانسر
آج کل اک شاعرِ رنگیں کا گھر ہے مانسر

۱۲-لانسرز، مانسر ——————— ۱۷-جولائی ۱۹۵۷ء

یاد آئے

کبھی صبح یاد آئے، کبھی شام یاد آئے
وہ جو خاص آدمی تھے بڑے عام یاد آئے

کوئی تیس گز کی سیڑھی مرے ذہن میں لگی ہے
کہ وہ جب بھی یاد آئے لبِ بام یاد آئے

مجھے کیا خبر کہ جُوڑا ترا کس روش بندھا ہے
کہ زمانہ ہو گیا ہے ترا نام یاد آئے

کراچی ——— ۱۹۶۲ء

❋

فیل کے معنی کہ اُونچا ہو مگر بھاری نہ ہو
تیرا سرمایہ، تری صحّت ہو، بیماری نہ ہو

❋

تیری کُرسی کا اشارہ ہے کہ او روشن جبیں
تیری مِلّت بھی ہو تیرے ساتھ ہی کُرسی نشیں

"فرد[1] قائم ربطِ مِلّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں"

❋

۱۲ مئی ۱۹۶۳

---

[1] شعرِ اقبال

قصور

ہم کریں ملّت سے غدّاری، قصور انگریز کا
ہم کریں خود چور بازاری، قصور انگریز کا
گھر میں کل بینگن کے بھرتے میں جو مرچیں تیز تھیں
اس میں بھی ہوگا بڑا بھاری قصور انگریز کا

دیکھا کریں

صبح سے تا شام اکثر چار ورنہ پانچ دن
اک اچھلتی گیند کے زیر و زبر دیکھا کریں
زندگی کی تیز رفتاری میں اب کرکٹ کا کھیل
عورتیں دیکھا کریں یا پنشنر دیکھا کریں

———— ۱۹۶۳ء

٭

گفتگو میں چُھپیں پِنہاں بھی نہیں
بات مطلب کی درمیاں بھی نہیں

ساخت بدلے نہ کیوں مکانوں کی
اب وہ پہلے سے مرتباں بھی نہیں

باغ میں مقدمِ بہار کے بعد
مُڑ کے دیکھا تو آشیاں بھی نہیں

چھپائیے بھی اور کھلائیے بھی
یار اتنا تو مہرباں بھی نہیں

قصرِ شاہی بلند ہے جتنا
اِتنا اونچا تو آسماں بھی نہیں

خیر ہو بزمِ دوستاں کی خیر!
جتنے عہدے ہیں کرسیاں بھی نہیں

تلخیٔ دہر کی شکایت کیا
زندگی شہد کی دُکاں بھی نہیں

روٹیاں پک رہی ہیں جانے کہاں
اپنے چُولھے میں تو دھواں بھی نہیں

کون پوچھے اُسے کہ جس کے پاس
ووٹ کی چند پرچیاں بھی نہیں

نسلِ نَو کی گِلہ گزاری کیوں؟
اب وہ پہلے سے باپ ماں بھی نہیں

وہ سکوں ڈھونڈتے یہاں آئے
ہم نے فوراً کہا — یہاں بھی نہیں

سفرِ شب ہے اور گاڑی میں
آگے پیچھے کی بتّیاں بھی نہیں

مُنھ لگائے ضمیر کو اب کون
مقتدر بھی نہیں — جواں بھی نہیں

یکم نومبر ۱۹۶۳ء ———— ۱۰۶۶-بی سیٹلائٹ ٹاؤن
راولپنڈی

٭

خار و خس، گھاس پھوس ہے پیارے
یہ ہمارا جلوس ہے پیارے

جس کے ساتھ آج روس ہے پیارے
وہ بڑا کارتوس ہے پیارے

شکل سے معتبر سہی ناصح
آدمی تو جھڑوس ہے پیارے

تیری باتوں میں بھی، لبوں کی طرح
ناشپاتی کا 'جوس' ہے پیارے

تھے بشر میں ہزار وصف کبھی
اب فقط چاپلوس ہے پیارے

صرف لفظوں کا طنطنہ ہو تو شعر
ایک بانگِ خروس ہے پیارے

آدمی پُر خلوص ہے بھی تو کیا
جیب اگر بے فلوس ہے پیارے

کیسے ہنس ہنس کے جی رہے ہو ضمیرؔ!
تو بڑا "زہر چوس" ہے پیارے

کھنسیارہ شریف ——— اپریل ۱۹۷۴ء

ایک شعر

کاش آتے ہم جوانی میں یہاں
کچھ لگاتے آگ پانی میں یہاں

برطانیہ ——— ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷

انگلستان کی ایک جھلک

تنگ اِتنا ہو گیا جینے کا 'رِنگ'
جس طرف جاؤ وہیں نو پارکنگ

صبحدم 'بس' میں سُنو 'گڈ مارننگ'
ہاتھ میں اخبار ہے منہ میں 'پڈنگ'

تن اکیلی پنشنر میموں کی چاپ
عمرِ رفتہ کی پُرانی 'مارچنگ'

جامۂ سلطانیِ جمہور چُست
ڈانگری میں بندۂ مزدور 'کنگ'

اِرتقا ہے، برق، بھٹی، فیکٹری
انتہا ہے، پاؤنڈ، پینی اور 'شلنگ'

وہ ٹریفک ہو کہ ذہنِ انسان کا
بڑھ رہا ہے دائیں سے بائیں 'سوئنگ'

واہ لندن کے سگانِ خوش خصال
اتنے کُتّے شہر میں 'نو پارکنگ'

اِتنا رقص، اِتنی شراب، اِتنی کِسنگ
رُوح کی بالیدگی بالکل 'مسنگ'

آدمی سے آدمی ـــــــ ناآشنا
دل کی گرمی کم، زیادہ 'ڈائننگ'

لمحے لمحے میں بکھر جاؤ ـــــ مگر
زندگی کا فلسفہ ـــــ خوش باشتنگ

دیکھیے ہر پارک، ہر سٹریٹ میں
ہر چَرن، مقصود الٰہی، شیر سنگھ

---

۹ اکتوبر ۱۹۷۷

ن ایونیو، کرین فورڈ۔ لندن

فرنگ رنگ

[ذیل کے اشعار انگلستان کی مقبول تفریح گاہ "بلیک پول" میں کہے گئے]

❋

پھیلی ہوئی بساطِ نشاط بر، ہمہ رنگی
دیکھا 'بلیک پُول' کا جو ہم نے عرض وطُول
شاید اسی ہوس گردی نے بنا دیا
اِتنا حسین و صاف سمندر 'بلیک پُول'

❋

ساحلوں پر یہ طرب گاہیں چمن آراستہ
حُسن عشرت باختہ، خوبی ہوس پرداختہ
گر رہی چندے یہی اُفتادِ عیش اولادِ کیش
ہوٹلوں میں آئے گا ہر ناشتہ 'دو داشتہ'

مضبوط ہو گیا ہے چپک کر مشین میں
رشتہ نیاز مند میں اور ناز نین میں
مصرعے الگ الگ ہیں پہ ہیں اک زمین میں
جنگیز جین میں ہے تو جینی بھی جین میں

قوموں کو دے کے بچو کے، ملکوں کا خون چوسے
نفرت کی گھاٹیوں کو الفت سے پاٹتی ہے
انگریز قوم کتنی پست و بلند دیکھی
اوپر سے چاٹتی ہے، نیچے سے کاٹتی ہے

پتے کی بات

لالہ مصری خان نے کتنے پتے کی بات کی
اپنے 'بی اے' پاس کو کوئی ہنر آیا نہیں
کیا کریں گھر والے برخوردار کے اس علم کو
بھوک تو گھر آگئی آٹا مگر آیا نہیں

سمت

زندگی کے میداں میں
ساتھ ساتھ مَردوں کے
عورتیں جو دوڑیں گی
تتلیوں کو ترسیں گی
آنسوؤں میں برسیں گی
سنگلاخ رستوں پر
چوڑیوں کو توڑیں گی

لندن ـــــ ۱۹۷۷ء

چار پائی کے یہ معنی ہیں تن آسانی نہ ہو
خانہ آبادی بنائے حت نہ ویرانی نہ ہو

وقت کی رہزن ہے یہ تاریخ کا دشمن ہے یہ
بالخصوص اقوامِ مشرق کی بڑی دشمن ہے یہ

بیل گاڑی کا اشارہ ہے کہ ان حالات میں
تیری موٹر روشنی لے کر پھرے دیہات میں

گاؤں ویراں ہو گئے تو شہر بس جائیں گے کیا
ہم نے یہ مانا کراچی میں رہیں کھائیں گے کیا

حُقّہ بالا گوش ہے لیکن بڑا کم کوش ہے
یعنی حُقّہ بولتا ہے آدمی خاموش ہے

نوالہ

اپنے بجبٹ پر لالہ مصری خاں کا عجب مقالہ ہے

فرمایا

"ہاں یاد آیا"

"باہر اس کا روشن روشن

نیرِّ تاباں

اندر کالا کالا ہے"

فرمایا

"ہاں یاد آیا

یہ جو لمبی موٹر ہے

وہ جو رنگیں ٹی وی ہے

ہیروں سے لدی کوئی ہیر ـــ

یہ کس افسر کی بیوی ہے

گردن میں جو کالر ہے

پردے پر جو جھالر ہے

یہ جو قرض کا ڈالر ہے

کاٹھ کی ہنڈیا ـــ ٹھاٹھ کی دعوت

شادی ـــ سالگرہ کی

خَتنے کٹنے اور ولیمے کی

عشرت کھانے پینے کی

(ایسی تیسی خالی آلو قیمے کی)

اپنا دُنبہ

پار سمندر کے پیسوں کا پالا ہے

یہ سب گھور گھٹالا ہے
چاند نہیں ہے ہالہ ہے"
فرمایا
ہاں یاد آیا
ہم نے مانا
اب تو آپ کا بالا خانہ
اور بھی کچھ دو بالا ہے
'بیرا' وردی والا ہے
لیکن اپنے سیّد صاحب
اتنی عرض ہماری ہے
ساری جنس ادھاری ہے
دلوالی —— دلوالا ہے
آپ کے دانت ہی ٹوٹ نہ جائیں
منھ سے بڑا نوالہ ہے

موسم اتنا اشتعالی ہوگیا
شہد حنظل ــــ لفظ، گالی ہوگیا

"خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج"
مدرسہ بھی کوتوالی ہو گیا

کیا بیاں کیجے تپش ماحول کی
میں اُبل کر ــــ لااُبالی ہو گیا

چھو گیا تھا ایک منہگا ڈاکٹر
تب سے بندہ اسپتالی ہو گیا

ڈاکٹر اقبال کو آواز دو
آدمی — چائے کی پیالی ہو گیا

ہر طرف ناآشنا چہروں کی بھیڑ
شہر بھر جانے پہ خالی ہو گیا

عاشقِ مہجور شوقِ وصل میں
یار کے چیمبر کی جالی ہو گیا

دیکھ خدایا وقت کی آواز سُن
تیرا مالی — تیرا والی ہو گیا

یہ نہیں فقرِ جلالی کا خُروج
بھُوک سے بابا جلالی ہو گیا

میں کہ تھا امّید گاہِ سائلاں
آج معتوضِ مثالی ہو گیا

بکریوں کی دوستی منھگی پڑی
اپنا شیوہ بھیڑچالی ہو گیا

قافیہ تنگ اور قلم آسودہ رَو
شعر ، لفظوں کی جگالی ہو گیا

سیالکوٹ (کرنل شیر محمد شاد کے گھر) ——————— ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۸

دو آتشہ

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
یعنی تیزی میں اور بھی تیزی

قبلہ اور اولاد

(اعشاری سکّوں کے اجرا پر)

لیجیے رُپے میں پیسوں کی تعداد بڑھ گئی
قبلہ تو گھٹ گئے مگر اولاد بڑھ گئی

ایک تبصرہ

حضرت نے جو لکھی ہے کتابِ جمالیات
کاتب ہے اس کا ایک، مصنّف ہیں اس کے سات

کنگھی

عمر نادانی کے سایوں کے تعاقب میں کٹی
کچھ نہ تھا معلوم کیا ناراس ہے کیا راس ہے
تجربوں کے بعد عقل آئی بڑھاپے میں ضمیر
یعنی کنگھی ایک گنجے آدمی کے پاس ہے

امریکیوں کے لیے

بارود دے، جہاز دے، بم اور 'گن' بھی دے
دھن میں اگر کمی ہے انھیں اور دھن بھی دے
شعر و ادب کی حس بھی ضروری ہے اے خدا
امریکیوں کو کچھ تو مذاقِ سخن بھی دے

نیویارک ———— یکم ستمبر ۱۹۸۱

حدیثِ دلبراں

(انتخابات میں امیدواروں کے نشانات کے ساتھ ایک پروازِ خیال)

اونٹ کے معنی کہ ہو پاسِ روایاتِ قدیم
اپنے ماضی سے جو کٹ جائے وہ ملّت ہے یتیم
اونٹ کے معنی صفوں میں انتشار اچھّا نہیں
اونٹ اچھّا ہے پہ شُتر بے مہار اچھّا نہیں
دانشِ مغرب سے بے شک ربطِ خوش کامی رہے
لیکن اندازِ نگاہ و فکر اسلامی رہے
جہد و استغنا سے راہِ زندگی آسان کر
اونٹ کے معنی کہ رکھ اپنی خودی کوہان پر

آرٹسٹ سے

فرشتے کی تصویر ہی کیوں بناؤ
کہ شیطان بھی ہے خد و خال رکھتا
کبھی یہ خد و خال بھی تو دکھاؤ

(رابرٹ برن سے ماخوذ) ________ ۱۹۸۱ء

قول و عمل

قول و عمل کا ربط ہے محکم
آج نہ بدلا اپنا آج اگر تو نے
تیرا کل تبدیل نہ ہو گا
قدرت کا دستور اٹل ہے
بیج کا پھل تبدیل نہ ہو گا

(لاس اینجلس، امریکا) ——— ۱۹۸۱ء

ذمّے داری

کچھ بھتیجے ہیں چند سالے ہیں
عہدے تقسیم ہونے والے ہیں

پنجابی اکھان

چُپ چنگی ہوندی اے نکمی باہاں کولوں
لِسّی گھوڑی کم آوے، پَلی ہوئی گاں کولوں

جرمانہ

جب ایک صوبے میں اِک سولھواں وزیر بنا
کِسی نے پوچھا کہ مصرف تو اِن کا سمجھانا
تو اِک ظریف نے بے ساختہ کہا یہ ضمیر
حضورِ والا ہیں جمہوریت کا جرمانہ

——— ۱۹۵۴ء

٭

اِنساں کی جنگ عرصۂ سیّارگاں میں
یہ فوج لڑ رہی ہے خدا کی کماں میں

ہر شے ہے منتظر تری اگلے جہان میں
فی الحال تو رہو اسی کچّے مکان میں

جب سے ملی ہے خوانچہ فروشوں کو خواجگی
تالے پڑے ہُوئے ہیں ہنر کی دکان میں

بوسے تو ہو گئے ہیں ادب سے جلا وطن
لوٹے بنا رہا ہوں عربی زبان میں

ساگر کے سُر شناس اگر ناخدا نہ ہوں
بنتے ہیں کشتیوں کے کفن بادبان میں

نازاں ہے اُس کی دھج پہ پولس ہانگ کانگ کی
کس بات کی کمی ہے ہمارے جوان میں

شاعر کی، شاعرہ سے محبت چلے تو کیا
دونوں ہیں اپنی اپنی غزل کے دھیان میں

جانو کہ وہ حویلیاں ویران ہو گئیں
سگ سو رہے ہیں جس جگہ گھوڑوں کے تھان میں

انساں سے میرے شہر کی سڑکوں تک اے خدا
ہے تیری کائنات ابھی درمیان میں

گھر ایک ہے تو ڈیوڑھی دروازے چار کیوں
کیا اب کوئی بزرگ نہیں خاندان میں

بُزدلی

اپنے سورج پر نہ ہو جب اختیار
صبح نکلے بھی تو سمجھو شام ہے
جو مروّت اپنی خواہش سے نہ ہو
وہ مروّت بزدلی کا نام ہے

انگلستان کے دو رنگ

(۱۸۱۹ء میں شیلے کی نظم سے)

انگلستان

عمر رسیدہ — اندھا، پاگل، بے ہودہ بے کار
اک شاہ قریب المرگ
شہزادے،
دھوئے چہرے سوئے سے
کچھ کھوئے سے

لوگوں کے غضب سے خوفزدہ
حکامِ بلند گراں منصب
نابینا — جیسے اپنی کابینہ
سمجھیں بھی نہیں — جانیں بھی نہیں — مانیں بھی نہیں
خونی کیڑے
اس کشورِ زار سے چمٹے ہوئے
خود اپنے خول میں سمٹے ہوئے
مظلوم عوام
ناکاشتہ، بنجر کھیتوں میں — زخمی بھوکے
یہ عسکریانِ تیغ بکف
ہر چار طرف
آزاد روش اور بستہ صف
ہر زور آور — ہر دست کشا، مضبوط بدن —
رَن بیر
ہر آن گھمائے دو دھاری شمشیر
قانون ؟ — سنہرہ، خوش چہرہ پر اندر سے سفّاک

قاتل اور چالاک

اور مذہب ؛ خالی رسم

عیسیٰ کے بغیر — خدا کے بغیر — کتاب بغیر

(۲)

ولیم ورڈز ورتھ نے ۳ ستمبر ۱۸۰۲ کو دریائے ٹیمز کے ایک پُل
پر بیٹھ کر لندن شہر کے بارے میں ایک نظم لکھی۔ ذیل کا تاثر اسی نظم سے ماخوذ ہے

رُوئے زمیں پر
اس سے بڑھ کر پیاری کوئی چیز نہیں
حیف اس شخص پہ ــــ
جو اس شہر کی رعنائی اور ــــ
رنگ کے لمس کو چھو نہ سکا
صبح کا حُسن ــــ اس شہر کا جادو
خاموشی، پیراہن اس کا
ذرّہ ذرّہ ــــ پھول بدن
دل دُھن رستے ــــ کندن گلیاں

یہ دریا، یہ بجرے، گنبد
پُل، بازار، طرب گاہیں
اُجلی راہیں ـــــ پیاری باہیں
سورج کبھی طلوع نہ ہو گا
اس سے زیادہ موہن ـــــ کومل بستی پر
اے معبود!
اس کا طلسم
حاوی میری روح کی راس پہ
جسم کی آس پہ
جیون پیاس پہ
میری ساری ہستی پر
میں قربان ـــــ ان نیند میں ڈوبے
شانت گھروں پر
اس دریا کی ناچتی گاتی مستی پر

آشیانہ بلبل۔ نمبر ا بائرن ایونیو ـــــــــ اکتوبر ۱۹۸۱
ہنسلو۔ لندن

متفرق اشعار

اس کو کون کہے گا تحفہ ، خالص کھرے نصیبوں کا
ایک امیر کے گھر میں رزق پچاس ہزار غریبوں کا

✹

جاہل لوگ اگر کھولیں گے امکانات کے دروازے
روشن دن میں کھُل جائیں گے کالی رات کے دروازے

✹

اُن کی آرزوؤں کا خون ہوگیا ناحق
دوست مل گئے جن کو مستقل مزاج احمق

✹

برملا نقصان ہر اک رنگ میں
فتح کب کس کو ہوئی ہے جنگ میں

✹

جس ملک میں رشوت اور ریاکاری معیوب نہیں رہتی
اُس ملک میں رفتہ رفتہ کوئی شے بھی خوب نہیں رہتی

❋

کہاں ضمیر چلے آپ التجا کے لیے
وہاں تو لفظ ترستے ہیں مدّعا کے لیے

بنا رہے ہیں وہ بارُود ایشیا کے لیے
کہ اور چاہیے ندرت انھیں غذا کے لیے

کریم! تیرے خزانے میں کچھ کمی تو نہیں
کوئی ستارہ ہی ٹوٹے مری فضا کے لیے

یہاں بھی آ گئیں اونچے گھروں کی دیواریں
چمن میں بھی کوئی رستہ نہیں ہوا کے لیے

خدا کرے کہ تجھے قابلِ قبول بھی ہو
جو سُرمۂ چشم ہے تری چشمِ سرمہ سا کے لیے

زہے نصیب کہ وہ اس میں مبتلا تو ہوئے
کہ ہے مفید تپِ محرکہ حیا کے لیے

میانِ باطل و حق اپنی پیش کش یہ ہے
سڑک اک اور بنا دیں گے کربلا کے لیے

الگ رکھا ہے محبّت میں جسم کو جاں سے
کہ تیرے بوسے بھی کچھ دُور تجھ سے جا کے لیے

ٹھہر ٹھہر! اری بے مہر اتنی تیز نہ بھاگ
یہ کہہ کے ہم نے قدم عمرِ برق پا کے لیے

نہیں زمین کا اِک پارچہ بھی پاؤں تلے
بنا رہے ہیں غبارے مگر ہوا کے لیے

———— ۱۹۸۳ء

زہرخند

یہودی کی یہ جنگ لبنان میں
نہ تھی اہلِ ایمان کے دھیان میں

یہ آتش بپا سیلِ طاغوت کا
کھنڈر ہو گیا شہر بیروت کا

نبرد آزمائی میں ہم بھی تھے طاق
مگر ہم ہیں فی الحال رہنِ نفاق

مرے بے خبر جانبازوں کی خیر
اُدھارے ہوائی جہازوں کی خیر

۱۹۸۳ء

ملاقات

گھر میں ، دفتر میں ، ڈنر پر ، ناشتے میں ، لنچ پر
آج کل اُن سے ملاقاتِ مسلسل ہے ضمیرؔ
مجھ کو ڈر ہے ہم بہم اکتا چکے ہیں اس طرح
جس طرح اک ٹوٹنے والی وزارت کے وزیر

غلط فہمی

پیرہن کو آئینہ دارِ بدن سمجھا تھا مَیں
الاماں ریشم کے اِس دوشیزہ پیراہن کی چھب
اچھّے خاصے مرد کے بچّے کو زن سمجھا تھا مَیں

دل کے افق

دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں
مَیں جن کو پسند نہیں کرتا
پر اُن سے محبّت کرتا ہوں

دروں بینی

کُتّے کی عادتوں کو
جب بھی بغور دیکھا
قائل ہوا ہمیشہ اُس کی وفا روی کا
کچھ سوچ کر مگر پھر
شرمندہ بھی ہوا ہوں

——— (انگریزی سے ماخوذ)

برطانوی شہزادی مارگریٹ

ایک خود سر، خود نگر، بدنام لڑکی کی طرح
قصرِ شاہی میں رہی اک عام لڑکی کی طرح
کھُر درے کھیتوں کھُلے سر آسمانوں کی طلب
شاہزادی جس کو تھی کچّے مکانوں کی طلب

صاحبِ دل اچھا بے فیض نمازی سے
شیشہ گری ہے بہتر سنگ طرازی سے

اپنے لوگوں جیسی باتیں کرنے کو
حکمت سیکھو اپنے رومیؔ رازیؔ سے

تیرا چہرہ اک بیدار کرامت ہے
دنیا چمکی تیری کرم نوازی ہے

غم بھی اک زیبائی ہے بینائی کی
آنکھوں کی رونق ہے اشک پیازی سے

جیون جوت

دوستی کچھ منتخب لمحوں کے رس کا نام ہے
گردِ تفصیلات سے اغماض کرنا چاہیے
زندگی کا راستہ دلچسپ رکھنے کے لیے
بعض چیزوں کو نظر انداز کرنا چاہیے

سالمیّت

فرد کی نیّت کسی صابون سے دھلتی نہیں
شخصیت بس کوٹ اور پتلون سے بنتی نہیں
قوم کی تعمیر ناممکن، محبّت کے بغیر!
سالمیّت جبر یا قانون سے بنتی نہیں

گڑ بڑ

کچھ اس میں یقیناً گڑ بڑ ہے
گردن پر سر لگتا ہے بہت
خامی نہ ہو صادر جس سے کبھی
اُس شخص سے ڈر لگتا ہے بہت

جھگڑا

مساجد میں پسِ خطبہ یہ جھگڑا بھی بپا دیکھا
دری تیری ہے یا میری، دِیا تیرا ہے یا میرا
اذانِ فرقہ وارانہ سے مومن پر نہیں کھلتا
اذاں تیری ہے یا میری، خدا تیرا ہے یا میرا

لطافتِ فن

محض لُغت کی بات نہیں
صرف 'گراف گری' تو نہیں
شعر ہے ایک لطافت بھی
'ڈِکشن' — 'ڈکشنری' تو نہیں

حکمت

بحرِ جہاں میں یہ بلے جہازی

بے مقدرت سب حاجی حجازی

حِکمت سے حاصل جینے کی بازی

بنے کارخانہ کیا ــــ کارسازی

ایجنڈا

(انگریزی شاعر ایڈمنڈ ہٹلے سے ماخوذ)

کھانے کی میز پہ بیٹھے تھے
سر جان گراہم کرسٹوفر
کابینہ کا وہ شیرِ ببر

گن گن کے حساب جو رکھتا ہے
اس مُلک کے دانے دانے کا
ہر جانے اور جرمانے کا

ہر پیسے، پائی، آنے کا
مشہور وزیر خزانے کا
ہاتھوں میں چاندی کا چمچہ
گردن میں کمخوابی کالر
کالر پر تولّابی جھالر
بڑلاٹوں اونچے خانوں کا
شملہ — انگریز ٹوانوں کا
چرچے ان کی دانائی کے
آباد اک اک نو ساحل پر
مقتل الطرٔ زیبائی کے
(گلیوں کوچوں بازاروں میں)
ایثار کی یہ تلقین کریں
تقریر بڑی نمکین کریں
ہر وقت فروغِ دین کریں

سامان سے دِل کو نفور کریں
ایمان کی بات ضرور کریں

لیکن اِمشب!

امشب تو ڈِنر پر آئی ہیں
اسپین کی گندم گوں پریاں
لبنان کی کافر" رس بھریاں'
ہر دیس کی بانکی 'بے گھریاں'
کچھ جرمن شرمن —— سانوریاں
پاؤں میں چھنکتی جھانجھریاں
زلفوں میں حسیں راتیں لے کر
آنکھوں میں جواں دریاؤں کی ——
اُمنڈی ہوئی برساتیں لے کر
یورپ میں جو کم کم ملتی ہیں
وہ دلکش سوغاتیں لے کر
ہیجان ہے سندر سازوں میں
ارمان مدھر آوازوں میں
خدّامِ کمر بستہ سے کہا
سب بٹلر اور کٹلر سن لیں

اب کوئی اگر ملنے آئے
یا فون کرے
بس ملکِ معظّم اور ——
وزیرِ اعظم کے سوا
سب سے کہہ دو
صاحب اجلاس میں بیٹھے ہیں
اِک گرجا گھر کا نقشہ زیرِ بحث ہے
خاص کمیٹی میں

—————— (انگریزی سے)

تضاد

اس شاعر، اس دانش ور کے —
شعر سے، علم سے، فکر و نظر سے
لوگوں کو دلچسپی تو تھی —
لیکن اُس سے پیار نہ تھا
جس کے فن میں صرفِ ہنر تھا
فکر کے پیچھے خالی شہرت تھی —
اُجلا کردار نہ تھا

جب فرشتے پڑھے لکھے ہی نہیں
اُن سے خواند و نوِشت کون کرے

دانہ کھائے نہ دانہ کھانے دے
کاشت بنیے کی کِشت کون کرے

صومعہ سے نبٹ رہا ہوں میں
کار و بارِ کنشت کون کرے

قانونِ ضرورت

دنیا کے اکثر کاموں میں وقفے کی مجبوری ہے
ہم بھی اس کے قائل ہیں یہ بات بڑی دستوری ہے
لیکن ماہِ صیام کا بھی اپنا قانونِ ضرورت ہے
روزے میں "افطار و ڈِنر" میں وقفہ غیر ضروری ہے

مجبوری

یہ نہ سمجھ اے دوست کہ مجھ کو تیری کچھ پہچان نہیں
جان کے غافل رہتا ہُوں میں اتنا بھی انجان نہیں
بے خبری میں بھی انساں اچّھا خاصا جی لیتا ہے
داناؤں میں بالکل احمق ہونا بھی آسان نہیں

✱

وہ شوخ اس زاویے سے مسند آرا ہے سرِ محفل
نہیں کھُلتا کہ ظالم مہرباں تیرا ہے یا میرا

پیامی ڈھونڈ کر لایا ہے جو گورِ غریباں سے
وہ جُوتا اے امیرِ کارواں تیرا ہے یا میرا

کراہت اُس کی مونچھوں اور کپڑوں سے نہیں زیبا
کہ جیسا بھی ہے طورا بازخاں، تیرا ہے یا میرا

سرا پردہ ترا، خیمہ ترا، قالین بھی تیرے
سفر میرا ہے لیکن کارواں تیرا ہے یا میرا

بڑے بھائی سے چھوٹے نے کہا تقسیمِ ترکہ پر
مکاں تو جل چکا بھائی دھواں تیرا ہے یا میرا

بریڈفورڈ
(بر مکان سیّد میر حضرت شاہ) ——— نومبر ۱۹۸۵

سوال

رشوت ، بھوک ، جہالت اور بے کاری سے
اپنی سادہ لوحی سے یا غیروں کی عیّاری سے
خانہ جنگی ، کالی منڈی ، قاتل تہہ بازاری سے
لوگو ہاتھ بلند کرو
اپنا زہر پسند کرو
مرو گے کس بیماری سے ؟

کَبِت

کون خریدا جاتا ہے آسانی سے
ضدّی شخص!
کن کو ڈرانا آساں ہے
کمزوروں کو!
کن کو 'نرمانا'— بھڑکانا آساں ہے!
عادی شیخی خوروں کو

فلمی اسکندرِ اعظم

ہیرو سے کہا ـــــ ڈائریکٹر نے

او چن ماہی !

تُو ذوقِ تماشا بھول گیا

پبلک کا تقاضا بھول گیا

کچھ صوت و صدا کا دھیان نہیں

یہ رُوں کوئی آسان نہیں

کون ایسی موت پہ روئے گا
ترے مرنے میں کچھ جان نہیں
دُوگانا مرُ — سُہہ گانا مرُ
مرنا ہے تو کچھ مردانہ مر

گھر ہے تھل میں زندگی جاپان کے معیار سے
خودکشی کی ہے نہایت قیمتی تلوار سے

تیل کب نتھرا نکلتا ہے کنوئیں کی دھار سے
آدمی عالم نہیں بنتا فقط دستار سے

زندگی اپنے کنارے کے سہارے ہی سے کر
کون آتا ہے مدد کرنے سمندر پار سے

کھل گئے مغرب میں اب مشرق کے "سنیاس آشرم"
ڈاکٹر صاحب دوا لینے لگے بیمار سے

فرشِ مسجد پر نمازی منتظر بیٹھے رہے
مولوی صاحب اترتے ہی نہیں مینار سے

✹

جذبات کا طوفان بلاخیز بہت ہے
اس عہد کے بچّوں کا لہو تیز بہت ہے

انگریزی جو باہر مرے چھلکی پڑتی ہے
شاید مرے اندر ابھی انگریز بہت ہے

چادر میں ہیں زلفیں تو نظر بند نگاہیں
اس شہر میں کیا رہیے کہ پرہیز بہت ہے

روزنِ آفاق سے

دُنیا میں آج جدھــر دیکھو
آفاق کے میلے روزن سے
زخمی زخمی ــــــ منظر دیکھو

شہروں میں جلتے گھر دیکھو
جنگل میں اُڑتے پر دیکھو
شانوں سے اترتے سر دیکھو

اک زہر زمین اندر دیکھو
اک قہر ستاروں پر دیکھو
دیکھو! دیکھو! اندھے لوگو!

بجتے ہوئے کالم بکتر کے
بپھرے ہوئے دستے لشکر کے
ہر سو بارود کے ڈھیر لگے
اور 'ماچس' ہاتھ میں بندر کے

جمہوریت

جمہوریّت اپنے ہاں
تھوڑی دیر کو آتی ہے
فطرت ان صحراؤں کی
اوس سے پیاس بجھاتی ہے

ماضی و مستقبل

صحن کی بیری چھاج کی چھنکن بھیڑ کے بچے کی مم مم
گھر کی رہن سرا کو رخشندہ، تابندہ رکھتی ہیں
"جٹ جمبو" میں اُڑنے والو — اُڑو! پر اتنا دھیان رہے
اُن چیزوں کو ختم نہ کردو جو تمھیں زندہ رکھتی ہیں

کامیابی کی شرط

وہ کامیاب ہے تو یہ کچھ بے سبب نہیں
میں عشق میں تھا کم نہ ارادت میں سست تھا
البتہ چاپلوسی کے فنِ لطیف میں
میرا رقیب مجھ سے زیادہ درست تھا

سفر

حال کہیں کیا موسم کی اُمسائی سی رُت رنگت کا
اک اک دن اک سال میں گزرا سال گزرتے دیر نہ تھی
کلی تو چٹکی دھیرے دھیرے پھول بکھرتے دیر نہ تھی

باسیاں، بے سرخیاں، بے چاریاں
عورتیں مہنگائیوں کی ماریاں

بُھاریاں پر کس قدر ناکاریاں
شیخ صاحب کی گراں دستاریاں

یہ اُدھارے پُل، بدیشی آریاں
کم نہ ہوں گی اپنی کم بازاریاں

حُسن کچھ میراث محلوں کی نہیں
جھونپڑوں میں بھی ہیں شکلیں پیاریاں

مُلک ہو یا فرد — چل سکتیں نہیں
مفلسی کے بیچ نمبر داریاں

بھُوک سے لاچار تھے جو اَب انھیں
لگ گئیں خوراک کی بیماریاں

اُس طرف بمباریاں اور اِس طرف
گھاس منڈی میں 'سخن انگاریاں'

شیر بنوانے چلے تھے ہم، مگر
مانگ لائے زیبرے کی دھاریاں

زندگی کی ہر پرت میں دیکھیے
نارضامندی کی ناہمواریاں

حیف اُن ملکوں کی دولت پر جہاں
بیاہیوں کی مثل دیکھیں کنوّاریاں

کالجوں میں عام بچّوں کو نہ ڈھونڈھ
لوگ ہلکے اور رفیسیں بھاریاں

ناروے کی برف میں یاد آ گئیں
جھنگ اور جہلم کی کیسر کیاریاں

ڈھونڈھتا ہوں اس مشینی دَور میں
گاؤں، گائیں۔گاگریں ، پنہاریاں

شعر میں یہ کچھ اشارے تھے ضمیر
کون کہہ سکتا ہے باتاں ساریاں

(اوسلو) ــــــــــــ ۱۵ نومبر ۱۹۸۵

دیدنی ہے. وقت کا دباؤ شمس دین پر
دھڑ ہے چارپائی پر تو ہاتھ ہے مشین پر
پاپ ناچ — ناچتا ہے بھیرویں کی بین پر
گھوڑے پر سوار مگر پاؤں ہیں زمین پر

شیر اور سانپ

شیر اور سانپ
جب بھی آتے جاتے ہیں
مٹّی پر
اپنی راہ بناتے ہیں
آپ نے بھی دیکھا ہوگا
شیر کی سمت تو ہوتی ہے
سانّپ کی سمت نہیں ہوتی

پذیرائی

(یومِ پاکستان کے حوالے سے)

اب نہیں کوئی بھی دشواری کہ ہم آزاد ہیں
ہم کریں گے چور بازاری کہ ہم آزاد ہیں

قیمت آزادی کی کچھ نہ کچھ تو کرنی تھی ادا
مدرسوں کی فیس ہے بھاری کہ ہم آزاد ہیں

کام کرنے کے لیے عہدِ غلامی کم نہ تھا
ہم ہیں اور آزاد بیکاری کہ ہم آزاد ہیں

یاد ایاّمے کہ بکری تک کمیٹی میں نہ تھی
اب ہیں کتنے سانڈ سرکاری کہ ہم آزاد ہیں

نرخ 'نرُ' رکھتا ہے سوداگر کہ پابندی نہیں
پُڑیا کیوں باندھے گا پنساری کہ ہم آزاد ہیں

مشرق و مغرب میں اب جھانکیں تو آخر کس لیے
بند کر دو 'عِلم الماری' کہ ہم آزاد ہیں

شہر میں وہ بے خطر چلنے کی رُت جاتی رہی
دیکھ وہ چنگھاڑتی لاری کہ ہم آزاد ہیں

چادر اپنے راستے میں کیا مزاحم ہو ضمیر
توڑ دیں ہم چار دیواری کہ ہم آزاد ہیں

اعتراف

شیطان کے بُت پر جب میں نے
پتّھر تولا
تو وہ بولا
ارے تُو بھی ہے ان پتّھر پھینکنے والوں میں!
تُو ویر مرا، تُو ضمیر مرا، تُو سفیر مرا
تُو پیر مرا

ارے تُو بھی !
تُو یار چلتّر کار مرا
مجھ سے بڑھ کر ، مجھ سے بہتر
کرتا ہے کاروبار مرا
ارے تُو بھی ہے ان پتّھر پھینکنے والوں میں
اُس کے لہجے میں درد بہت
میرے چہرے پر گَرد بہت
میں اُس کو پتّھر مار آیا
پر اندر سے ، اپنے انساں کو ہار آیا

——————— دسمبر ۱۹۸۵

قوامِ زندگی

قوم نے یہ کیا بنایا ہے قوامِ زندگی
کتنی قبریں کھود ڈالی ہیں بنامِ زندگی

وہ سیاسی بندگی ہو یا معاشی گندگی
سر بہ زانو ہے گرافِ صبح و شامِ زندگی

کاوے کاوے سخت جانی ہائے مہنگائی نہ پوچھ
مدّتوں سے بند ہیں سارے مسامِ زندگی

نبض جب چلنے پہ آتی ہے تو رُک جاتی ہے سانس
یہ نظامِ زندگی ہے یا 'زکامِ زندگی'

زندگی دو ہاتھ آگے کانپتا رہتور ہے
آدمی دو گام پیچھے ہانپتا مزدور ہے

✺

آگہی ــــ بیزار کرنے کے لیے
عاشقی ــــ بیمار کرنے کے لیے

ایک حرفِ ریشمیں درکار ہے
نار کو گلنار کرنے کے لیے

واعظانِ سیرتن سے پُوچھیے
کوئی کاروبار کرنے کے لیے

اپنے مولانا بڑے مصروف ہیں
پھول کو تلوار کرنے کے لیے

وہ سرسری بہ حدِ سراسیمگی ملے
میدانِ روزِ حشر میں جیسے کوئی ملے

اِس دورِ کم سواد میں لوگو خرید لو
جس بھاؤ مارکیٹ میں دیوانگی ملے

ہم نے پسر کو 'ایم اے ایل ایل بی' کرادیا
اب اتنا آپ کیجے اسے نوکری ملے

گندم کے بعد ہم ہیں سیاحت میں خودکفیل
جس ملک میں گئے وہاں اپنے قلی ملے

سرسوں کے پھول گاؤں میں نایاب کیوں نہ ہوں
جب سادگی کے بھیس میں سوداگری ملے

"مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے"
مدّت ہوئی ہے گوشت ملے اور گھی ملے

تیری خوشی عزیز تھی دل کو — چنانچہ
جن سے نہ رسم و راہ تھی ہم اُن سے بھی ملے

یہ سامعین کی تھی مروّت کہ چُپ رہے
اور تُو یہ چاہتا ہے تجھے داد بھی ملے

۱۹۸۵ــــــــــــــ

تھرڈ ورلڈ کے بچّو!

میں تمھیں بتاتا ہوں
حرفِ مدّعا لکھنا
کوئی لفظ کب لکھنا
کس کے نام کیا لکھنا

درد کو دوا لکھنا
حبس کو ہوا لکھنا
قہر کو کرم لکھنا
بھوک کو غذا لکھنا

امریکا کو اَن داتا
روس کو خدا لکھنا
قبر کو قبا کہنا
قبض کو کُشا لکھنا
ہینگ کو حنا کہنا
سینگ کو صبا لکھنا
جس کا رنگ گورا ہو
اُس کو بے وفا لکھنا
سوگ اک سوئمبر ہے
روگ کو شفا لکھنا
رُخ سے خُلد کی املا
ہُ سے بس ہرا لکھنا
مُر سے مرحبا نکلے
جبر کو جزا لکھنا
شمر کی حویلی پر
حرفِ کربلا لکھنا

تھرڈ ورلڈ کے بچّو !

ہم تمھارے ورثے ہیں
رات چھوڑے جاتے ہیں
چار سُو لٹیروں کی
گھات چھوڑے جاتے ہیں
ظلمت و فلاکت کے
ساتھ چھوڑے جاتے ہیں
تم کو ان بلاؤں کے
ہاتھ چھوڑے جاتے ہیں

۶۱۹۸۵ ——————

افسر خط لکھواتا ہے

(انگریز شاعر جان ہومز سے ماخوذ)

افسر خط لکھواتا ہے
اپنی حسیں نوخیز، نوکیلی بانکی شوخ "اسٹینو" سے
سوچ کی لہر میں لفظ ٹٹولے
دائیں گھومے، آگے کھسکے، بائیں ڈولے
نئے سگار کا گھونگھٹ کھولے

تب کچھ بولے
پھیرے ہاتھ کبھی وہ اپنے
چوکھے، چپڑے گالوں پر
سر کے چھدرے بالوں پر
ناک کبھی کھجلاتا ہے
ٹانگ کبھی سہلاتا ہے
افسر خط لکھواتا ہے

کیا لکھا ہے ؟
"اچھا لکھو"
بی بی سُکھو !— اچھا لکھو !
بھائی اظہر !
مانا دن سرکاری ہے
لیکن شام ہماری ہے
بیٹھیں گے جمخانے میں
اُس کا فر ویرانے' میں

مانا اب جمخانے میں
پہلی سی وہ بات نہیں ہے
وہ دیوانی، ناچتی گاتی رات نہیں ہے
دُھت نینوں کی گھات نہیں ہے
بادل ہیں —— برسات نہیں ہے
انگریزوں کی ذات نہیں ہے
دَور ہے رمبو پانی کا
راج ہے کوٹی، پاجامے، شروانی کا
بیچ بیچ میں رمبو بھی ٹپکاتا ہے
دوہراتا ہے
بیچ بیچ میں —— کافی بھی منگواتا ہے
کوئی آتا جاتا لفظ چباتا ہے
بیچ بیچ میں
مشکل لفظوں کے معنی سمجھاتا ہے ——
پنسل سے میز بجاتا ہے
دفتر کے منقّش کاغذ پر

دِل کی تصویر بناتا ہے
رمن... رمن... رمن ——
ناک کے اندر گاتا ہے
افسر خط لکھواتا ہے

*

ہم کو تو یارو بہت خوش آئیاں
معتدل رسوائیاں ـــــ دانائیاں

لفظ کے قابو میں وہ رمزیں کہاں
تجربوں نے جو ہمیں سمجھائیاں

ہڈیاں قبروں سے کھدوانے کا شغل
بے حرارت قافیہ پیمائیاں

ہائے وہ گلیوں کی زندہ رونقیں
ہائے وہ لڑتی ہوئی ہمسائیاں

ہائے وہ دن جب گھروں میں تھیں بہم
مائیاں ، ماں جائیاں، بھرجائیاں

اپنی ستر ھویں سالگرہ پر

جیسا بھی ہو بستر آخر بستر ہے
مٹّی کا بھی افسر ہو تو افسر ہے
راکھ میں اک چنگاری تو سلگائے رکھ
بوڑھا ہونا مرنے سے تو بہتر ہے

مہاجن

عدو کے سامنے ہرگز کشیدہ سر نہیں ہوتا
وطن کی جنگ میں بھی وہ سرِ لشکر نہیں ہوتا
وہ سودا بیچتا ہے گاہک اپنا ہو کر بیگانہ
مہاجن کی دکاں ہوتی ہے اس کا گھر نہیں ہوتا

گواہی

کیا پوچھتے ہو مجھ سے اس دَور کی گواہی
شاہد ہے اس کے رخ کی منھ بولتی سیاہی
تعلیم سے تشدّد، تہذیب سے تباہی

هر ظلم روا ہوتا ، ہر جبر بجا ہوتا
بندہ جو خدا ہوتا ، تو بندوں کا کیا ہوتا

چہرہ تھا اگر ڈبلا مونچھوں سے بھرم رکھتے
حلوا چلو کم ہی تھا ، چمچہ تو بڑا ہوتا

وہ خواب میں جاگے ہے وہ خون میں بھاگے ہے
ابلیس کا کوئی تو نقشِ کفِ پا ہوتا

ہوتے نہ وہ یوں رسوا رشتے میں اگر کوئی
لیلیٰ کی چچی ہوتی، مجنوں کا چچا ہوتا

اچھا ہے کہ خالق خود مخلوق نہیں ورنہ
ناکام بشر ہوتا — بدنام خدا ہوتا

✺

حیران مُدام ابتری سے
ویران قبیلہ پروری سے

ناراض قوامِ زندگی سے
بیزار نظامِ دفتری سے

خمیازے ، زخم زخم گہرے
اندازے تمام سرسری سے

پھوٹے نہیں پھر زمین سے وہ
ٹوٹے ہیں جو گورنری سے

انگریزیاں بولنے سے پہلے
ہم لوگ تھے محض مولوی سے

مونچھیں کہاں گئیں ہماری
پوچھیں گے یہ اسمبلی سے

بیمار کو ہو شفا تو کیسے
لیتا ہے دوا اسلوتری سے

ہم جیسے اہل کار بندے
کیا بات کریں جمالی سے

بیتے گا تمام سال کیوں کر
پھرتے ہو اُداس جنوری سے

چھوڑو بھی ضمیرؔ بور باتیں
ملہار سنو غلام علی سے

باش گاہِ افسراں رسالپور ——— ۱۹۸۶ء

ایک بات

تجھ سے میں کب کہتا ہوں
روشن دن کو رات نہ کہہ
بس اک میرے بارے میں
کوئی سچّی بات نہ کہہ

لفظ و مفہوم

اگر تم سے ہو ممکن جعفری جی
تو میخواروں کے یہ اوصاف رکھنا
کہ ہو الفاظ میں تو جھول بے شک
مگر مفہوم کو شفّاف رکھنا

انتباہ

لوگو سن لو!
سوئے، کھوئے، روئے لوگو
اس پاگل سفّاک سمے میں
ساری دنیا
ہاتھ میں ڈال کے ہاتھ چلے
ساری دنیا کو اک فرد بھی غارت کر سکتا ہے آج
جگ کو جُگ جُگ رکھنا ہے تو مل کر سارے ساتھ چلو
ہاتھ میں ڈال کے ہاتھ چلو

۱۹۸۶ء

سالم دانائی

کل دودھ سموچا مکھن تھا
اور اب بالائی کوئی نہیں
سچ اور' حقیقت اور میاں!
سالم دانائی کوئی نہیں
ہر دور کی اپنی آگاہی
ابدی سچّائی کوئی نہیں
چینی تو کروڑوں آج بھی ہیں
پر 'چُو این لائی' کوئی نہیں

———— ۱۹۸۶ء

عِلم کٹھرا

علم سے راحت ملتی ہے
عزّت، عظمت ملتی ہے
یہ دانائی دیتا ہے
ہر اچھّائی دیتا ہے
تیرے گرد حفاظت کا
اک مضبوط کٹھرا ہے
جس کا رنگ سنہرا ہے
کتنا خوش قسمت ہے وہ
جس پر علم کا پہرہ ہے

——— ۳۰ مئی ۱۹۸۶

لفظوں کا ساہوکار

ہاں — قلم کلا، اک خوشبو بھی
صحرا میں دوڑتا آہو بھی
صندل بازو کی چوڑی بھی
بابل بالوں کا گجرا بھی
موہن آنکھوں کا جادو بھی
منصف کے ہاتھ میں عدل کا تول ترازو بھی
فن موتی بھی   فن آنسو بھی

وہ شخص مگر
جو قلم کلا سے طنز لکھے
اس ڈھب سے کر وہ چالاک تو ہو، بے باک نہ ہو

جو درد بچھا ہے دھرتی پر
اُس درد سے وہ نمناک نہ ہو

الفاظ کے اوپر چربی ہو
احساس کے اندر مکھّن ہو

معنیٰ مفہوم، مرغّن ہو
ہر سطر پہ سُوتی چادر ہو
ہر شعر پہ موٹی اچکن ہو
وہ عالم فاضل — گُنی گیانی لاکھ سہی
کتنی بھی اُس کی ساکھ سہی

وہ قلم منافق
اپنے فن کا، اپنے وطن کا دشمن ہے
مردہ لفظوں کا ساہوکار مہاجن ہے

——— دسمبر ۱۹۸۶

اِسلام اور امجد اِسلام

بنیاد سے بام زیادہ ہے، خیمے سے خرام زیادہ ہے
شے کم ہے اسلام زیادہ ہے، حج سے احرام زیادہ ہے
اللہ کے کاموں کی نسبت اللہ کا نام زیادہ ہے
اسلام تو کم ہے 'ٹی وی' میں امجد اسلام[1] زیادہ ہے

۱۹۸۶ء ———————

[1] ممتاز شاعر اور مقبول تمثیل نگار

خوش فہمی

زعم ہے امامت کا، دعویِ قیادت ہے
اُمّتوں میں سرکردہ، اپنی پاک اُمّت ہے
اصل حال کیا کہیے، حال کی یہ حالت ہے
عشق بے حرارت ہے علم بے مہارت ہے
مال بے تجارت ہے، ملک بے سیاست ہے

❋

عام لوگوں کو ملے کیا کوئی شے
کھا گئے ہر چیز تو کاؤسؔ وکے

❋

باغ نہیں، باران نہیں، کیسی برساتیں کرتے ہو
کچّے کچّے ہونٹوں سے کیوں پکّی باتیں کرتے ہو

انسانوں کے اِنجر پنجر میں بھی چکّر دیکھے ہیں
کتنے بڑے بڑے مفکّر چھوٹے چھوٹے انساں تھے
کتنے چھوٹے چھوٹے انساں بڑے مفکّر دیکھے ہیں

مردہ و مردود

ہو روس کہ امریکا دیتے ہیں مدد لیکن
مردوں کو کفن جیسے مردود نہیں دیتے!
جینے بھی نہیں دیں گے مرنے بھی نہیں دیں گے
مختار بھی کرتے ہیں مجبور بھی رکھتے ہیں
اُنچوُر کھلاتے ہیں ــــ امرود نہیں دیتے
بندوق تو دیتے ہیں بارود نہیں دیتے

۶۱۹۸۷ ــــــــــــ

ہم محاذِ جنگ پہ ہیں

جنگ اپنی ــــ

رشوت سے، بے کاری سے
نفرت سے، بیماری سے
جہل اور تنگ خیالی سے
غربت سے، بدحالی سے

منھ گا ہے بازار بہت
حاکم ــــ کم دیدار، بہت
عالم ــــ دنیا دار بہت
لوبھی ــــ ساہوکار بہت

منصف ہے لاچار بہت
منظر — ناہموار بہت
گھر کم ہیں مینار بہت
در غائب — دربار بہت
کتنے دھبّے ننگ پہ ہیں
ہم محاذِ جنگ پہ ہیں
جنگ اپنی —
جبر سے ، ناانصافی سے
زر کی حرصِ اضافی سے
ظلمت ، بغض ، جہالت سے
محتاجی کی حالت سے

صنعت لگ گئی ہنر بغیر
آنکھیں سج گئیں نظر بغیر
علم نہیں ہے ، شَملہ ہے
باغ نہیں ہے ، 'گملا' ہے

تھانا، جیل، کچہری دیکھ
کاروبار سنہری دیکھ

جنگ اپنی ——
دَھن والے مَن کالوں سے
اندھی دولت والوں سے
جن کے انگ ترنگ پہ ہیں
ہم محاذِ جنگ پہ ہیں

جنگ اپنی ——
تخریبی ہرکاروں سے
بیرونی انگاروں سے
تنہا بھی ہیں لشکر بھی
باہر بھی ہیں اندر بھی

دشمن ہر فرسنگ پہ ہیں
ہم محاذِ جنگ پہ ہیں

——— ۱۹۸۷ء

رابطے کا ضابطہ

تنگ کائناتی ہے ، بیش شش جہاتی ہے
عاشقی کا مقصد اب دال اور چپاتی ہے
دوستی ضرورت کی کم معاشیاتی ہے
پیار حادثاتی ہے ، ربط واجباتی ہے

کھانستا تو رنگین[1] ہے چھینک ہم کو آتی ہے

منی پیگ ، کینیڈا ———— ۱۹۸۷ء
(معروف شاعرہ عرفانہ عزیز کے گھر)

---

[1] صدرِ امریکا

ایک کتاب پر تبصرہ

یہ مانا کہ آواز گونجی بڑی
یہ مانا کہ الفاظ آئے بہت
اشارات بھی کسمساتے رہے
کنایات بھی گڑبڑائے بہت
معانی کا مظلوم ملبا بڑا
مکاں مختصر سے کرائے بہت
ترا شعر — قومی بجٹ کی طرح
بتائے ہے کم اور چھپائے بہت

اپنی اِکہتّرویں سالگرہ پر

ذکرِ خدا بھی کرے ضمیرؔ
پریوں پر بھی مَرے ضمیرؔ
ہر منظر آوازیں دے
ارے ضمیرؔ! ارے ضمیرؔ!
آخری سانس کے آنے تک
برسے گا اور گرجے گا
بوڑھا اوّل درجے کا

——— یکم جنوری ۱۹۸۷

زندگی

زُبورِ زندگی بے ربط الجھی سی عبارت ہے
صداقت اور ہوتی ہے حقیقت اور ہوتی ہے
حکومت اور ریاست میں یہی ناطہ سمجھ آیا
ضرورت اور ہوتی ہے حکومت اور ہوتی ہے

سینسر

کتنے رستے چلتے ہیں تو کوئی بستی بستی ہے
خشت و چوب و سنگ نہیں کچھ بنیادی آبادی کی
کوئی بھی 'سینسر' ہو جس سے سانس رُکے یا حرف بجھے
نفی ہے سالم جینے کی توہین ہے وہ آزادی کی

آلودہ اِتنا شیشۂ کردار ہے یہاں
سورج کی روشنی میں شبِ تار ہے یہاں

غالب کا سارا شہر طرفدار ہے یہاں
غالب کے ہاتھ میں ابھی تلوار ہے یہاں

مسمار سارا شہر اگر ہو گیا تو کیا
'بُل ڈوزروں' کے ہاتھ میں معمار ہے یہاں

جو روگ لگ گیا ... وہ ہمیشہ لگا رہا
نرگس ہزار سال سے بیمار ہے یہاں

جمہوریت میں تھوڑی سی ترمیم ہو گئی
اب بادشاہ تو نہیں، دربار ہے یہاں

قلعے سے ہو رہی تھی منادی بنامِ خلق
سر آپ ڈھونڈ لائیے دستار ہے یہاں

گھر میں گرانیوں سے ہیں چہرے بجھے ہوئے
بازار جو ہے مصر کا بازار ہے یہاں

ایسے مکاں میں کیسے رہائش درست ہو
دروازے کے مقام پہ دیوار ہے یہاں

اس شہرِ بے وفا سے خفا تو بہت تھے ہم
پر کیا کریں کہ کوچۂ دلدار ہے یہاں

وہ کون سا فن ہے جس میں مغرب رئیسِ اربابِ فن نہیں ہے
کہاں کہاں اُن کے 'بَم' نہیں ہیں کہاں کہاں ان کی 'گَن' نہیں ہے

کربِ کراچی

(گروہی خوں ریزی پر)

تم کربِ کراچی کے بارے
پوچھو ہو میری رائے کو
اک آخری لقمے کی خاطر
ہم ذبح کرے ہیں گائے کو

——— ۱۱ جنوری ۱۹۸۷ء

بے دلی

اک بنک میں اک بیاہی بی بی
'چیک' لائی کیش کرانے کو
'چیک' گیلا تھا

نم دیدہ ــــ نیلا نیلا تھا
بابو نے جب اُس کا سبب پوچھا
عورت بولی

میرے شوہر نے جب چیک کاٹا
اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے

زنگ زنگ

پیر صاحب نے مریدوں سے کہا
'چُپ' کا چِلّہ کاٹنا بھی جنگ ہے
لالہ مصری خان بولے ـــــ 'مرحبا'
اے حضور!
(آپ کے حجرے سے دور)
پھول گویا سنگ ہے
زنگ بھی اک رنگ ہے
چپ کا چِلّہ جنگ ہے

ـــــــــــــ ۱۴ جنوری ۱۹۸۷

حل

(کراچی کے فسادات پر)

شہر میں یہ کُشت وخوں، قتل وفساد
خون روئے جس پہ دل وہ سانحات
لالہ مصری خان نے از رُوئے طنز
دیکھیے کیا خوب فرمائی ہے بات
"ہم نے سارا گھر جلا ڈالا مگر
ایک چوہے سے تو پائی ہے نجات"

کراچی ——— ۱۷ جنوری ۱۹۸۷ء

جس خوش قامت نے سختی سے چادر تانی ہوتی ہے
اکثر دیکھا وہ 'مستورہ' بڑی پرانی ہوتی ہے
کالج کے نو اہلے گھلو! یہ ہنسنے کی بات نہیں
بوڑھے لوگوں کو بھی جوانو! یاد جوانی ہوتی ہے

✻

خدا رکھے مسلمانوں کی جی داری نہیں جاتی
غریبی میں بھی پگڑی چارمیناری نہیں جاتی

تن آسانی نہیں جاتی، ریاکاری نہیں جاتی
میاں برسوں میں یہ صدیوں کی بیماری نہیں جاتی

ہماری خوش روی شاداب گفتاری نہیں جاتی
ہرن بھوکا بھی ہو تو خوئے تاتاری نہیں جاتی

جنابِ شیخ یوں چلتے ہیں علم و فضل کو لے کر
کسی ٹھیلے سے جیسے کوئی الماری نہیں جاتی

انھوں نے مجلسِ اقوام کا جلسہ نہیں دیکھا
جو کہتے ہیں بڑے لوگوں کی مت ماری نہیں جاتی

سُنا ہے قیس پیدل دوڑتا ہے اب بھی صحرا میں
یہی سنتے ہیں اب بھی نجد میں لاری نہیں جاتی

کمشنر اندرونِ شہر دورہ کر نہیں سکتا
کہ ان گلیوں میں لمبی کار سرکاری نہیں جاتی

یہ مکتب جن کے کھل جانے سے آنکھیں بند ہو جائیں
یہ دانش جس کے آجانے سے بیکاری نہیں جاتی

یہ فنِ گفتگو اس شوخ نے مغرب سے سیکھا ہے
دلآزاری میں بھی خوشبوئے دلداری نہیں جائی

کوئی قوّت کسی کلچر پہ غالب آ نہیں سکتی
کسی چادر کے اندر چار دیواری نہیں جاتی

زمیں نے کر دیا لو آسماں کو بھی خراب آخر
مہ و انجم کی بھی اب جوتِ بیزاری نہیں جاتی

"ترے[1] حیران بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا"
کہ ان پر جو بھی حالت ہو گئی طاری نہیں جاتی

میاں گُلشیر خاں تم بھی ہوا کے رُخ کو پہچانو!
جہاں "ساڑھی" چلی جاتی ہے "پُھلکاری" نہیں جاتی

ضمیرِ جعفری صاحب اٹھو کچھ کام فرماؤ
فقط رونے سے میری جان! دشواری نہیں جاتی

---

[1] علامہ اقبال کا مصرع بہ تصرّفِ ادنیٰ

متفرق اشعار

کھیت میں نم ، باغ میں بلبل نہیں
ہے صراحی تو مگر قلقل نہیں

❋

ہمارے مسائل کو آسان کر
"برزنیف" کو یارب مسلمان کر

❋

شعر بن رہے ہیں وہ لاشعور کے اندر
وہ قبور کے اندر ہم فتور کے اندر

❋

گورا ہے یا زنگی ہے
انسان کی فطرت جنگی ہے

❋

اپنی اَنا اپنی آزادی لوگ یہاں تک مانگتے ہیں
وہ اپنے آئین سے احمق ہونے کا حق مانگتے ہیں

❋

مغربیوں کا گُر ہے نرالا
کھیلے گورا ـــــ دوڑے کالا

❋

مجھ کو آسمانوں سے یہ زمین بہتر ہے
بے شمار بحثوں سے اک یقین بہتر ہے

ضمیر سڑک

شکریہ جہلم کی ضلعی کونسل کا شکریہ!
رکھ دیا ہے اک سڑک کا نام میرے نام پر

جن سُکوں گاہوں میں کھیلا ہے مرا بچپن ضمیرؔ
اس مسافت کی رفاقت دور تک رکھتا ہوں میں
یُوں لیا آخر مری خانہ بدوشی نے خراج
گھر تو میں رکھتا نہیں لیکن سڑک رکھتا ہوں میں

چک عبدالخالق (ضلع جہلم) ——————— ۲۰ جنوری ۱۹۸۷

فیروز[1] خان نون، خضر ہیں نہ برق ہیں
درپردہ اپنے ملک کے حاکم کلرک ہیں

اپنی خرابیوں کا ہے مختصر فسانہ
اقوالِ عارفانہ ــــ اقدام احمقانہ

شکل جیسی کیسی ہے، دیسی یا بدیسی ہے
غیر فانی چیزوں میں اک بُرو کریسی ہے

---

[1] سر فیروز خاں نون، سر خضر حیات ٹوانہ اور میاں ابراہیم برقؔ جو ایک زمانے میں پنجاب میں وزیر رہے۔

خرابی

کام تو ہم نے چند خوب کیے
اک خرابی مگر ہوئی ہم سے
اپنی توفیق سے زیادہ جیے
کوہ سے آخرش ہوئے کائی

موت ہی وقت پر نہیں آئی

دھونس سے ڈر کر ووٹ نہ دینا
نوٹ کے اوپر ووٹ نہ رکھنا
جمہوریت اک گنبد ہے
گنبد پر اخروٹ نہ رکھنا

کردار

نُدرت، افکار سے آتی ہے
شہرت، اخبار سے بنتی ہے
طاقت، تلوار سے آتی ہے
دولت، بازار سے بنتی ہے
قامت، دستار سے اُٹھتی ہے
عادت، اطوار سے بنتی ہے

لیکن — ملکوں اور قوموں کی
قسمت — کردار سے بنتی ہے

❋

نہ ہو جس کے آگے کھڑا آدمی
ہے بے کار اتنا بڑا آدمی

نیویارک

یوں ہوا محسوس

اس زر مقتدر

دلِ مضطرب ، جاں منتشر نیویارک میں

جس طرح —

موتی — 'دہانِ شارک' میں —

پھولوں کی قبریں 'پارک' میں

پاپ موسیقی کا ایک سیلاب اُمنڈا ہے مگر

مرگئے سُر 'لارک' میں

ڈین ور - امریکا ——————— ۱۸ ستمبر ۱۹۸۷

(عزیزم امتنان ضمیر کے گھر)

دودھ پانی

غیر کے نہری رقبے سے اپنا بنجر بارانی اچھا
شہری انجانوں سے اپنے گاؤں کا بابا جانی اچھا
مصری سے ملتانی بہتر، بصری سے بجرانی اچھا
لندن پیرس سے اپنا یہ ڈیرا — غازی خانی اچھا
قرض کے ریشم سے ہم کو اپنا پتھر یولاقی اچھا
مانگے تانگے دودھ سے لوگو اپنا سادہ پانی اچھا

امریکا کا خیبر پاس

[امریکا کی ریاست کلارادو کے صدر مقام ڈین ور میں ایک کروڑ پتی افغان نے 'خیبر پاس' نام سے ایک طرب خانہ (کیبرے) قائم کر رکھا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ بیرونی پری چہرگان اُس میں رقص و نغمہ کا جادو جگاتی ہیں اور بعض مسلمان ملکوں کے دولت مند تارکینِ وطن اور سیّاحین جو یہاں فرصت و فراغت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، دادِ عشرت دیتے ہیں]

'خیبر پاس' کی گردشِ گاہِ جام و سبو میں
'دوشانی' کا شب بھر
رقصِ نیم برہنہ — کیا کہنا
خوش ڈالر — عربوں، افغانوں
ایرانی اوقات گروں کا
نغمہ و رقص کی مے مستی میں

ڈوب کے بہنا — کیا کہنا
سحرِ جسم و خیال میں رہنا — کیا کہنا

پھول نگر کے پتّھر لوگو!
شاہد باز تونگر لوگو!
بے معنی — بے لنگر لوگو!
جسموں کے سوداگر لوگو!
بھول گئے تم اس خیبر میں
اُس خیبر کو
جس کے پتھریلے درّوں میں
خون کا اک سیلاب رواں ہے
بھول گئے تم
لاکھوں بھوکے ننگے، بے گھر افغانوں کو
جن کے لہو نے ہر پتّھر پر
ایک امر تحریر لکھی ہے
عظمت کی تفسیر لکھی ہے
صدیوں کی تقدیر لکھی ہے

بھول گئے تم ؟
اُن زخمی گورستانوں کو
جن سے بھر گئیں ، شیراز و طہران کی گلیاں
بھول گئے تم !
مشہد و قُم کے سوگ میں ڈوبے میناروں کو
اپنے بجھتے بازاروں کو
چادرِ آبِ ہُرمز میں جو آگ لگی ہے
بھول گئے تم اُن شعلوں کو !

امریکا کے ڈالر مستو ! جام پرستو !
یہ جو خیبر پاس ہے لوگو
عبرت کا بَن باس ہے لوگو !
تم کو کچھ احساس نہیں ہے
بہکے لوگو یہ میخانہ اپنا خیبر پاس نہیں ہے

ڈین ور ۔ امریکہ ——————— ۲۰ ستمبر ۱۹۸۷
(عزیزم امتنان ضمیر کے گھر)

پیش رفت

تسخیرِ کائنات کے قائل نہیں تھے ہم
تیروں کے سامنے سے نشانے گزر گئے
کھائے بغیر تو نہیں گزرا ہے کوئی دن
سوچے بغیر کتنے زمانے گزر گئے

صداقت

موقف کی صفائی بعد ناکامی نہ کہہ ہمدم
جہاں پر ابر ہوتا ہے وہاں برسات ہوتی ہے
جنونِ جنگ میں جھوٹ اور سچ کب کس نے پرکھا ہے
صداقت تو ہمیشہ فاتحوں کے ساتھ ہوتی ہے

عجیب لوگ

(امریکا میں لوگوں سے اپیلیں کی جا رہی ہیں کہ فر کے لباس پہننا ترک کر دیں)

کیا عجیب لوگ ہیں
لومڑی کے سوگ میں
کالر اور کوٹ سے
فَر اُتارے جاتے ہیں
لیکن اپنے دور مار راکٹوں، بمباروں سے
ایٹمی انگاروں سے

دور کی زمینوں پر
دوسروں کے شہروں میں
بے گناہ لوگوں کو — روز مارے جاتے ہیں
لومڑی کے سوگ میں
کوٹ اور کالر سے ، فَر اُتارے جاتے ہیں
کیا عجیب لوگ ہیں

نیویارک ——— ۲۵ ستمبر ۱۹۸۷

زخمِ ہنر

کس کس ہنر میں آج ترقی نہیں ہوئی
کیا کیا شرفِ بشر پہ اتارا نہیں گیا
تہذیب کے کمال کا یہ رخ بھی دیکھیے
کس کس طرح سے آدمی مارا نہیں گیا

❋

کوئی چیز جوان دِلوں میں دھڑکن بن کر گاتی ہے
ماں جب بیٹی کے پیراہن میں زنجیر لگاتی ہے

ضرورت

زندگی ہموار میداں کا تسلسل تو نہیں
زندگی ہیجان بھی ہے زندگی بحران بھی
گھر کی رونق ایک ہنگامے پہ ہے موقوف جب
ہے ضروری گھر میں کوئی بیوقوف انسان بھی

شاعر اور شخص

میں شعر و ادب کے ناطے سے
طالب ہوں حضرت غالب کا
شعرِ غالب
مہرِ غالب
سحرِ غالب
اللہ — اللہ!

میں جب بھی غالب پڑھتا ہوں
میرے سامنے غالب ہوتا ہے
اسداللہ خان نہیں ہوتا

مچھلیوں کی عیادت

(کسی زہریلی گیس کی یورش سے امریکا اور کینیڈا کی مچھلیوں کی وبائی علالت پر)

ان حسیں جھیلوں کی الّھڑ مچھلیاں بیمار ہیں
ریشموں میں ریشماں کی پسلیاں بیمار ہیں

کارخانوں کے دھوئیں سے کھڑکیاں بیمار ہیں
بوڑھیاں مضبوط لیکن لڑکیاں بیمار ہیں

باغ تو ساری زمیں بے شک بنا ڈالی مگر
باغ میں یہ قریہ ہائے چرسیاں بیمار ہیں

رنگ کیا چمکے کہ موسم برف سے جاگا نہیں
گیت زخمی ہیں کہ موہن مُرلیاں بیمار ہیں

محنت و سرمایہ کا رشتہ سمجھ آیا نہیں
'گوریاں' بیمار ہیں یا بوریاں بیمار ہیں

ہر سہولت ہے میسّر پھر بھی دل بے چین ہیں
ہیر کی گردن میں گویا ہنسلیاں بیمار ہیں

گھر کی ویرانی کی قیمت پر نگر آباد تھے
پتّھر آسودہ ہیں لیکن بستیاں آباد ہیں

لالہ مصری خان نے نرسوں کے بارے میں کہا
'جُرسیاں' اچھی ہیں لیکن 'نَرسیاں' بیمار ہیں

مستری حیراں ہیں ماہ و مُشتری کی جنگ پر
اک زمیں پر سات کے سات آسماں بیمار ہیں

ناؤں کی خاطر یہ مولاناؤں[1] کے جھگڑے ضمیر
اللہ اللہ — کیسی کیسی ہستیاں بیمار ہیں

اٹاوہ - کینیڈا ——— ۲۷ ستمبر ۱۹۸۷

---

[1] تارک وطن مسلمانوں کے اندرونی مناقشات کی طرف اشارہ ۔

موجود ہو کے گھر میں بھی گھر پر نہیں ہوں میں
خود اپنے آپ کو بھی میسّر نہیں ہوں میں

اپنی شناخت اپنے حوالے سے معتبر
باہر کسے ملوں گا کہ اندر نہیں ہوں میں

مجھ سے تجھے ہے کاغذی بادام کی طلب
جہلم ہوں میری جان پشاور نہیں ہوں میں

مہتر ہوں کہتروں میں بھی چوغوں میں بھی چُغد
سر گو مُنڈا ہوا ہے قلندر نہیں ہوں میں

چورستہ

نظر کی تیرگی نے کس قدر دھندلا دیا منظر
عجب کیا ہے جو ہم چوراستوں میں راہ کھو بیٹھے
ہمیں جانا کہیں تھا اور کہیں جاتے رہے برسوں
بالآخر اپنی بھوری بھینس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے
گدھے کی دُم کو خالص گھی سے چمکاتے رہے برسوں

معیار

وہ کتاب الفاظ کا دیمک زدہ انبار ہے
دل میں جو امید کی قندیل کو مدھم کرے
میں تو بس اس لفظ کو زندہ سمجھتا ہوں ضمیرؔ
جو تھکے ہارے ہوئے انساں کو تازہ دم کرے

زندہ دل بوڑھا

ہم نے دیکھا ایسا بھی اک بوڑھا ستّر سال کا
کوئی میچ نہ چھوڑے ہاکی، کرکٹ اور فٹ بال کا
کندھے پر برساتی دیکھو
چوڑی چکلی چھاتی دیکھو
اچھّا خاصّا نیک خصائل
لیکن خوش اوقاتی دیکھو
کتنی رغبت سے کھاتا ہے
نان، کباب، چپاتی دیکھو

رسیا ماش کی دال کا
سر پر ہے مہران کی ٹوپی، جوتا ہے چکوال کا
چوغہ ہے چترال کا
ہم نے دیکھا ایسا بھی اِک بوڑھا ستّر سال کا

چوک میں آکر — میاں سکندر
پاس پڑوس کے، اُجلے گھیلے لڑکوں اندر
دم دم دم دم دم —— مست قلندر
ہنس ہنس بولے، رَل مِل کھیلے
چُوسے گنّے — کھائے کیلے
ہانپے —— لیکن ڈنٹر پیلے
کانپے —— پھر بھی پالا جھیلے
ہولے ہولے گائے گانے
جیب میں ٹافی — مُرغی دانے
کوئی تازہ میوہ فصلی
پیچھے اک کُتّا دو نسلی

بٹّی میں خرگوش کی پسلی
گردن میں پیتل کی ہنسلی
ہاتھوں میں چاندی کے چھلّے
اس بوڑھے کے بلّے بلّے
اِس سن میں بھی جیسے چھَیل چھبیلا جھنگ سیال کا
ڈھنگ انوکھا چال کا
رنگ اُجلا رومال کا
ماہ و سال کی بات نہیں ــــ ہے سارا کھیل خیال کا
ہم نے دیکھا ایسا بھی اِک بوڑھا سترّ سال کا
کوئی میچ نہ چھوڑے ہاکی، کرکٹ اور فٹ بال کا

ـــــــــــــ ۱۰ دسمبر ۱۹۸۷ء

❋

عالم جو 'بے عملا' ہو
فاضل جو 'بے فضلا' ہو
شاعر جو 'بے غزلا' ہو
دانش وَر جو 'یملا'[1] ہو

❋

گولی ہے بندوق اندر
لیکن ہے صندوق اندر

---

[1] پنجابی لفظ - بدحواس

خَیر کی بات خَیر جانے دو
منفرد تو ہوئے زمانے میں
جب سے کالج گیا ہے نورِ نظر
والدِ محترم ہیں تھانے میں

بے کتابے

پوٹھوار کی باتیں

وطن سے دور اپنے ایک پوٹھواری شناں سے ملاقات ہوئی تو شہر یاراں راولپنڈی اور وادیِ راول کی تابدار یادیں ذہن میں جگمگا اٹھیں (ض)

اُس وادیِ حسن و شباب و گلاب و بہار و خمار کی باتیں کر
جوئے گلزار کی باتیں کر ــــ ابرِ کہسار کی باتیں کر
نیلی، چمکیلی وادی کے دلبر اشجار کی باتیں کر
کچھ اپنی پیت کے گیت سنا کچھ میرے پیار کی باتیں کر
آ دل سے دل کی دھڑکن سن، آ یار سے یار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بن شمزہ خاں مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر

اِس کاروباری منڈی میں ، ہر چالی دولت والی ہے
چہرے دل پہ اگرچہ زردی ہے ، دیواروں پر خوشحالی ہے
دھنوان کی توند مثالی ہے ، رمضان کی پاکٹ خالی ہے
میرا جوتا چکوالی ہے ، تیرا بستر تربالی ہے
یہ کھاٹ دھری ہے بیٹھ بھی جا اور جہلم پار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بن شمزہ خاں ، مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر

آ روٹی کھا ، لے حقّہ پی ــــ ہاں شیخ نذیر کی باتیں کر
اُس بدرِ منیر کی باتیں کر ، اُس جانِ ضمیر کی باتیں کر
اِس دل سے درد کا دُکھڑا کہہ ، اِس زخم سے تیر کی باتیں کر
اُس رندِ کبیر ، ادیبِ شہیر ، امیرِ فقیر کی باتیں کر
تو بے شک اُس کی باتوں میں راجا بازار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بن شمزہ خاں مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر

لے : اُردو کے منفرد مزاح گو شاعر ۔

کیا اب بھی گھوڑے روڑے ہے وہ شب کو بھرے بازاروں میں
جُوں شبنم سبزہ زاروں میں، جُوں شعلہ راجکماروں میں
وہ سیر سپاٹے، دھوم دھڑکے، ڈھول ڈھمکے، یاروں میں
فطرت[۲]، اصلاحی[۳]، گزن[۴]، عزیز ملک[۵] سے خوش گفتاروں میں
بے شک بیکار کی باتیں کر لیکن اِن چار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بِن شمزہ خاں مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر

کیا ساون کے ساون اب بھی نَدّی[۶] میں روانی آتی ہے
سردی برفانی جاتی ہے، گرمی طوفانی آتی ہے
اُس چشمۂ راول کی شہری دختر پہ جوانی آتی ہے
لہر لہر سہانی اُٹھتی ہے، ہر موج دِوانی آتی ہے
دَھن آتا ہے یا جاتا ہے، من سے منجدھار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بِن شمزہ خاں، مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر

[۲] پوٹھوار کے بابائے اردو عبدالعزیز فطرت مرحوم [۳] ابوصالح اصلاحی مرحوم اڈیٹر روزنامہ "کوہستان"
[۴] راولپنڈی کے ہر دلعزیز طبیب اور ظریف شاعر ڈاکٹر غضنفر علی گزن [۵] صاحب طرز انشا پرداز عزیز ملک [۶] نالہ لئی

اربابِ ذوق کے حلقے سے کچھ نقد و نظر کی بات سنا
تسخیرِ معانی کی خاطر، ترمیم ہنر کی بات سنا
استاد ظفر[۷]، اکرام قمر[۸]، آغا بابر[۹] کی بات سنا
راشد[۱۰] کی نظم معریٰ کے اندر باہر کی بات سنا
اپنی پوٹھواری بولی میں اردو اشعار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بن شمزہ خاں مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر

کیا بزمِ کشید[۱۱] ادب میں فرسودہ تفسیریں ہوتی ہیں؟
معشوق کے چشم و ابرو سے غزلیں شمشیریں ہوتی ہیں؟
مکھڑے ڈکھڑے بن جاتے ہیں، زلفیں زنجیریں ہوتی ہیں؟
فردا کے قوانی کے آگے، ماضی کی ضمیریں ہوتی ہیں؟
ہاں ضبط نہ کر، بے ربط ردیف سلسلہ وار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بن شمزہ خاں مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر۔

---

۷ ممتاز شاعر یوسف ظفر ۸ ممتاز صحافی اکرام قمر ۹ ممتاز افسانہ نگار آغا بابر ۱۰ نظم جدید کا بانی ن۔م راشد ۱۱ شہر میں اسلوبِ قدیم کے سخنوروں کی انجمن۔

آغا جیلانی[12]، حسن و جمال میں یوسفِ ثانی کیسا ہے؟
وہ قاضی[13] شہر نذیر ۔ شہیر ابرہانی کیسا ہے؟
فاضل تعمیری[14] ۔ حافظ مظہر کوھستانی کیسا ہے؟
مسعود[15] وہ میرا اونچا لمبا دلبر جانی کیسا ہے؟
تو ہر کردار کی باتیں کر، اپنے معیار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بن شمزہ خاں مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر

یا ہُو، یک نعرۂ مستانہ، گُل کر گبھرو مستانوں کی
مُندری، منکے، مُرلی والے، چن پیر، علی مردانوں کی
ماتھوں پہ تپش ویرانوں کی، آنکھوں میں سحر افسانوں کی
وہ میلے، منڈھی، مجُرے میں دھپ دھوم سخی سلطانوں کی
چیتوں کے کچھار کی باتیں کر، شیروں کے شکار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بن شمزہ خاں، مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر

---

[12] راولپنڈی کے ممتاز شہری آغا غلام جیلانی [13] خان بہادر قاضی نذیر احمد ایڈووکیٹ [14] محمد فاضل ایڈیٹر روزنامہ تعمیر، [15] نامور نعت گو شاعر حافظ مظہر الدین رکن ادارہ کوہستان [16] کرنل مسعود احمد

ہاں! سائیںؒ، وارث، ملکھی بلّہے، بُردے کے ابیات سنا!
کھڑتال نہیں تو نال بجا، سُرتال سے دل کی بات سنا!
لب کھول میاں، کچھ بول میاں، رس گھول میاں نغمات سنا!
دُھن میٹھی، باتیں پیاری ہیں، یہ باتیں ساری رات سنا!
ہر چنچل نار کی باتوں میں، اپنی گلنار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بن شمزہ خاں، مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر

رفلوں، پستولوں والے شیر دلیر مجھے یاد آتے ہیں
جو کالی بھینسیں دوہتے ہیں اور چٹّا مکھن کھاتے ہیں
دنگل میں دھوم مچاتے ہیں، جنگل میں باز اڑاتے ہیں
عزّت کے تمغے پاتے ہیں، زخموں سے پھول کھلاتے ہیں
تمثیلاً — 'لاچے' والے چاچے صوبیدار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بن شمزہ خاں مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر

---

۱۷ : پنجابی زبان کے مقبول شعرا

وہ صحت و غیرت جس کا ہر مظہر غیرت مندانہ ہے
دن محنت کی مزدوری ہے، شب راحت کا نذرانہ ہے
مُونچھوں کا چھتر شاہانہ ہے، ناکوں کا تَبسر ترکانہ ہے
مَردوں کی جلالت کیا کہنا عورت کی ادا مردانہ ہے

شعلوں میں شمیم، صبا میں ثبات، وفا میں وقار کی باتیں کر
او حمزہ خاں بن شمزہ خاں مجھ سے پوٹھوار کی باتیں کر

(۱۹۶۰ء)

○

بہت سے اجنبی کھیتوں کی روٹی ہم نے کھائی ہے
مگر خود اپنی گندم کے نوالے اور ہوتے ہیں
پھر اپنی زندگی کا سالِ نَو آیا — خوش آمد !
حوالاتِ زمانہ کے حوالے اور ہوتے ہیں
کوئی قوس و کلس، دیوار و در ہوتا نہیں جن کا
وہ معبد، مسجدیں، مندر، شوالے اور ہوتے ہیں
نکالا چاہتا ہے کام 'جُوتوں'[1] سے عبث غالب
تری محفل میں آکر جانے والے اور ہوتے ہیں

---

[1] میرزا غالب کے مصرعے میں گستاخانہ تصرف

یہ مانا آپ بیرسٹر ہیں ۔ نکتہ بین و نکتہ دَر
ہجومِ ووڑاں ، گر ماننے والے اور ہوتے ہیں
کئی نامی بزرگ اپنی نگاہوں سے بھی گزرے ہیں
اندھیرے اور ہوتے ہیں ، اجالے اور ہوتے ہیں
قلم پر قد لگاتے ہیں —— خبر جن کو نہیں یہ بھی
کہ شتروں اور گھوڑوں کے رسالے ، اور ہوتے ہیں

دیوان ہاؤس

اصغر مال راولپنڈی

۲۵ مارچ ۱۹۸۰ء

○

کمی سکّوں کی مسلسل زیادتی پر ہے
کہ شہد لفظ میں اور ہاتھ لبلبی پہ ہے
مناؤ خاک نشینوں کی ' گولڈن جُبلی '
قلندری کا جھروکا سکندری پر ہے
محاذِ جنگ پہ تیر و کماں بھی لے کے چلو
مدار فتح کا ہر چند آدمی پر ہے
فراغتوں کا مدینہ کہاں بسائیں گے
وہ جن کا نانِ شبینہ گداگری پہ ہے
معاملاتِ زَن و مَرد اور ہیں ــــــ ورنہ
کبوتروں کا تو سب کچھ کبوتری پہ ہے

امید رکھ نہ کسی سانجھ سکھ سہولت کی
کہ ہر صدی کی نحوست اِسی صدی پر ہے
عجب نہیں ہے کہ چندے وہ سرد مہر رہے
مزاج یار ابھی نِصف فروری پر ہے
ہنوز افرِیقا و ایشیا کا نرخ نہ پوچھ
مدار تیسری دنیا کا "لاٹری" پر ہے
ضمیرؔ کیسے نگارِ وطن دولخت ہوئی
یہ استغاثہ تجھی پر نہیں سبھی پر ہے

۲۲۔ فروری ۱۹۸۳

○

جس سیاست کا چلن ہوگا سیانوں کے بغیر
کرسیاں چلتی رہیں گی پائیدانوں کے بغیر
لیڈری، بے کیف ہوتی ہے بیانوں کے بغیر
جس طرح اردو کی فلمیں 'ناچ گانوں' کے بغیر
کوچہ و بازار میں طفلاں بے درس و کتاب
جس طرح بیمار کلیاں باغبانوں کے بغیر
برف ہے پوشاک اپنی، دھوپ اپنا سائباں
پھیلتی جاتی ہے آبادی — مکانوں کے بغیر
ناخنوں ہی سے کھلا کرتی ہیں اُلجھی گتھیاں
مرحلے آساں نہیں ہوتے جوانوں کے بغیر

کس قدر ویراں ہوا جاتا ہے دل پردیس میں
اپنی سلماؤں اور اپنے 'لال خانوں' کے بغیر
کاش انساں کی نموتکمیل پا سکتی، کہیں
کاش کوئی مُلک ہوتا 'جیل خانوں' کے بغیر
ایک سیلِ رنگ ہے اُٹھتی جوانی کا لہو
'لالیاں' ہونٹوں پہ آجاتی ہیں 'پانوں' کے بغیر
زندگی میں ناگہاں خوشیاں بھی ملتی ہیں ضمیر
جس طرح چڑیوں کے انڈے، آشیانوں کے بغیر

۲ اکتوبر ۱۹۷۷

○

ہر بات دل میں نقش ہے سَر جان مُور کی
جب سے بنی ہے تازہ حجامت شعور کی
کچھ ہم نے خود بھی منزلِ نزدیک دُور کی
ہر "لاضرور بات" ——— عموماً ضرور کی
جنّت میں آرزوے شرابِ طہور کی
دنیا میں کی پسند چٹائی کھجور کی
لیڈر کا خال وخد قدوقامت عوام میں
جس طرح پھلکیوں میں چپاتی تنور کی
شاکی فراق کا تو گریزاں وصال سے
کیا بات ہے ہمارے دلِ ناصبور کی

ہم سمجھے ذکرِ حذر و قصور و ظہور ہے
وہ بات کر رہے ہیں ولایت کے 'ٹُور' کی
ہر لفظ ہاتھ میں تھا ـــــ ہتھوڑا لیے ہوئے
دیکھی ہے یہ ادا بھی کسی کے غرور کی

۲۵ نومبر ۱۹۷۸

○

منزلوں کی جگہ راستہ لکھ دیا
لکھنے والے میرے حق میں کیا لکھ دیا

درد کو نسخۂ کیمیا لکھ دیا
نام کس چیز کا ارتقا لکھ دیا

مَیں تو اِس کے اک اک لفظ سے جل اٹھا
خط لکھا یا خطِ استوا لکھ دیا

کب کچہری لگی — کب گواہی ہوئی
منصفوں نے مگر فیصلہ لکھ دیا

شیخ صاحب بجا مجھ سے ناراض ہیں
میں نے 'استرا' کو بھی استرا لکھ دیا

سب نگر ایک سے ہیں مگر بام پر
کوئٹہ لکھ دیا ـــــ ٹیکسلا لکھ دیا
میں نے پوچھی تھی تاریخِ وصل آپ سے
آپ نے سارا جغرافیہ لکھ دیا
اے عزیزانِ فردا تمھیں کیا خبر
ہم سے جیسے بھی لکھا گیا ـــ لکھ دیا

اوکاڑہ

(بر مکان برادرم سیّد ریاض حسین جعفری) ۲۵ جنوری ۱۹۸۳

کبت

علم، دانائی بغیر!
اُسترا ، نائی بغیر
دودھ ، بالائی بغیر
آنکھ ، بینائی بغیر
علم دانائی بغیر!
دشت سے عہدِ وفا
آبلہ پائی بغیر
راج ، بے ملک و ملوک
تاج ، دارائی بغیر

علم، دانائی بغیر!
نافہ ہو بے مُشک بُو
فن ، پذیرائی بغیر
رات ، تاروں سے تہی
بات ، سچائی بغیر
علم، دانائی بغیر!
شہر، بے دیوار و در
بحر، گہرائی بغیر
عقل ، بے ذوقِ سلیم
عدل ، شنوائی بغیر
تربیت ماں کے سوا
تقویت ، بھائی بغیر

جیسے شام دوستاں
مجھ سے ہرجائی بغیر

۳۰ جولائی ۱۹۷۸

تیل کا بحران

دنیا کے تِلوں سے تیل گیا
جب تیل گیا، سب کھیل گیا
اُمریکی ڈالر، زرد ہوا
انگریز کا چُولھا سرد ہوا
جاپان دھائی دیتا ہے
حیران دکھائی دیتا ہے
اب ڈالر ڈالو ایندھن میں
اب ڈوبو اُبھرو، گیلن، میں

اب موٹر بے پٹرول ہوئی
اور شوق کی دنیا گول ہوئی
لو تیل نے پردہ داری کی
لو ٹوٹی تان گراری کی
جب دُھن کا بھبکا جلتا ہے
تب انجن دو گز چلتا ہے
انجن میں تیل کی دھار نہیں
کشتی ہے مگر پتوار نہیں
کب موٹر رکشا لاری ہے
پھر تانگوں کی سرداری ہے
پھر گھوڑے کی جولانی ہے
اب اونٹ بھی یوسفِ ثانی ہے
مانا پٹرول تو عام نہیں
پر وقت کا پیّا جام نہیں

(۱۹۷۴ء)

○

گیسو و رُخ سے جو ریشم جان ہے
نام اس لڑکے کا رستم خان ہے

یہ نئی تہذیب کا احسان ہے
میکدہ آباد گھر ویران ہے

گھاس کا جلتا ہوا کھلیان ہے
یہ ہمارا ——— 'ماڈرن انسان' ہے

یہ زمین تیری نہیں ——— میری نہیں
روس و امریکا کا دستر خوان ہے

اونٹ ، گھوڑا ، خر عبث بدنام ہیں
سب سے مشکل جانور انسان ہے

شعر میرا صورتِ حالات پر
تبصرہ ہے اور بلا عنوان ہے
قبر میں یہ پُرسشِ مُنکر نکیر
موت بھی پولیس کا چالان ہے
شاعری میں نام کیا پاتا ــــ ضمیرؔ
وہ کبھی شاعر، کبھی کپتان ہے

(۱۹۷۴ء)

○

کام آدھا ہوا کہ سارا ہوا
جس قدر بھی ہوا اُدھارا ہوا
اور خستہ ہوا کرارا ہوا
وہ تو غصّے میں اور پیارا ہوا
جاہلِ مُنعم و جواھر پوش
جس طرح بیل ہو 'سنگارا' ہوا
یہ قبائے گراں ــــــ کُلاہِ بلند
آدمی یا کوئی منارا ہوا
شیر مانگا تھا ــــ لومڑی دیکھی
کس خرابی کا استخارہ ہوا

دیکھنا ـــــ دونوں حاکموں کا فرق
ایک اُترا تو اک اُتارا ہوا

ہم بھی زندہ تھے ، اس زمانے میں
جس میں لوگوں کو "گوشوارہ"[۲] ہوا

آرزو پوچ تھی جو پوری ہوئی
کام کس کام کا جو سارا ہوا

ہائے وہ میرے گاؤں کی صبحیں
جیسے مکھن سے گھی 'نتارا' ہوا

جی سکا نہ کسی مسیحا سے
آدمی ـــــ آدمی کا مارا ہوا

اُس کو رنڈوا پکارنے والو
وہ تو کہیے کہ پھر کنوارا ہوا

پھُول سے رخ پہ یہ بڑی عینک
ناک ہی کا فقط نظارہ ہوا

(جہلم چھاؤنی) ۱۹۷۸ء

---

[۱] آراستہ [۲] مارشل لا کی حکومت کی طرف سے آمدنی کے گوشوارے داخل کرنے کا حکم

پانچ بڑے راشیوں کی کانفرنس

(تعارفی اجلاس)

(۱)

بھُربھراتی ریت کی سڑکیں بنا لیتا ہوں میں
"سریا و سیمنٹ" کی قیمت لگا لیتا ہوں میں
پُل بناتا ہوں بظاہر خوبیِ تعمیر سے
لیکن اِس نیت سے، اِس منت سے اس تدبیر سے

(ق)

بے تکلف، جنبشِ موجِ ہوا سے گر پڑیں
ریل کی دہشت سے، موٹر کی صدا سے گر پڑیں

میرے گھر میں ہے خدا کے فضل سے جتنا بھی مال
فی الحقیقت ہے وہ میری بے کمالی کا کمال

(۲)

کام جتنا سخت بھی ہو ، نرم کر لیتا ہوں میں
پہلے ہر 'لوہے' کی مٹھی گرم کر لیتا ہوں میں
شبھ مہورت ، نیک ساعت پر کیلنڈر دیکھ کر
اپنا 'ٹنڈر' ڈالتا ہوں ، سب کے ٹنڈر دیکھ کر
افسرانہ رقص کے سُر تال مجھ کو یاد ہیں
نذر کی رت ، ڈالیوں کے سال مجھ کو یاد ہیں

(۳)

نہر کے رقبوں کو بارانی بنا دیتا ہوں میں
بنجروں کو جنّتِ ثانی بنا دیتا ہوں میں
کاشتکاروں کی گزر اوقات میرے ہاتھ میں
قحط میری جیب میں ، برسات میرے ہاتھ میں
میری روزی ، جاں فروزی ، حلوہ حلوہ شیر مال
انتقال و اِنتقال و اِنتقال و اِنتقال

(۴)

نوٹ مل جائے تو لکھ دوں میں خدا کی بھی رپورٹ
ورنہ کب لکھتا ہوں جُرمِ برملا کی بھی رپورٹ
ہے یہ حکمِ مستقل رمضان نمبردار کو
گھر میں خدمت کے لیے بھیجا کرے دو چار کو
ساونی راتوں میں رقص جام و پیمانہ بھی ہو
سانولی میراثنوں کے ساتھ دوگانہ بھی ہو

(۵)

اے بزرگو، پیشواؤ! گو ابھی چھوٹا ہوں میں
ہاں مگر جتنا بھی ہوں، سرتا قدم کھوٹا ہوں میں
دل کی کالک جیسے جیسے کچھ بہم ہو جائے گی
جو کمی ہے رفتہ رفتہ وہ بھی کم ہو جائے گی
ہم ہیں متروکہ مکانوں اور دکانوں کے امام
دن اگر ہوٹل میں کٹتا ہے تو مے خانے میں شام

(۲۲ نومبر ۱۹۵۰)

ؔ بعد میں سیاسی رشوت کی گرم بازاری میں یہ بڑے بہت چھوٹے ہو کر رہ گئے۔ (ض)

یہ ہمارا بیان ہے پیارے

تعارف کا بھلا محتاج ہے نام و نشاں میرا
کہ نعرہ گونجتا ہے از زمیں تا آسماں میرا
کبھی میٹنگ یہاں میری کبھی جلسہ وہاں میرا
جلوسوں میں رواں رہتا ہے دریائے رواں میرا
دھرا رہتا ہے ہر اخبار میں تازہ بیاں میرا

نہ میں شمشیر، نے تحریر نے تدبیر رکھتا ہوں
بجائے دل، زباں پر درد عالمگیر رکھتا ہوں
ہر دا دے یہی اک نسخۂ اکسیر رکھتا ہوں
گلے میں زور، لب پہ نعرۂ تکبیر رکھتا ہوں
مرے نعروں پہ اُڑتا جا رہا ہے کارواں میرا

مسلسل کوریا، منچوریا کو رو رہا ہوں میں
بڑی زرخیز مٹی میں یہ دانے بو رہا ہوں میں
ابھی تک 'نیشنل' شہرت کا لیڈر گو رہا ہوں میں
بڑی تیزی سے 'انٹرنیشنل' بھی ہو رہا ہوں میں
عرب ہے راز داں میرا، عجم ہے ترجماں میرا

الیکشن کی ہوا کتنی سرور انگیز ہے ساقی
اگرمے تیز ہے تو اشتہا بھی تیز ہے ساقی
"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی"
ی قسمت کہ اب تک ذات کا انگریز ہے ساقی
جو سمجھا ہے نہ سمجھے گا کبھی سود وزیاں میرا

عموماً دو جہاں سے برسرِ پیکار رہتا ہوں
خصوصاً اپنی مِلّت سے بہت بیزار رہتا ہوں
اُصولاً میں بڑا باغی ہوں، ناہموار رہتا ہوں
وصولاً جو ملے ہر کام پر تیار رہتا ہوں
خریدے جس کا جی چاہے ضمیرِ بے کراں میرا

۲۲ اگست ۱۹۵۱ — ۵۴ کومیلا لائن ملیر چھاؤنی

عُذر

بہرِ نمازِ عید بھی حاضر نہ ہو سکوں
مانوس اس قدر بھی نہیں اپنے گھر سے میں
"اُسے رحمتِ تمام مری یہ خطا معاف"
حاضر نہ تھا خطیب کے خطبے کے ڈر سے میں

لے جگر مراد آبادی کا مصرع بہ تصرف یک لفظی

وجہِ فساد

حکومت اور 'اپوزیشن' کی دھینگا مشتیاں توبہ
کہ جو بھی بات نکلی خشمگین و آتشیں نکلی
یہ ساری خانہ جنگی ہے بپا اک لفظ 'حسرت' پر
وہ کہتے ہیں کہ نکلی ہے، یہ کہتے ہیں نہیں نکلی

حاجی لق لق کی نذر

ہماری مزاحیہ شاعری کا بچپن حاجی لق لق کی پھلجھڑیوں کی جوانی کا زمانہ تھا
مفہوم کی سمت کی نشاندہی کے لیے حاجی صاحب اپنی غزلوں پر عنوان دیا کرتے
جو بجائے خود بڑے انوکھے ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک غزل کا عنوان فوجی غزل
بھی تھا کہ حاجی صاحب پہلی جنگ عظیم میں عراق کے محاذ پر دادِ شجاعت دے
چکے تھے۔ چند اشعار ہم نے بھی ان کے رنگ میں کہے جن کو اپنے شعری سفر کی
نشاندہی کے طور پر اس مجموعے میں شامل کرنا مناسب سمجھا کہ ہر انسان اپنے ماضی کا ورثہ بھی تو ہے۔
(ض)

گلباز خان

یہ جو گلباز خان ہے پیارے
آفریدی پٹھان ہے پیارے
تیرے سب خاندان پر عاشق
اس کا سب خاندان ہے پیارے

(۱۹۳۶)

یاغستانی غزل

کالا کالا گھٹا جو چھایا ہے
میرے توبہ کا موت آیا ہے
جانِ گلباز خان تیرے لیے
'اُم' نے شلوار اِک سلایا ہے
تیرا کان اسطرح کھڑا ہے کیوں
تجھکو دشمن نے کچھ سکھایا ہے
تم فقط: بات آزماتی ہو
"اُم" نے تو ہاتھ آزمایا ہے
کبھی دیکھو کہ کیسے خیبر میں
"ام" نے انگریز کو بھگایا ہے

(۱۹۳۶ء)

کالجی غزل

(۱۹۳۷ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں زمانۂ طالب علمی میں لکھی گئی)

یہ جو گجرات کے سکندر ہیں
فیل ہو کر بھی کیا چھقندر ہیں
رول نمبر ہی آٹھ تھا اپنا
امتحاں میں بھی آٹھ نمبر ہیں
دل کی 'بزمِ[1] فروغِ اردو' کے
آپ اے جانِ من سکتّر ہیں
بال تو تھے ہی، جال ٹینس کا
گال بھی سُرخ 'آرٹ پیپر' ہیں

---

[1] کالج کی ادبی انجمن جس کی بنیاد پروفیسر ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے رکھی۔

ہاے وہ ساکنانِ یوئینگ[2] ہال
میر صاحب کے تیر و نشتر ہیں
یہ ہوا ہے نیا لباس ایجاد
ایک بنیان — تین کالر ہیں
ہم سے کیوں دور دور رہتے ہو
جُفت دونوں کے 'رول نمبر' ہیں
وہ اُدھر طاق ہیں ریاضی میں
ہم اِدھر فارسی میں فرفر ہیں
میں بھی اُن کو سلام کرتا ہوں
جن کے عبدالسلام[3] لیڈر ہیں
اُن کے پھاٹک میں یوں کھڑے تھے ہم
جیسے ہاکی کے گول کیپر ہیں
تابشؔ[4]، اخترؔ، ضمیرؔ اور مختارؔ
شاعرانِ شباب آور ہیں

---

[2] مشن کالج لاہور کا خوبصورت ہوسٹل [3] ممتاز ادیب و دانشور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
[4] نامور شعرا اختر ہوشیار پوری، جماعت علی تابش اور مختار صدیقی۔

شناخت پریڈ

شناخت پریڈ

جج (گواہ سے)

ملزم کا ناک نقشہ معلوم ہو تو کہیے !
حالات زندگی کے
دِن رات زندگی کے ؟
بیتے ہوئے دنوں کی کچھ بازیافت کیجیے
اُس کی شناخت کیجیے !

گواہ کا بیان

وہ شہر دار اپنا ، لیکن جناب والا
وہ شخص تھا نرالا
باہر سے گورا گورا
اندر سے کالا' کالا
نام اُس کا تھا رفاقت
مُعروف تھا رُؤفا
بے ظرف و بے ظرد فا
پڑھنے میں بیوقوفا
منسوب ساتھ اس کے
بستی کا ہر شگوفہ
میں جانتا ہوں اس کو
پہچانتا ہوں اس کو
مسجد کا کھائے چندہ
اخلاق اس کا گندہ
کتنے لطیف پہلو
کتنا عجیب دھندہ

پھر بھی جنابِ والا
"قومی الیکشنوں" میں
"سرخیل و سربلندہ"
میں دیکھتا تھا اُس کو
اک چاٹ کی دکاں میں
کتنے ہی آدمی تھے
اِس شہرِ بے کراں میں
اِک گائے ہر گلی میں
اِک بھینس ہر مکاں میں

جج (گواہ سے)

بھینسوں کی بات چھوڑیں
اُس کو شناخت کیجے!

گواہ:

تو اے جنابِ والا
وہ شخص تھا نرالا

فطرت تھی لا اُبالی
عادت تھی بھیڑ چالی
پگڑی کبھی سجا لی
ٹوپی کبھی جما لی
اِس پارٹی کا چمچہ
اُس پارٹی کی تھالی
گہ صاف چار ابرو
ڈاڑھی گہے بڑھا لی
دل خواہشوں کی دلدل
سر تھا سرے سے خالی
درگاہوں پر قلندر
مجروں میں وہ ڈفالی
مونچھوں پہ تین تاؤ
کانوں میں ایک بالی
وہ سرغنہ ستمگر
اشراف میں بھی عالی

ڈالے منسٹروں کو
وہ 'ڈالروں' کی ڈالی
مسکین کا محافظ
پولیس کا موالی
بک دے غلیظ گالی
از راہِ بے خیالی
فدوی کو اب عطا ہو
رخصت جنابِ عالی

میں جانتا ہوں اس کو
پہچانتا ہوں اُس کو

جج :

پورا بیان کیجے
آگے دھیان کیجے

گواہ :

تو اے جنابِ والا
وہ شخص تھا نرالا
باتیں بڑی سیاسی
گھاتیں تمام گھاسی
بحثیں تمام فرضی
تخیّل سب قیاسی
تقریر، بیشں لفظی
تعمیر، کم اساسی
سیکھیں اسی سے آکر
گرگان — گُرشناسی
پیچھے لگائے رکھّے
اک پارٹی ذرا سی
خود بھی جنم کا بھوکا
اور پارٹی بھی پیاسی
تھا صدرِ بلدیہ بھی
یہ 'شیرِ شہر ناسی'

پھر کہہ رہے ہیں ووٹر
آسی تے فیر نہ جاسی
خالی گزر چلا ہے
اُنّیس سو اٹھاسی

میں جانتا ہوں اس کو
پہچانتا ہوں اس کو

اندازِ دل ربائی
آدابِ پارسائی
روٹی پکی پکائی
روزی دھری دھرائی
حرفوں کا ابن سینا
حرفے کا وہ قصائی
اندر نفیس صوفے
باہر فقط چٹائی
زیرِ آستین ــــ خنجر
باتوں میں ــــ رس ملائی

ہر لفظ ـــــ کہہ مکرنی
ہر بات میں ـــــ ڈھٹائی
روشن ـــــ حکومتوں پر
اس کی ـــــ 'کرا کرائی'
غنڈہ ـــــ مگر معزز
آسودہ ـــــ بے کمائی
مالی کی کوئی دیکھے
کوٹھی ـــــ گلاب والی
رخصت جنابِ عالی

جج:
جاری ـــــ بیان جاری!
بہرِ سزا شماری
تفصیل اور بھی کچھ!
تاویل اور بھی کچھ!

گواہ:

تو اے جنابِ والا
وہ شخص تھا نرالا
اقوال ــــ عارفانہ
افعال ــــ احمقانہ
لہجہ تھا، لکنانہ
لیکن تحکمانہ
ہمسائے سے عداوت
تھانے سے دوستانہ
مینا بدست ـ لیکن
تبلیغ واعظانہ
فہم و ذکا و دانش؛
دونوں میں درمیانہ
بھرپور ــــ گھر خون سے
اُس کا زنان خانہ
بھوکوں کا نام لینا
کھانا ــــ ہزار دانہ

اِن کا 'غریب خانہ'
کُرسی کا ——— کارخانہ
کھدر کی واسکٹ میں
فطرت کا دولتانہ
لیڈر مگر رعونت
'ڈپٹی - کمشنرانہ'

میں جانتا ہوں اس کو
پہچانتا ہوں اِس کو

یوں مشکلیں وطن کی
ویران کر رہا تھا
آسان کر رہا تھا
آباد راستوں کو
بس اپنی سرخوشی کا
سامان کر رہا تھا
بس اپنی برتری کا
اعلان کر رہا تھا

بس اپنے جھونپڑے کو
ایوانِ کر رہا تھا
ہر خام چھوکرے کو
خاقان کر رہا تھا
'تکبیر' پڑھ رہا تھا
'چالان' کر رہا تھا
وہ کر رہا تھا ، جو کچھ
جاپان کر رہا تھا

میں جانتا ہوں اس کو
پہچانتا ہوں اس کو
گردہ ، قلندری کا
معدہ ، سکندری کا
بِجلے جلوس اندر
ماہر وہ 'گڑبڑی' کا
ملکوں میں لے کے گھوما
کاسہ گداگری کا

بھگتا گیا دسمبر
اِعلان جنوری کا
'انڈسٹری' میں خالی
کھڑپا گشاوری کا
تصویر بزدلی کی
دعویٰ دلاوری کا
تعلیم — بے دِلی کی
دستور — اکبری کا
کھولا — 'بجٹ' کے اندر
بازار بے زری کا
جمہوریت کی خاطر
آئین لشکری کا
تلوار — غزنوی کی
پرچار — بھرتری کا
تحصیل دار کے گھر
جلوہ کمشنری کا

گُم کردہ راہ، لیکن
مینار رہبری کا
با وصفِ کم سوادی
پندار برتری کا
کرسی ـــــ مہابلی کی
بستر ـــــ مسافری کا

جو چیز پائی کھائی
جو شے ملی اُٹھا لی
رُخصت جنابِ عالی!

جج

تشنہ ہے کچھ گواہی
کچھ اور بھی سیاہی

گواہ:

تو اے جنابِ والا
وہ شخص تھا نرالا

بہروپ تھے ہزاروں
وہ یار باشِ یاراں
وہ موسمِ خزاں میں
بیسندۂ بہاراں
بزمِ سرودگاں میں
سازندۂ ستاراں
مسجد کے حاشیے پر
پرسندۂ نگاراں
کاروں، میں ساتھ اِسکے
انبوہِ نابکاراں
قبلہ گورزوں کا
مخدومِ صوبہ داروں
وہ پیرِ خوش خیالاں
وہ میرِ مے گساراں
وہ فاتحِ زمانہ
مفتوحِ گل عذاراں

میں جانتا ہوں اس کو
پہچانتا ہوں اس کو

اعزاز ـــــــ اتفاقی
اقبال ـــــــ حادثاتی
چوپال ـــــــ شاملاتی
مزدور ـــــــ 'بے چپاتی'
پھیلے تھے پرگنوں پر
املاک اس کے ذاتی
ہو کھیت یا سیاست
مدّت کا تجرباتی
اک ساتھ باندھتا تھا
خرگوش اور ہاتھی
ہر انجمن میں چہکے
کل کا 'چیٹر تھناتی'
خارش زدہ نگارش
قد سے بڑی تھی چھاتی

میں جانتا ہوں اس کو
پہچانتا ہوں اس کو
شادی شدہ لنڈورا
سالا نہ کوئی سالی
رخصت جنابِ عالی!

دست و درمان

حادثہ

وہ جمہوری عزائم کی امیں قومی جماعت اب
فقط عہدہ ـــــ زری سرکار بنتی جا رہی ہے کیوں
پریشانی کی کیفیّت یہ کیسی ہو چلی پیدا
یہ درگت یعنی آخر کار بنتی جا رہی ہے کیوں

(۱۹۴۹ء)

مراجعت

(بعض روٹھے ہوئے لیڈروں کی مسلم لیگ میں واپسی)

آ گئے روٹھے ہوئے سردار مسلم لیگ میں
سج گیا اُجڑا ہوا دربار مسلم لیگ میں
تین برسوں تک وزارت کی جدائی جھیل کر
آ ملی سرکار سے سرکار مسلم لیگ میں
آ گئے اندر مگر باہر کی شوکت کے لیے
اندر و باہر کے ٹھیکیدار مسلم لیگ میں
پھر بٹے گی جوتیوں میں دال اگلے سال تک
ہو گی تگڑی سی وہی تکرار مسلم لیگ میں

دیکھنا اٹھی کہ اٹھی پھر کوئی طرح فساد
وہ پگڑی دستار پر دستار مسلم لیگ میں
پھر پڑے گا گھمسن گرج سے عہدہ و منصب کا رن
پھر لڑیں گے ثابت و سیار مسلم لیگ میں
جانے کس شامت سے مسلم لیگ اب ہو گی دوچار
آملے سارے پرانے یار مسلم لیگ میں

نعم البدل

(وزارت کی برطرفی پر مشاورت کی نامزدگی)

وزارت کی ہے جانشیں یہ 'مشارت'
غنیمت ہے یاروں کی یہ چاریاری
یہ مانا دیانت بڑی چیز ہو گی
مگر بھائی بندی، مگر دوستداری
یہ کیا کم ہے 'ورکنگ کمیٹی' تو جیتی
ہماری بلا سے اگر قوم ہا دی
خدا چاہے ہر 'خادمِ قوم' ہو گا
کمشنر سے اونچا __ سکتر پہ بھاری

(۱۹۴۹ء)

مردم شماری

وزارت کے لیے مردم شناسی شرطِ اوّل تھی
مگر حضرت نے پوری قوم کی مردم شماری کی
نہیں ہے ساتھیوں سے مشورت تو اِس کا کیا شکوہ
کہ خود بھی کچھ نہیں معلوم حد ہے راز داری کی
ضرورت بے ضرورت لڑ گئے جو سامنے آیا
سیاست میں مسلمانوں نے اکثر فوجداری کی
بڑھاپے میں کوئی بھی چاٹ پڑ جائے قیامت ہے
خصوصاً لیڈری کے نام پر خدمت گزاری کی

(۱۹۵۰ء)

مسلم لیگ کے منوہر لال

متحدہ پنجاب کی یونیانسٹ کابینہ میں وزیرِ خزانہ لالہ منوہر لال کو کبھی کوئی وزارتی بحران متاثر نہ کر سکا۔ قیامِ پاکستان کے بعد پنجاب کی مسلم لیگی کابینہ میں ایک طویل مدت تک کچھ یہی پوزیشن سردار عبدالحمید دستی کو حاصل رہی آخر میں تو آپ مغربی پاکستان کی وزارت اعلیٰ کے منصب پر فائز رہے۔ (ض)

آج تک پنجاب میں جتنے بھی گزرے ہیں وزیر
جملہ ہست و بود میں دستی بلند اقبال ہیں
مجلسِ ممدوٹ میں، کابینۂ ممتاز ہیں
اب ملک فیروز خاں کے بھی شریکِ حال ہیں
کوئی بستی بس رہی ہو اُس میں دستی ہیں ضرور
آپ مسلم لیگ کے لالہ منوہر لال ہیں

آواز دینا

پھرے خان ممدوٹ[1] اور یوں اکیلا
بُلانے جہانے کو آواز دینا
اکڑنے لگا پھر ٹوانے کا طرّہ
ذرا دولتانے کو آواز دینا

---

[1] قیام پاکستان کے بعد پنجاب کے سیاسی قائدین کی خانہ جنگی کے پس منظر میں جس کے سرکردہ کرداروں میں پاکستان پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ نوّاب افتخار حسین ممدوٹ اور ان کی کابینہ کے ممتاز رکن میاں ممتاز محمد خان دولتانہ تھے۔ خضر حیات ٹوانہ پنجاب کے آخری یونینسٹ وزیر اعظم۔

سوال

صدارت جوتیوں کا ہار بنتی جا رہی ہے کیوں
وزارت محض کاروبار بنتی جا رہی ہے کیوں

وہی لیڈر ہیں لیکن آج ملت اور حکومت میں
یہ جیسے چین کی دیوار بنتی جا رہی ہے کیوں

اگر پارٹی کی باری آج ہے کل کس کی باری ہے
یہ قوم اتنی بھی 'لیڈر مار' بنتی جا رہی ہے کیوں

وہ جمہوری عزائم کی امیں قومی جماعت اب
فقط عہدہ بزی سرکار بنتی جا رہی ہے کیوں

پریشانی کی کیفیّت یہ کیسی ہو چلی پیدا
یہ درگت یعنی آخر کار بنتی جا رہی ہے کیوں

(۱۹۴۹ء)

لے مولانا عبدالباری ، صدر پنجاب مسلم لیگ

نگہِ انتخاب

(پارٹی ٹکٹوں کی تقسیم)

کسی ہم زلف کی زلفوں کو سلجھانا بھی ہو شاید
نہ جانے کتنے نازک دوستانے اور بھی ہوں گے
ضرورت ہی بھلا کیا غیر معمولی دماغوں کی
ابھی تو درمیاں میں درمیانے اور بھی ہوں گے
حق پیدائشی ہے جن گھرانوں کا وزارت پر
وزیروں کے وہ موروثی گھرانے اور بھی ہوں گے

ایوانِ سیاست

فروشاں اُدھر 'خاکساری' کے نعرے[1]
اِدھر کسمساتے بخاری کے نعرے[2]
وہ بستے سے جو کالے کالے پڑے ہیں
زمیندار کے کچھ مقالے پڑے ہیں[3]
جما گل مہر و سالک سے آئے ہوئے ہیں[4][5]
وہ الماریوں میں سجائے ہوئے ہیں

---

[1] علامہ مشرقی کے خاکسار [2] خطیب شعلہ بیاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری
[3] روزنامہ زمیندار لاہور [4] مولانا غلام رسول مہر مدیر روزنامہ انقلاب
[5] مولانا عبدالمجید سالک مدیر روزنامہ انقلاب

زہے حق شروہی، زہے خوش کلامی
دلوں میں اُترتی نوائے نظامی[۶]
وزارت کے ارمان کے ڈھیر دیکھو
قلابازیوں کے اُلٹ پھیر دیکھو
'الاٹی'، ــــــ دکانوں مکانوں کا ملبا
وہ لوٹے ہوئے کارخانوں کا ملبا
جو لوٹی ہوئی چند کاریں پڑی ہیں
یہ ممدوٹ[۷] کی یادگاریں پڑی ہیں

(۱۹۵۰ء)

---

۶ مجید نظامی مدیر روزنامہ نوائے وقت
۷ پنجاب کے پہلے وزیرِ اعلیٰ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ

دین و سیاست

مولوی اونٹ پہ جائے ہمیں منظور مگر
مولوی کار چلائے ہمیں منظور نہیں
وہ نمازیں تو پڑھائے ہمیں منظور، مگر
پارلیمنٹ میں آئے ہمیں منظور نہیں
سُرمۂ چشم کی تحریر گوارا ہے، مگر
اُس پہ عینک بھی چڑھائے ہمیں منظور نہیں
حلوہ خیرات کا کھائے تو ہمارا جی خوش
حلوہ خود گھر بھی پکائے ہمیں منظور نہیں

علم و اقبال و رہائش ہو کہ خواہش کوئی
وہ بھی ہم سا نظر آئے ہمیں منظور نہیں
احترام آپ کا واجب ، مگر اے مولانا!
حضرتِ والا کی رائے ہمیں منظور نہیں

ملغوبہ

قصر سلطانی کے پھاٹک تک تو رمضانی کے ساتھ
پھر وہی اپنی مسالے دار بریانی کے ساتھ
دیکھتے ہیں لوگ اِس منظر کو حیرانی کے ساتھ
میرزا[1] صاحب کا سر ہلتا ہے بھاشانی[2] کے ساتھ
دولتانے[3] کا سفر، محمود عثمانی کے ساتھ
خانہ آبادی ہوئی ہے، خانہ ویرانی کے ساتھ

---

[1] سکندر مرزا [2] مولانا عبدالحمید بھاشانی [3] ممتاز محمد دولتانہ

اُونٹ پر نکلی ہے لاری[۴] کی سواری دیکھنا
سندھ کے عبدالمجید[۵] اِن بیابانی کے ساتھ
ٹوٹتی ہے وحدتِ ملّی کی لے تو ٹوٹ جائے
راگ ملتانی کا وہ گائیں گے جیلانی[۶] کے ساتھ

○

جنگ کے میداں میں سینہ تان کر جائیگا کون
آپ ؟ اپنی اِس تن اندوزی ، تن آسانی کے ساتھ
عقدۂ آزادیٔ کشمیر سلجھائے گا کون
آپ ؟ اپنی 'آل پاکستان حیرانی' کے ساتھ

○

قصرِ سلطانی کے یہ جملہ شناسانِ قدیم
پھر کریں گے سازشیں ہر ظلِّ سبحانی کے ساتھ
مدعا یہ ہے کہ ملّت پر مسلّط پھر کریں
اپنی وہ مخصوص نا اہلی ، بدعنوانی کے ساتھ

---

[۴] جسٹس ظہیرالدّین لاری [۵] شیخ عبدالمجید سندھی [۶] ملک غلام جیلانی

پھُریری

قصرِ حکومت میں پھر ریخت شکست ہے کابیناؤں کی
قابلِ دید ہے کرسی پر پھر یورش نابیناؤں کی
اندھے راہ دکھاتے ہیں
گونگے 'ماہیا' گاتے ہیں
بہرے شور مچاتے ہیں
لنگڑے دوڑے جاتے ہیں

دوراہا

ہر اک چیز عبوری ہے
پوری نسل ادھوری ہے
فطرت تو دستوری تھی
عادت ناجمہوری ہے
ہاتھوں میں قرآن مگر
ملّت بے منشوری ہے
اپنے جینے کا انداز
ناری ہے کچھ نوری ہے

○

مذہب کاروبار بنا ہے
مسجد میں بازار بنا ہے
کتنے گھر مسمار ہوئے جب
اک اونچا مینار بنا ہے
من روگی تو تن بھی روگی
دشمن اپنا یار بنا ہے
کن باغوں کے گل برگوں سے
یار ! ترا رخسار بنا ہے
پتھّر تو ہم نے ڈھوئے تھے
قصر سمندر پار بنا ہے

سورج آخر کب تک رُکتا
شعر بھی اب اخبار بنا ہے
کانٹوں کی مزدوری ہی سے
پھول کوئی شہکار بنا ہے
دیکھیے کیا رتبہ ہو کس کا
چور تو تھانیدار بنا ہے

(۶ دسمبر ۱۹۸۸)

لوہے کی عیدی

قومی میزانیہ میں، جو عید کے موقع پر پیش ہوا، دفاعی اخراجات کے لیے خصوصی ٹیکس پر دیہاتی لڑکیوں میں ایک مذاکرہ ۔

تابو کہہ رہی تھی آج گاؤں میں گلابو سے

راز دار ——— !

دھیرے دھیرے

سہمے سہمے لہجے میں

اَڑیئے تو نے، ماشاءاللہ، دیکھی تھی نا!

اپنے فوجی وِیرول ———

اپنے ہیروں نے، کل واگھے میں ——
جو کپیری ہے
یہ آدھی توپ تیری ہے
یہ آدھی توپ میری ہے

○

چوہدری یہ کہتا ہے
یہ پہلی توپ ہے رانی
جو ہم نے دامن جھاڑ کر
دشت میں خیمے گاڑ کر
قرضے کے امریکی ڈالر پھاڑ کر
اپنا خون پسینا دے کر
نقد و نقد خریدی ہے
یہ توپ — بجٹ کی عیدی ہے

○

چوہدری کا کہنا ہے
یہ توپ تمھارا گہنا ہے

گو مست مگن وہ رہتا ہے
یہ بات مگر سچ کہتا ہے
"مرا جھومر بھی اِس مٹّی سے
مرے کنگن بھی اِس مٹّی سے
مری چادر بھی یہ مٹّی ہے
مرا سارا دُھن اِس دھرتی سے
اسب جیون اِس دھرتی سے
میری عزت، عصمت، قامت ہے
اس 'آگ' سے راگ سلامت ہے"
یہ بیرن توپ نہیں لاڈو!
یہ گھر کی میٹھی بیری ہے
یہ توپ جو آدھی تیری ہے
یہ توپ جو آدھی میری ہے

○

اِس کتھا پہ تن کر — جل کر کہا گلابو نے
اِس بستی کی سب سے سُندر

سنگھڑ سیانی
قصبے میں جا کر
کئی جماعت پڑھی ہوئی مہتابو نے
کچھ سوچ ذرا اَن بھول کڑے!
مری جانی گول مٹول کڑے!
مائی میں نہ خود کو رول کڑے!
مَت کچے اکھر بول کڑے!
خود اپنے اندر جھانک ذرا
باہر کے دریچے کھول کڑے!
پھر اپنی راکھ 'پھرول' کڑے!

⊙

"یہ توپ تو ایک علامت ہے
جانی! ہر جنگ قیامت ہے
سکھی! دنیا ہے ویران بہت
سکھی! زخمی ہے انسان بہت
جو توپ جہاں بھی جائے گی
کھیتوں میں بھوک اگائے گی

کھا جائے گی ہر بالی کو
کملا دے گی ہر ڈالی کو
کجلا دے گی
تیرے بندے کو، مری بالی کو
ہر چیز چمکنے والی کو
یہ لوہا، لاوا اُگلے گا
یہ آگ اک رات اندھیری ہے
یہ توپ جو آدھی تیری ہے
یہ توپ جو آدھی میری ہے

۶ جون ۱۹۸۷ء

وزیراعظم محمد خان جونیجو کی برطرفی پر

گئے قصرِ دولت سے
سائیں جونیجو
اب لے سندھ والو
کوئی اور بھیجو

یکم جون ۱۹۸۸

لوری

اچھے مُنّے ! — چُپ چُپ !
گر تُو روتا جائے گا
جبڑے لمبے ہو جائیں گے
ناک ترا
موٹا ہوتا جائے گا
کان ترا
چھوٹا ہوتا جائے گا

احسان ناشناسی

مرغ و شتر و اسپ و گاؤ
آدمی کے کتنے کام آتے ہیں
مرغِ خوش گلو ہمیں
کھرج سُر میں ، پھیپھڑوں کے خرچ پر
راگنی سناتے ہیں ، صبح کو جگاتے ہیں
گائے دودھ دیتی ہے
(زندگی کی کھیتی میں)
بیل ہل چلاتا ہے

اَن دَھن اُگاتا ہے
شُتر و اَسپ
بوجھ بھی اُٹھاتے ہیں
کھیل بھی دکھاتے ہیں
آدمی کے کتنے کام آتے ہیں
اور ہم ——— ناسپاس آدمی
ان کی بے بہا وفا
مُشقّتوں ، اَذیّتوں ، رفاقتوں ———
ریاضتوں کے اجر ، صبر ، جبر پر
اپنے لطف کے لیے ،
ان کو قتل کرتے ہیں
ان کا گوشت کھاتے ہیں

(۱۲ جون ۱۹۸۸ء)

فاصلہ

کون مجھے اب لا کر دے
بھولے بھالے بچپن کی
میٹھی میٹھی — گہری نیند
مست الست جوانی کی
گہری اور سنہری نیند

(۱۱ ستمبر ۱۹۸۸)

کتّے سے معذرت کے ساتھ

کُتّا کرے حفاظت اپنے مالک کی
مالک بے شک ہلکا ہو یا بھاری ہو
ہاری یا پٹواری ہو
اونچی ٹھیکے داری ہو
پاپوں کا بیوپاری ہو
صنعت اور سیاست والا
نیلا ، پیلا ، کالا —— کاروباری ہو
منصف ، ملزم اور پلیڈرز

جھنڈا ، موٹر ، ووٹر ، لیڈر
کتّے کو سب ایک برابر
ایک برابر
آمر کیا اور عامی کیا
سامی کیا اور "نامی" کیا
سیدا کون ہے ، سعدی کون
جامو کیا اور جامی کیا
ایک برابر رازی ، رُومی اور ہلاکو
ایک برابر گُنی گیانی — چور اور ڈاکو
کتّے کو معلوم نہیں کہ اُس کا مالک
قاتل ہے
ریشم ہے یا پتّھر ہے
ہٹلر ہے یا بٹلر ہے
درک سے عاری یہ خُوبستہ ، اک اندھا —
پیمانِ وفا
جس میں اعلیٰ قدروں کا

(فکر و خیال کی نازک نازک بدروں کا)
اجلے کھرے اصولوں کا
کانٹوں کا اور پھولوں کا
فہم ، ادراک ، شعور نہیں
انساں کو منظور نہیں
فطرت کا منشور نہیں

چاہت ہو یا نفرت ہو
انسانوں کے رشتوں کی
پیاس ، اساس شعوری ہے
وہ تیری مجبوری ہے !
یہ میری مجبوری ہے

(۷۔ اکتوبر ۱۹۸۸)

گاڑی

خوب چلی ہے اپنی گاڑی
منزل ایک ، الگ اسٹیشن
ٹولی ٹولی ــــ بکھری بکھری
پاکستان کی ــــ واحد 'نیشن'

ایشیائی کھیل

آسمان سے اپنے شیروں کی چھلانگیں بھی
دوڑتی زلیخاؤں کی حسین ٹانگیں بھی
'سیف گیم' ، میلا تھا قوت و نزاکت کا
غازیوں کے نعرے بھی ، مرغیوں کی بانگیں بھی

اسلام آباد (۲۵ اکتوبر ۱۹۸۹)

وقت کی چاپ

سن رہا ہوں چاپ اپنے فکر کی دہلیز پر
آدمی کی سمر براہی کی صدی آنے کو ہے

ممکناتِ زندگی کے نَو بہ نَو منظر لیے
آسمانوں کی گواہی کی صدی آنے کو ہے

سائنسوں، کا اِک نیا میثاقِ آگاہی لیے
اک تحیّر اور تباہی کی صدی آنے کو ہے

کتنے نادیدہ عناصر کی نئی تشکیل سے
روشنی کی اور سیاہی کی صدی آنے کو ہے

ثقل ہستی آدمی کی ذات پر آ جائے گا
ٹوٹ کر سورج زمیں کے ہاتھ پر آ جائے گا

(۳۱ جنوری ۱۹۸۹)

ضمیریات

(پنجابی)

ہر ساہ ہے ہک بیان گھتی جا رہیّا ہاں مَیں
سمجے ہوئیاں نوں ہوروی سمجا رہیّا ہاں مَیں
کدَ دا تُہا ڈے سامنے ٹریا رہیّا ہاں مَیں
دستو خاں آ رہیّا آں میں یا جا رہیّا ہاں مَیں
اِس طرحاں دِی لبا ہے محبّت دے لازمے
اوہ جھوٹ بولدی اے، قسم کھا رہیّا ہاں میں
کی آپ نوُں بتَاواں اُدھاری خوشی دی بھُوک
ہَسنے تے لگ رہیّا سی جے شرما رہیّا ہاں میں

بازاں تے میرا وس نئیں چلدا تے کی کراں
چڑیاں نمانیاں نوں تے پھڑکا رہیا ہاں میں
لوکی سمجھ رہے نے بڑا فلسفی منوں
وچلا بجوگ ایہہ سی جے اونگھلا رہیا ہاں میں
امریکی 'فوم کرسیاں' تے بیٹھنے لئی
ماں باپ والی چوکیاں کھسکا رہیا ہاں میں
فرصت نئیں جے مولوی اقبال نوں پڑھاں
اج کل تے بس 'ملاوٹاں رلوا' رہیا ہاں میں
لش لش کرے گی ویکھنا گدڑی ضمیر دی
اپنے سمیت ایس نوں دھلوا رہیا ہاں میں

○

سب لوگوں سے یاری کیا
اپنی دنیا داری کیا
مسجد کے منبر پر بھی
شیخ لگے درباری کیا
اب تک کسی الیکشن میں
جیتا کوئی 'ہاری' کیا
آنکھوں میں تو شرم نہیں
سر پر آنچل بھاری کیا
حقے اور پگڑی کے بغیر
خالی نمبرداری کیا
سب ہیں طبعاً حسن پرست
نوری کیا اور ناری کیا

سرحد پر بندوق نہیں
گھر گھر چوکیداری کیا
انسانوں میں اتنا فرق؟
لالُو کیا — لغاری کیا
منزل نظر نہیں آتی
یہ — 'اندھی بیداری' — کیا
'جمبو جٹ' کی دُم کے ساتھ
اپنی گدھا سواری' کیا
جس میں کوئی کتاب نہیں
صندل کی الماری کیا
اُس کی تلخ کلامی میں
پائی خوش رُخساری کیا
کٹ گئیں مہمل باتوں میں
راتیں پیاری پیاری کیا
ایک ادائے فرض ضمیر
ورنہ بات ہماری کیا

(۱۱ ستمبر ۱۹۸۹ء)

اِک رئیس زادے کے جشنِ سالگرہ پر

قصرِ زر گنبد میں اک جشنِ طرب
رامش و رنگ کے عنوان سے آراستہ ہے
طشتِ خوش تابِ طلائی میں سجل شمعوں
میں جھلمل کرتی
اطلس و دیبا و زربفت کی جا جسم پہ سجی
دور دیسوں کی ہر اک نعمتِ نا یافتہ ہے
ایک منظر کہ شگفت آور و دل خواستہ ہے

غرفہ ہائے چمن اندام کی محرابوں میں
خانہ زادانِ کمربستہ کے ساتھ
ایستادہ و سرود آمادہ
طائفہ نغمہ سرایانِ نوا بافتہ ہے
(یہ گدایانِ سرود)
تاج و اورنگ کے سُر سازوں کا پرداختہ
خود ساختہ ہے

صف بہ صف — چار طرف
دستِ نورین و نگاریں سے بجاتی ہوئی دف
چھن چھنن چھن ... چھند چھند ...
"حُوریاں رقصاں کُناں ساغرِ شکرانہ زدند"
ساز میں سحرِ سُرور
بول میں شکر و قند

لیکن اے سروِ قدِ بالا حصارِ خورسند!
تیری سنگین فصیلوں کے تلے
شور گریہ ہے بلند

شور ـــــ تشنہ و گرسنہ غمیں انسانوں کا
شور ـــــ مجروح سسکتے ہوئے ارمانوں کا
کارگر جن کے سلگتے ہوئے ہاتھ
اِن فصیلوں کی چنائی کے لیے
کوہساروں کی چٹانوں کی سلیں ڈھالتے ہیں
کھیت اِن بھوکے کسانوں کے ہمیں پالتے ہیں
ان کے مدقوق بدن ڈھانپنے سے قاصر ہے
اِن کی روئیدہ کپاس
اِن کے کھلیانوں میں بھوک
اِن کے دریاؤں میں پیاس

ٹوٹتی سانسوں میں دم توڑتی گویائی سن
آدمیت کی یہ مرتی ہوئی شہنائی سن
کرب صدیوں کا یہ خود کاشتہ
برداشتہ ، پنداشتہ ہے
اِن کے نیچے ـــ انھیں پیارے ہیں ، مگر

اِن کے آتے ہوئے جاتے ہوئے سال
(ان کے مدفون بزرگوں کی طرح)
ریگِ محرومی میں چُپ چاپ گزر جاتے ہیں۔
کتنے پھول ــــــــ اب سرابوں کی طرح
کِھلنے پاتے نہیں ــــــ مر جاتے ہیں
کِس خرابے میں یہ اندوختہ ــــ انداختہ ہے
قصرِ زر دار میں اک جشنِ طرب
رامش و رنگ کے عنوان سے آراستہ ہے

(۲۲ ستمبر ۱۹۸۹)

مقابلہ

(لاہور میں پنجاب پولیس نے وفاقی پولیس کے دو افسروں کو گرفتار کرلیا)

جب ڈاکوؤں سے کر نہ سکی وہ مقابلہ
پولیس کا مقابلہ پولیس سے ہوا

اُلجھے ہوئے ہیں شاخ و شجر باغ و راغ سے
"اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

بانس اور بانسری

وزارت کا جب بانس ان سے نہ سنبھلا
تو موصوف نے بانسری توڑ ڈالی

بدہضمی

گیارہ برس کی فاقہ کشی کے بعد ہوئے جمہوری ہم
بدہضمی کی حد تک کھا جائیں نہ کہیں یہ 'چوری' ہم

(جنوری ۱۹۸۹)

ٹی وی نامہ

(پاکستان ٹیلی وژن کی سلور جوبلی کی تقریب میں پڑھی گئی)

'ٹی وی بی بی' کی جُبلی دل گرماتی ، جاں برماتی بھی
پچیس برس کی سُر سنگت ، کچھ منفی ، کچھ اثباتی بھی
طاؤس و رباب سے رغبت بھی نے اور مینا سے وحشت بھی
کچھ شخصوں سے کتراتی بھی ، کچھ خبروں کو کھا جاتی بھی
فن فکر کے ۔ پھول اور کانٹے ۔ موتی کنکر اس کے دامن بھی
یہ اپنا سوہن حلوہ بھی ، یہ اپنی دال چپاتی بھی

ہر اُونچی کرُسی کی خوش پرُسی ، دھن اس کا اور دھیان اس کا
یہ لیگی[1] بھی "پی پی پی"[2] ، بھی فوجی[3] بھی پنج[4] نکاتی بھی
کوئی بولے سلام کرو ، کوئی بولے نیلام کرو
دو پٹہ سر پر لاتی بھی ، کِھسکاتی بھی ، لچکاتی بھی
کچھ پھُوسڑ طبلے بجتے ہیں ، کچھ بےتیے سُر بھی لگتے ہیں
کچھ حرفوں کو چمکاتی بھی ، کچھ برفوں کو پگھلاتی بھی
اقبال[5] کو "فٹ" کر لیتی ہے ہر آقا کی خوش قامت پر
خاکی بھی ، افلاکی بھی ، صحرائی بھی برساتی بھی
کچھ بول 'اولے' بول گئی ، کچھ علم کے موتی رول گئی
کچھ عالم فاضل جیّد بھی ۔ کچھ دانشور حالاتی بھی
نغمے اس میں آنسو اس میں ، یہ خواب بھی ہے مضراب بھی ہے
کچھ زخموں کے سوداگر بھی ، کچھ یادوں کے باراتی بھی
سب میر ، وزیر مشیر سفیر اسیر اِس جادو گرنی کے
اِس کے درشن دروازے پر ، رمضانی بھی ، شبراتی بھی

---

[1] پاکستان مسلم لیگ [2] پاکستان پیپلز پارٹی [3] مارشل لائی دور
[4] وزیراعظم جونیجو کا پنج نکاتی پروگرام [5] حضرت علامہ اقبال ۔

اے نکتہ وَرو یہ بھی سوچو ، اے اہل نظر یہ بھی دیکھو
کن 'روکھی، چٹیل راہوں پر چلتی رہی ٹھوکر کھاتی بھی
ماحول کے چُپ ویرانے میں آہنگِ سفر ہے ہمسفرو!
یہ جگنو شب چمکاتا بھی ، یہ جوگن بین بجاتی بھی

(۲۶ ستمبر ۱۹۸۹)

گھر کی مرغی

اپنے دیس کی ناریں بھی گلناریں ہیں
ہونٹ گلابی، بھنویں کمان کٹاریں ہیں
گیسو ـــــــ چمن بہاریں ہیں
لیکن کون علاج کرے اِس رائے کا
کھیت زیادہ سبز لگے ہمسائے کا
دودھ بھی کم ہوتا ہے اپنی گائے کا

دوبئی ۸ مارچ ۱۹۸۹

ایک ضمنی الیکشن کے بعد

(۱)

الیکشن سے ہو تطہیرِ سیاست
یہ کوشش بھی اکارت ہو چلی ہے
نہ کیوں بِک جائیں، ووٹر اور ممبر
وزارت ہی تجارت ہو چلی ہے

(۲)

ریڑھوں کے وہ گزار پہ بھاگی ہیں موٹریں
دیہات کے کرخت نشیب و فراز میں

رفتار کہہ رہی ہے کہ اگلے چناؤ میں
ووٹر سفر کریں گے ہوائی جہاز میں

○

وہ نہ دوڑے گا کبھی جمہوریت کے خون میں
جس الیکشن میں بکیں گی پرچیاں پرچون میں

(۲۰ فروری ۱۹۹۰)

یک جہتی کی جہت میں

دل کے آتش دان کی گل بات کر
ہر بُرے ارمان کی گل بات کر
ٹھیٹھ پاکستان کی گل بات کر
لالہ مصری خان کی گل بات کر
دین کی کچھ پالتو بحثیں اُٹھا
فالتو ایمان کی گل بات کر
بالتری چپ ہو گئی چوپال میں
اس شبِ ویران کی گل بات کر
'مجلسِ ملی' میں جو آباد ہے
اُس وزیرستان کی گل بات کر

شہر کی گلیوں سے باہر بھی نکل
کھیت کی کھلیان کی گل بات کر

اپنی ماں جائی زباں میں بھی کبھی
میرؔ کے دیوان کی گل بات کر

لوگ بھوکے ہیں تو مر جانے بھی دے
تو کباب و نان کی گل بات کر

گاہے گاہے شیخ جی کے کان میں
رنگ کی — رومان کی گل بات کر

"میم" یورپ کی تو مومی چیز ہے
اپنی ریشم جان کی گل بات کر

مشورتاً جھگیوں والوں سے بھی
قصرِ عالی شان کی گل بات کر

کل کی اُڑتی ریت کے پیچھے نہ بھاگ
آج کے انسان کی گل بات کر

فاصلے کم ہو بھی سکتے ہیں، مگر
لسّی پی کر پان کی گل بات کر

(۲۹ اگست ۱۹۸۹)

چیزیں

ٹوکری میں بیر ہیں
تین چار سیر ہیں
چوس لو گنڈیریاں
تیریاں نہ میریاں

تتلی

باغ میں تتلی اُڑتی دیکھو
اُڑتے اُڑتے — مڑتی دیکھو
پھول سے جا کر جُڑتی دیکھو

آوازیں

چڑیا ——— چوں چوں

'الف' سے —— اُوں اُوں

'ب' سے —— بُوں بُوں

'ٹ' سے —— ٹُوں ٹُوں

'ش' سے —— شُوں شُوں

'غ' سے —— غُوں غوں

'ر' سے —— رُوں رُوں

'ہ' سے —— ہُوں ہُوں

'پھ' سے —— پھُوں پھُوں

ناچا ریچھ

ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ
گلی میں آکر ناچا ریچھ
پانی پی کر
روٹی کھا کر ناچا ریچھ
کان ہلا کر ناچا ریچھ
ڈگ ڈگ ڈگ

چُوڑیاں

آج لاؤں چوڑیاں
ساتھ کھاؤں پوڑیاں
نیلی نیلی — پیلی پیلی
پتلی پتلی — چوڑیاں

پُھلکے

امّی نے پکائے پُھلکے
ہم نے کھائے پُھلکے
پتلے پتلے
ہلکے پُھلکے
علی ! — بول !
بول ! بول ! بول !
تُو کتنے کھائے گا
گول گول پُھلکے
ہلکے پُھلکے

لوری

(ایک نٹ کھٹ بچے کو سلانے کے لیے جس کو ماں باپ ایک مہمان کے سپرد کر کے خود "سنیما گھر" میں جا بیٹھے)

سو جا !
میرے مٹھن مٹھنے ، ننھے منّے یار
سو جا
تجھ کو واسطہ خدا کا ایک بار
سو جا!
سوئی ساری کائنات
سر پر آئی آدھی رات

تُو مچا رہا ہے شور
تُو چلا رہا ہے پاؤں
دیکھ ! جوڑتا ہوں ہاتھ
سو گیا تمام شہر کا بازار
سو جا

(۲)

تیری چیخ ، چُوں چکار
جیسے بولتے ہوں کاگ
جیسے چھاج میں اناج
جیسے شُونکتے ہوں ناگ
نرم گرم کمبلوں میں آر پار
سو جا

(۳)

آس پاس سب خموش
نیند میں ہے سب جہان

تُو بج رہا ہے بین
تُو اُڑا رہا ہے تان
اب تو چھوڑ میری جان
اب تو مان ! مان ! مان !
میرے مٹھن مٹھنے ننھے منّے یار
سو جا

ہلّا گلّا

مَنّو ، چُنّوں زری ، فری !
پڑھے جا ــــ پڑھے جا !
کھیلے جا ــــ کھائے جا !
ڈال ہو کہ بات
صبح ، شام ، رات
زندگی کی بات

کھیلے جا !ــــ کھائے جا
لَپ شَپ ــــ گپ شَپ
کھیلے جا !ــــ کھائے جا
ہَلّا گُلّا ــــــ لائے جا

(۲)

مَنّوں ، چُنّوں ــ ذری فری
بڑھے جا !ــــ بڑھے جا
سب سبق سنائے جا

روم ، شام ، چین
ایک ، دو ، تین
ص ـ سین ـ شین

سب سبق سنائے جا
لَپ شَپ ــــ گپ شپ
ہُو ہا ــــــــ ہُو

کھیلے جا !ــــ کھائے جا !
ہَلّا گُلّا ــــــ لائے جا
گائے جا !

بانسری بجائے جا
چھن چھن چھن
دھاں دھاں دھاں
ہاں ! ہاں ! ہاں !
کھیلے جا !—— کھائے جا!
ہلّا گلّا ——— لائے جا

ادب کا سلسلہ شہابیہ

اردو زبان کی نامور شاعرہ محترمہ ادا جعفری جب لاہور میں مقیم تھیں تو انہوں نے وہاں "من و سلویٰ" کے نام سے ایک محدود ادبی مجلس کی بنیاد رکھی۔ لاہور سے ان کے میاں جناب نور الحسن جعفری تبدیل ہو کر اسلام آباد آئے تو یہاں بھی اسی اسلوب پر ایک مجلس کی بنیاد ڈالی جو "سلسلہ" کے نام سے موسوم ہوئی۔ لاہور کے "من و سلویٰ" کی صدر محترمہ حجاب امتیاز علی تھیں اور سرگرم ارکان میں محترمہ بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، محترمہ سائرہ ہاشمی، محترمہ الطاف فاطمہ، جناب منظور الٰہی، جناب اشفاق احمد اور جناب محمد طفیل (مدیر "نقوش") شامل تھے۔

اسلام آبادی "سلسلے" کے سربراہ جناب مختار مسعود تھے اور سرپرست جناب

قدرت اللہ شہاب ۔ ابتدا میں کچھ عرصہ تک ممتاز ناول نگار محترمہ نثار عزیز بٹ، انجمن کی سیکرٹری جنرل رہیں۔ وہ لاہور چلی گئیں تو قلمدانِ نظامت محترمہ صفیہ آغا ناصر کے سپرد ہوا۔ جناب جمیل نشتر، جناب ممتاز مفتی، جناب ضیا جالندھری جناب مختار زمن، جناب اصغر بٹ، اور جناب آغا ناصر سرگرم رکن تھے۔ جنرل شفیق الرحمٰن اور کرنل محمد خان بھی شامل رہے۔ ماہانہ نشست باقاعدگی سے کسی نے کسی ممبر کے گھر پر ہوتی۔ میزبان صرف کرسیاں اور دسترخوان بچھانے کا اہتمام کرتا۔ چائے پانی، پان کی "سپلائی" بھی اُس کے ذمے ہوتی۔ ایک آدھی میٹھی چیز بھی میزبان کو الاٹ کر دی جاتی۔ ورنہ اپنی اپنی دیگچی اور اپنا اپنا سالن۔ میری باری آتی تو میں اِس طائفے کو اپنے گاؤں لے جاتا جہاں یہ لوگ ہماری درویشانہ ساگ روٹی، اور دودھ دہی کو پسند کرتے۔ ایک مرتبہ "نیزہ بازی" کے مظاہرے کا بھی بندوبست کیا۔ نشست میں مضامینِ نظم و نثر پیش کیے جاتے، اُن پر سیر حاصل گفتگو ہوتی مگر اصل حاصل خوش وقتی ہوتا۔ افسوس کہ یہ سلسلہ، چار پانچ برس کے بعد پریشان ہو گیا، مگر شکر ہے کہ کسی بدمزگی کے بغیر۔

اوراقِ آئندہ میں دو نظمیں "سلسلہ" ہی کی دو سالگرہوں کی تقریبات سے متعلق ہیں۔

(ضمیر)

بسلسلۂ سلسلہ

یہ شہابی ــــــ ماہتابی سلسلہ
کتنے رنگوں کا ــ کتابی سلسلہ
اِک درویشانہ "ہابی" ــ شوق کی
ایک ــــ معصومانہ لابی، سلسلہ
دشت و دریا پر سیرِ آوارگی
حجرہ در حجرہ ــــ "حجابی سلسلہ"
حرف کے پیراہنِ صد تار میں
حسرتوں کا نیم خوابی سلسلہ

اپنی باتیں در حدیثِ دیگراں
کچھ حضوری ، کچھ غیابی سلسلہ
ذہن نوری ، نشتریت' ریشمی
بے ریا ، بے احتسابی سلسلہ
اپنے 'آئین و ادا' میں منفرد
مختصر سا —— 'انتخابی سلسلہ'
نا مقلّد —— منشیانِ علمِ حَرف
شعر و دانَش کا 'وہابی سِلسلہ'
ہم خیالوں کا یہ 'چوپالِ سخن'
ہم نوالوں کا 'رکابی سلسلہ'
مختصر ، محدود روشن رتجگے
پُر سکوں —— 'نا انقلابی سلسلہ'
وادیِ کوہِ نمک کی جوئے شیر
سندھ و جہلم کا چنابی سلسلہ

(۱۲ جنوری ۱۹۸۱)

شریعت بل اور سیاست

پارٹی لائن اور سیاست میں
اِس جسارت کی انتہا کیا ہے؟

کر رہے ہیں وہ رِبا پہ تقریریں
جو نہیں جانتے رِبا کیا ہے

ریش کا استہزا

علم و حکمت کی بحث میں بے شک
اپنے سارے شکوک صاف کرو

ریش والوں سے اختلاف کرو
ریش کو تو مگر معاف کرو

مایہ کو ملے مایہ

(قومیائے بنکوں کی واپسی پر)

قومیائے بنک پھر نذرِ مہاجن ہو چلے
ماڑیوں محلوں میں پھر عود اور گھی جلنے لگے

کر کے لمبے ہاتھ پھر، مایہ کو مایہ جا ملی
گل محمد گُل ہوئے اور بھیم جی روشن ہوئے

ڈالر اور بجٹ

اِس بار اِس ڈگر پہ ہمارا بجٹ گیا
موٹر کا نام سنتے ہی پٹرول گھٹ گیا
رشوت سے جو بچا تھا وہ قرضے میں کٹ گیا
'ڈالر' ہمارے جسم سے کچھ یوں چمٹ گیا
دامن کو کھینچتے ہوئے کرتا ہی پھٹ گیا

(۱۹۹۰ء)

جھگڑا دانے پانی کا

(’پی پی پی‘ اور ’آئی جے آئی‘ ملک کی محاذ آرا سیاسی پارٹیوں میں مصالحت کی خبر پر)

دونوں طرف شکوہِ فر دونوں طرف خمارِ زر
چائے کے ساتھ کیک ہیں پینے کو ’ملک شیک‘ ہیں

صدرِ کبیرِ امریکا، دونوں طرف کی ’ٹیک‘ ہیں
’پی پی پی‘ کہ ’آئی جے آئی‘ اصل میں دونوں ایک ہیں

(۱۹۹۰ء)

لفظ بھی ، احساس بھی ، آواز بھی
آدمی پتھر بھی ہے ، بُت ساز بھی

○

آ فلسفے کی ٹینس تجھ کو ذرا کِھلاؤں
تو مجھ کو حل بتائے میں مسئلے بتاؤں

○

لکڑی ٹھیک تھی ــــــ کیل غلط
کام درست ــــــ دلیل غلط

○

ذکر اس کا کم کرتا ہوں
میں پولیس سے ڈرتا ہوں

تیل میں آگ

کویت پر عراق کے حملے سے خلیج کے خطّے کے بحران پر بالخصوص سعودی
عرب کے دفاع کے لیے امریکی و افرنگی فوجوں کی ملکی صف آرائی کے ضمن میں

جو بھی مخصوص ڈالردں سے کبھی
اب ، ریالوں ، کو واگ لگ گئی ہے
دیکھیے اس میں کون کون جلے
تیل کے 'مٹ ، میں آگ لگ گئی ہے

دفاع

باہمہ فال و فرِ زر، اپنے دفاع کی کفیل
نہر فرات بھی نہیں، شہرِ ریاض بھی نہیں

اہلِ حرم لڑیں تو کیا، کاز[1] بھی ساز بھی نہیں
قافلۂ حجاز[2] میں ایک جہاز بھی نہیں

---

[1] CAUSE [2] علامہ اقبال کا ایک مصرع بہ تصرف

قبولِ دعا

لیجیے امریکنوں سے بھر گئی سب ارضِ حجاز
عربستاں میں فرنگی کی کمک آنے سے
للہ الحمد دعا تو ہوئی اُمّہ کی قبول
"پاسباں[1] مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"

---

[1] علامہ اقبال کا مصرع

تیل اور کھیل

سعودی عرب میں عراق کے خلاف امریکی صف آرائی میں پاکستان کو بھی اپنے عساکر کا ایک دفاعی دستہ روانہ کرنا پڑا ۔

بغداد سے عرق جو نچوڑا عراق نے
روس اور امریکا کا باہم میل کر دیا
امریکیوں نے جنگ کو بھی کھیل کر دیا
اِس کھیل میں ہمارا مگر تیل کر دیا

میراثِ خلیل

بٹ گئی ہے تیل کے دھاروں میں میراثِ خلیل
حکمراں کرتے تھے من مانی حرم کے آس پاس

دیکھیے کعبے کی دیواروں نے بھی دیکھا یہ دن
ہیں فرانسیسی و جاپانی حرم کے آس پاس

جمہوریت کی گاڑی

پیچھے اُجاڑ ملبا آزاد حسرتوں کا
جمہوریت کی کھیتی آگے لہک رہی ہے

اِس حال میں ہے گزرا اب تک سفر ہمارا
"گاڑی گزر گئی ہے، پٹڑی چمک رہی ہے"[1]

اگست ۱۹۹۰ء

---

[1] جوشؔ ملیح آبادی کا مصرع

علالت میں توارد

حرص و ہوس کی حدّت میں، جُوع الارضی کی شدّت میں
پچھّم اُتر دیکھ چکے، سب دنیا پیٹ کی ماری ہے

قوموں اور ملکوں پر بھی افراد کی حالت طاری ہے
دانتوں کا آزار ہے یا پھر آنتوں کی بیماری ہے

خوشی

روٹی دال میں خوش رہنا
اپنی کھال میں خوش رہنا
سارے موسم سائیں کے
ہر اِک حال میں خوش رہنا

ریٹائرمنٹ

شیخ صاحب جب 'سیشن جج' سے ریٹائر ہوئے
جس جگہ بھی جا کے وہ بولے ہیں 'مس[1] فائر' ہوئے

---

[1] MISS FIRE

گاف کا کھیل دیکھ کر

اک جواں چوپال ، خوش رُمنا ملاقاتوں کا ہے
بزم مشروبات پر رَس ، رَس بھری باتوں کا ہے
چہل قدمی ، ہے یہ کھونے اور پانے کے لیے
اصل میں یہ کھیل ہے گیندیں گنوانے کے لیے
برہمی کیسی اگر روپوش ہو جاتی ہے گیند
زندگی کے راستے میں بھی تو کھو جاتی ہے گیند
ہم نے تو دیکھا ہے بھائی بس یہی کچھ 'گاف' میں
گیند بھی ہے زندگی کی طرح 'رُف[1]' ، یا 'آف[2]' میں

OFF ۲ ROUGH ۱

کھیلنے والے کا زور اِس طرح لگواتی ہے یہ
جسم گرماتی ہے لیکن ذہن نرماتی ہے یہ
کیا سجا لائے ہیں بوڑھے لوگ بھی اپنے بدن
اُودے اُودے ، نیلے نیلے ، پیلے پیلے پیرہن"
اِس کی سلطانہ روش کے بھی نرالے بھید ہیں
(ایک مُفلس کی قبا جس میں اٹھارہ چھید ہیں)
ظالموں کو 'ہولؔ' کے اندر اُتارو بار بار
بار بار اٹھے کوئی سرکش تو مارو بار بار

○

فوجیوں سے 'گاف' کا ہے اک پرانا رابطہ
اِن کو خوش آیا کشادہ خود روی کا ضابطہ
اہلِ لشکر کے لیے دلچسپ یہ منظر بھی ہے
'گاف' میں جنگل بھی ہے، میداں بھی ہے، 'بنکرؔ' بھی ہے

BUNKER ؎ HOLE ؎۳

O

آدمی تنہا بھی کھیلے ہے تو میلا آدمی
اپنے اندر شہر رکھتا ہے اکیلا آدمی
'گاف' کے میدان میں پیہم سفر ہے زندگی
فلسفہ یہ ہے کہ بس اک رہ گزر ہے زندگی

اسلام آباد (۱۰ اگست ۱۹۹۰ء)

بے سنگمی

صدر مملکت غلام اسحاق خان کے، وزیر اعظم بے نظیر بھٹو
کی حکومت کو برطرف کرنے پر

جوانی کتنی بھی زیرک ہو، کچھ سرکش تو ہوتی ہے
بڑھاپا کتنا زندہ دل ہو ـــــ دانائی ہی دانائی
تعجب کیا اگر دونوں 'رئیسوں'، کی نہ بن آئی
کوہستانی تھا صدر اپنا، وزیر اعظم تھی صحرائی

شر میں خیر

(عراقی صدر صدّام کی ایران کو صلح کی پیشکش۔)

صدّام و سعود کے جھگڑے میں
اک خوب خبر بھی کل آئی
ایران و عراق میں صُلح ہوئی
تو شر میں خیر نکل آئی

(سیّد ضمیر جعفری)

پاک رشوت

(حج کی ڈیوٹی پر مامور کارداراِن سرکار پر رشوت ستانی کے الزامات)

(۱)

ایامِ حج میں مکّے مدینے میں بالخصوص
مانا کہ حاجیوں پہ شہادت گناہ تھی
ہائے مگر "ریال" کی شرحِ مبادلہ
رشوت میں بھی کشش جو تھی وہ بے پناہ تھی

(۲)

حج ڈیوٹی ، پہ بھی جو گیا راشی اہلکار
"درکیں" نکال لیں وہاں ، حاصل حصول کی
پہلے تو کچھ ، ریال ، میں رشوت قبول کی
پھر کی زیارت اس نے مزارِ رسُول کی

(۳)

اب کے تو ریالوں میں چلی حج میں بھی رشوت
عمّال ہوئے مکّے مدینے میں بھی بے باک
اسلام نے جو زور طہارت پہ دیا تھا
اتنا تو کیا ہم نے کہ رشوت کو کیا پاک

دو عیدیں

(' رویتِ ہلال ' کے جھگڑے پر ملت بیضا سرکاری اور غیر سرکاری عیدمیں منقسم ہوگئی)

یاد آیا میکا اُنتیسویں رمضان کو
دیکھتے تھے ہم ہلالِ عید کو کس پیار سے
اشتیاقِ دیدِ ماہِ عید کی تمہید میں
دو قدم آگے تھا ' ہر بے روز ' ، روزہ دار سے
اِدھر کھلے روشن دریچوں میں جواں چہروں کی آگ
وہ لب و رخسار کے دہکے ہوئے گلزار سے

سادہ سادہ مائیں بوجھل آنچلوں کی اوٹ سے
شوخ، چنچل لڑکیاں اک شوخیِ بیدار سے
روشنی، بوڑھوں کی آنکھوں میں سے لَو دیتی ہوئی
زندگی، بچّوں کو لپٹائے ہوئے تھی پیار سے
کاشتکار اپنے کُھلے کِھلیان کے میدان میں
تاجر اپنے چوک کے اُونچے 'تھڑا بازار' سے
مولوی صاحب کھڑے ہو کر کسی مینار پر
اپنی چشمِ سُرمگیں کی کوششِ بسیار سے

○

چاند پیدا کر ہی لیتے تھے یہ جہد جستجو
ابر کے گھمسان ، گہرے بادلوں کے غار سے
بادلوں کی اوٹ سے آواز دیتا تھا ہلال
گاہ عطّار شفق کے شربتِ گلنار سے
گاہ خود محراب و منبر سے نکل آتا تھا، چاند
کھینچ پکڑ لاتا تھا کوئی کابل و قندھار سے

کُود پڑتا تھا کبھی وہم سے کسی دلان میں
ڈھونڈھ کر لانا کبھی ساتوں سمندر پار

چاند پر ڈپٹی کمشنر ہو گئے اب
عید کا پرمٹ ملے گا مرکزی سرکار سے

(۱۹۵۳ء)

ایجاد

خُلدِ امریکا سے جب گندم کا آپہنچا جہاز
ہر صدا ـــــ آوازِ تبریک و مبارکباد تھی

ہم نے ہر دانے کو اک حیرت سے یوں دیکھا ضمیرؔ
جیسے یہ گندم نہ تھی کوئی نئی ایجاد تھی

(۱۹۵۳ء)

گردشِ جام

مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ختم کر کے جب 'ون یونٹ' کے نام سے ایک صوبہ بنایا گیا تو اس کی حکومت میں بعض نااہل اشخاص کی بطورِ وزیر شمولیت پر)

صدرِ اعظم نے جو کھولی ہے وزارت کی سبیل
بُوم صاحب تک بھی اِس گردش میں جام آنے لگا
کتنی مُردہ، شمعیں اِس محفل میں ضَو دینے لگیں
کیسا کیسا مردِ 'ون یونٹ' میں کام آنے لگا

امریکا سے ادھاری گندم

یہ گندم پھر فسادِ دانۂ گندم نہ ہو جائے
یہ دانہ پھوٹ کر اک روز' ایٹم بم 'نہ ہو جائے

(۱۹۵۴ء)

بھیک

بھیک کے 'ڈالر' سے جو منہ زور اِنجن آئے گا
کھینچ کر گاڑی کو بھی واشنگٹن لے جائے گا

(۱۹۵۲ء)

قافیہ تنگی

سخن فہموں کے لب پر کیوں نہ آئے نام ہاور[1] کا
کہ 'ہاور' زور آور قافیہ ہے لفظ 'پاور' کا

○

رخِ سیاہ پہ 'پاوڈر' ارے خدا کی پناہ
دلِ غریب کا میلوں تلک پتا نہ ملا
درِ حبیب پہ کل اک پٹھان کہتا تھا
ہمارے درد کا خو کیوں اُمیں دوا نہ ملا

ریواز ہاسٹل۔ اسلامیہ کالج، لاہور (۱۹۳۶ء)

[1] جنرل آئزن ہاور۔ صدر امریکہ

ڈالر اور کالر

ہم 'سٹرلنگ' سے نہ چھوٹے تھے کہ 'ڈالر' آگیا
اپنی گردن ناپنے کو اور 'کالر' آ گیا

(۱۹۵۲ء)

امریکی یلغار

جان نکسن آ گئے یا جارج میگھی آ گئے
جیسے آئے تھے کبھی انگریز یہ بھی آ گئے

(۱۹۵۳ء)

مجبوری

لوگ کیوں ہم پہ مسکراتے ہیں
جس کا کھاتے ہیں اُس کا گاتے ہیں

روئے دریا سلسبیل و قصر دریا آتش

عرش و فرش

ایفا نہ سہی وعدہ ہی سہی وہ دل تو ذرا پرچا جائے
جیسے نلکا پانی کے لیے کھولو وہ بس ٹھُرّا جائے

بربادیٔ دل پر اب دل بھی اِس طرح ملامت کرتا ہے
جیسے منگتو چُورن والا اپنا 'دوہڑہ' دوہرا جائے

ہر چھوٹی چھوٹی رنجش آخر کار گلہ بن جاتی ہے
جیسے دفتر میں جو پرزہ آئے فائل بنتا جائے

اللہ رے اُن کے طرزِ تکلم کی محتاط پریشانی
جیسے کوئی شاعر گھبرا کر اشعار، ردیف سے کھا جائے

غم بھی ہو اگر معقول تو کچھ جینے کو چمک دے جاتا ہے
جیسے کوئی 'آیا'، ستھری ہو تو اُس پر بھی دل آ جائے

روداد وفا، بیدادِ جفا — ہم بھول گئے کچھ یاد نہیں
جیسے کسی کالج میں لڑکا جیسا آئے، ویسا جائے

اب لفظِ محبت سنتے ہی یوں وحشتِ دل بڑھ جاتی ہے
جیسے کسی قوالی میں کوئی اک لفظ ہی جان کو آ جائے

اظہارِ غمِ دل پر اب تو خود مجھ کو ندامت ہوتی ہے
جیسے لیڈر تقریر کرے اور جلسہ ہی شرما جائے

یوں شام و سحر کے پردے سے امید جھلکتی رہتی ہے
جیسے کسی سلمیٰ کا آنچل، اُڑتا جائے، گرتا جائے

(۲۳ اپریل ۱۹۵۴)

شکارے اور شکاری

(وادیٔ کشمیر کے پس منظر میں)

چلے بند سے کاروباری چلے
شکاروں کے پیچھے شکاری چلے
چناروں کے شعلوں کو کجلا دیا
سفیدوں کو زُنّار پہنا دیا
کہیں سرو کو پابہ گِل کر دیا
کہیں زعفراں منتقل کر دیا
جو رہتے تھے کرنال کی نال میں
وہ سوتے ہیں کشمیر کی شال میں

وہ کھیتوں کے لبِ زعفرانی گئے
وہ چشموں کے سُر آنجہانی گئے
ہری سنگھ و ہربنس لال آ گئے
رعایا کے گھر راج پال آ گئے
غنی دھان بو کر اُگاتا ہے دھن
دھنی جا کے دہلی میں کھاتا ہے دھن
منظر، تربیت ، آبرو ، علم و فن
جو دل برہمن ہو تو سب برہمن

مولاداد بنام عطاالحق

چودھری مولاداد چوہان کہ راولپنڈی شہر کے پشتینی رئیس تھے، ایک مدت تک بلدیہ کے منتخب شہردار (چیئرمین) بھی رہے چودھری صاحب اور بلدیہ کے سرکاری ناظم الامور (اڈمنسٹر) شیخ عطاالحق کے درمیان عموماً نوک جھونک جاری رہتی تھی۔ چودھری مولاداد چوہان شعر و ادب سے بھی ایک گہرا فطری لگاؤ رکھتے ہیں۔ پنجابی کے سیکڑوں اشعار ان کو ازبر ہیں۔ اور اس وقت بھی کہ ان کی عمر بحمد اللہ ۹۰ برس سے تجاوز ہو گی، ان کی زندہ دلی اور شگفتہ گفتاری محفلِ یاراں کی رونق مانی جاتی ہے۔ ضمیرؔ

(۲۸ اگست ۱۹۹۰)

نقص یہ میرا کہ میں ہوں سخت 'مولا داد خو'
تیری خوبی یہ کہ تُو گُل پیرہن ، آئینہ رو
ممٹیاں تیری ، گلی کوچے ترے ، نلکے ترے
محوِ حیرت ہوں کہ صدرِ بلدیہ مَیں ہوں کہ تُو
میرے برخوردار ، میرے یار ، سب آبائے شہر
تو کرے قاضیؔ[1] سے جاکر اپنے دل کی گفتگو
ووٹروں کے کام اور دُشنام کس کے سر پہ ہیں
"کون طوفاں کے تھپیڑے کھا رہا ہے ، میں کہ تُو"
تو حبیبِ موٹراں ' ہے میں قریبِ ووٹراں
تُو فروزاں دفتروں میں ، میں پریشاں کُو بہ کُو
کچھ تو میری قدر کر ظالم کہ آخر صدر ہوں
میں نے یہ مانا بڑا 'بی اے' بڑا 'ایل ایل' ہے تُو

(۱۹۵۰ء)

---

[1] ممتاز قانون دان خان بہادر قاضی نذیر احمد

منکہ ایک نیم اڈیٹر

(روئے سخن بالکل اپنی طرف)

خبر لکھتا ہوں ، لیڈر لکھتا ہوں شذرات لکھتا ہوں
مگر بس اتفاقاً کوئی سچّی بات لکھتا ہوں
خبر لکھتے ہوئے بھی اپنے پیغامات لکھتا ہوں
ہُنر یہ ہے کہ میں جذبات میں حالات لکھتا ہوں

ہے جس شذرے پہ میرا نام وہ الہام ہے میرا

مرا خامہ بڑے میروں وزیروں کا شکاری ہے
کہ اک اک حرف تیغ بے اماں کی ضرب کاری ہے
دیانت کاروباری ہے ، صداقت اشتہاری ہے
"اڈیٹر اپنی فطرت میں نہ نُوری ہے نہ ناری ہے"
مرا شورِ قلم اک طرح کا نیلام ہے میرا

بہر شذرہ ، قلمکاری کا دُم خم دیکھتے جاؤ
اُچھلتی ، کانپتی دستارِ آدم دیکھتے جاؤ
کبھی فرصت میں میرا 'ففتھ کالم' دیکھتے جاؤ
یہ 'تُم تُم' ، دیکھتے جاؤ ، یہ 'ہم ہم' دیکھتے جاؤ
یہ تُم 'تمنام' ہے تیرا ، یہ ہم 'ہمنام' ہے میرا

مرے ہر خط میں امکانات کی تقدیر بولے گی
کہ اک اک لفظ میں سننا زبانِ میر بولے گی
جہاں جھٹکا دیا ، انصاف کی زنجیر بولے گی
زمانہ چُپ سہی لیکن مری تحریر بولے گی
کہ جو بحران ہے تیرا وہ استحکام ہے میرا

ہے کیا اطلانتک کا چارٹر میری بلا جانے
یہ ٹمکسمبرگ کیا اور کیوں ہے، اب انسان کیا جانے
جنیوا کی جنیوا ، کوریا کی کوریا جانے
حدیں جاپان کی جاپان جانے یا خدا جانے
مگر ہاں مصر میرا ، نجد میرا ، شام ہے میرا

۲۲۶ کلائیڈ روڈ ، راولپنڈی صدر

۱۹۵۰ء

ٹ : اپنے روزنامہ "بلوچستان" راولپنڈی میں اس نظم کا عنوان چوتھی نظم
"انجمن" کے تحت شائع ہوا تھا۔

انگریز کا مفاد

ہر ندی نالے میں بہتا ہے مفاد انگریز کا
یعنی دنیا بھر میں رہتا ہے مفاد انگریز کا
دوڑا پھرتا ہے قریب و دُور تک اِس کا مفاد
مالٹا سے چل کے سنگاپور تک اس کا مفاد
اللہ اللہ اِقتدار و اعتماد انگریز کا
سانس میں لیتا ہوں، چلتا ہے مفاد انگریز کا
لکھ رہا ہے امن کا نسخہ نیا آئین بھی
دیکھیے اِس کو ملایا کا ربڑ بھی ٹین بھی
ایک بابِ فتنۂ و ہنگامہ ہر سو باز ہے
کتنا 'انٹرنیشنل' برطانیا کا 'اگاڑ' ہے

۲۲ جنوری ۱۹۴۷

○

وہ اُدھر شمشیر لہرانے لگا
میں اِدھر تقریر فرمانے لگا
یادِ یارِ مہرباں آنے لگا
بھائیو! لینا کہ میں جانے لگا
بحث پر کلچر کی جب پہنچا خطیب
جانے کیا کیا چیز کھُجلانے لگا
سُنیے! اک شاعر سے اب اسکی غزل
لیجیے! وہ بھیروِیں گانے لگا
رات کا جاگا ہوا تیرا ضمیر
دن کو دفتر میں بھی سوجانے لگا

(کوئٹا) (بریگیڈیر اختر ملک کے گھر)

○

جوانی اپنی حد سے جب گزرتی ہے جوانوں میں
تو ہڑتالیں کرا دیتی ہے اپنے کارخانوں میں
سما سکتے نہیں تھے جو زمینوں ، آسمانوں میں
انھیں دیکھے کوئی بارود خانے کے مکانوں میں
یہی ذوقِ نزاکت ہے اگر اپنے جوانوں میں
تو دیکھو گے بہن کی بالیاں ، بھائی کے کانوں میں
حدِ قرآن و دیں سے بے خطر رہیے مجھے کہیے
کہ ہیں دو چار ' دانشور ' بھی میرے مہربانوں میں

زمانے بھر سے ٹکرا کر مسلمانوں کی درویشی
بڑے آرام سے لیٹی ہوئی ہے 'برف خانوں' میں
انار و طاق سے ان میں بھی جھانکو، ان میں بھی دیکھو
مبادا شہد بیٹھا ہو پرانے مرتبانوں میں
ہمارا جذبۂ بے اختیارِ شوق کیسا کہنا
کڑک کر تیر جیسے ٹوٹ جاتا ہو کمانوں میں
مری نشتر زنی احساس کا اک قرض ہے، ورنہ
میری اوقات ہی کیا ہے نہ پیسوں میں نہ آنوں[1] میں
ضمیر اپنی طبیعت پر مجھے خود بھی تعجب ہے
ادیبوں میں ادیب اور پہلواں ہوں پہلوانوں میں

(۱۹۵۳ء)

---

[1] آنا۔ چار پیسوں کے برابر ایک چھوٹا سکہ جو کبھی رائج تھا۔

○

اِن کا منشا تھا برائے نام ہونا چاہیے
ہم یہ سمجھے واقعی اسلام ہونا چاہیے
آپ یہ کہتے ہیں کوئی کام ہونا چاہیے
میں یہ کہتا ہوں کہ بس آرام ہونا چاہیئے
کوہکن نے کھول لی "سیمنٹ" کی انڈسٹری
کوہکن کا نام اب گھنشام ہونا چاہیے
حضرتِ ناصح کے لیکچر کا خلاصہ یہ ہوا
آدمی کو شربتِ بادام ہونا چاہیے

۱۵۴ میکسن روڈ راولپنڈی چھاؤنی
(۱۹۵۴ء)

ا؎ بھارتی سیٹھ گھنشام والمیا

چھوڑ دے

زلفِ نگار و ساغرِ صہبا بھی چھوڑ دے
جینا ہی کیا ضرور ہے جینا بھی چھوڑ دے

مجنوں پہ کاش، مادرِ لیلیٰ کبھی کبھی
لیلیٰ کو چھوڑ کر ــــــ سگِ لیلیٰ بھی چھوڑ دے

زیبا تو ہے کہ ہو تنِ ملت پہ کچھ لباس
لیکن کبھی کبھی اسے ننگا بھی چھوڑ دے

۴۷، کومیلا لائن ملیر چھاؤنی

(۱۹۵۲ء)

الحاج

یہ نکتہ میں نے کل حاجی میاں رمضان سے پوچھا
کہ حاجی سے بڑی کیا چیز یہ الحاج ہوتا ہے
عبا سے پونچھ کر عینک کا شیشہ، کھانس کر بولے
میاں الحاج بھی من جملۂ حجاج ہوتا ہے
یہاں بھی کار فرما ہے مگر انساں کی صف بندی
یہاں بھی امتیازِ صاحب و محتاج ہوتا ہے
ہو تیرے "بھابھڑا بازار" کا باسی تو بس حاجی
مری گلبرگ میں کوٹھی ہو تو 'الحاج' ہوتا ہے

○

وہ آگئے تو گھر ہی نہیں ـــــ بوریا کہاں
ہم سا بھی کوئی عاشقِ پاور ہوا کہاں

زاہد سے یہ مذاق نہ فرماؤ ـــــ جاؤ ! جاؤ
زاہد کہاں بہشت کی آب و ہوا کہاں

موجوں سے اب بنامِ خدا پوچھتے پھرو
کشتی کو لے کے ڈوب گیا ناخدا کہاں

چندہ بغرض رقص بہ خالِ صنم ـــــ بہت
پیسا برائے دین و بہ نامِ خدا کہاں

اے محتسب نہ چھیڑ کہ صحرا میں روز روز
یہ ابر یہ گھٹا یہ ہوا یہ فضا کہاں

چُپ چُپ ، خفا خفا سا یہ رہنا ضمیر سے
مانا کہ ہے بُرا مگر اِتنا بُرا کہاں

ملیر چھاؤنی (۱۹۵۱ء)

○

ناز نینوں سے پیار کرتا ہوں
بس یہی روزگار کرتا ہوں
جس برائی سے روکتا ہوں تمھیں
خود وہی بار بار کرتا ہوں
نالہ اُٹھے تو بیٹھ جاؤ تم
میں یہی میرے یار کرتا ہوں
کاہلی بھی ضمیرؔ کام آئی
شاعری بے شمار کرتا ہوں

شُترگُربہ

شیخ جی کا طرّۂ دستار اونچا ہو گیا
'دین کی دنیا' کا دنیادار اونچا ہو گیا
'کار' کی حسرت میں یہ بے کار اونچا ہو گیا
اپنی ناداری میں ناہموار اونچا ہو گیا
علم نیچے رہ گیا ——— مینار اونچا ہو گیا

مے کدے میں سرد ہے جوشِ ملاقات آج کل
گھٹ گئے ۔ 'راتوں کی سلطانی' کے اوقات آجکل
سخت مشکل میں ہیں رندانِ خرابات آجکل
بار[1] کی جانب بڑھا جب بھی کوئی ہاتھ آجکل
'بار' اونچا ہو گیا ——— ہر بار اونچا ہو گیا

---

[1] BAR (مغربی طرز کا مے خانہ)

دریے آدم وہ آدم زاد منھگائی ہوئی
باپ پچھتایا ہوا —— اولاد گھبرائی ہوئی
جس کی صورت دیکھیے ہے یوں 'کلرکائی' ہوئی[1]
اک گھٹا برسی ہوئی ہے، اک گھٹا چھائی ہوئی
جیب نیچے رہ گئی —— بازار اونچا ہوگیا

(۱۹۵۶ء)

---

[1] "کلرک" کے ساتھ کھینچا تانی

○

انساں کی ارتقا زندگی دیکھتے رہے
انسانیت کی جاں پہ بنی دیکھتے رہے
بس دور ہی سے اُن کی ہنسی دیکھتے رہے
یعنی خوشی برائے خوشی دیکھتے رہے
گو ترکِ آرزو پہ بڑھاپے گزر گئے
پھر بھی انھیں کبھی نہ کبھی دیکھتے رہے
ہر شئے زمیں کی لوگ سمیٹے چلے گئے
مولانا انتظار علی دیکھتے رہے
کس دل سے بزمِ غیر میں دیکھا کیے، مگر
اُن کی ہنسی ــــــ خفی کہ جلی، دیکھتے رہے
یوں جہدِ البقا سے نبٹتے رہے ضمیرؔ
لیٹے رہے کبھی تو کبھی دیکھتے رہے

(۱۱ستمبر۱۹۵۱ء)

احترامِ صیام

دیکھو تو ہوٹلوں کے رخِ تابناک پر
پردے گرا دیے گئے ماہِ صیام میں
جھانکو تو مرغہائے مسلّم کے سامنے
بیٹھے ہیں مومنین کے ٹھٹ احترام میں

(۱۹۵۹ء)

کراچی میں پہلا دِن

میں کراچی آ گیا ، میری خطا کچھ بھی نہیں
'نوکری' ـــــ جُز خوئے تسلیم و رضا کچھ بھی نہیں

بات پہلے دن ہی جب دفتر میں کی چلی
جس کے جانانہ تلوّن کی ادا ، کچھ بھی نہیں

مجھ سے یوں کہنے لگا اک ـــــ 'ہیڈ کلرکِ سالخوردہ'
یہ حکومت کا 'مقامِ کبریا' کچھ بھی نہیں

دوڑتی پھرتی ہے ہر سُو 'کار' ـــــ سابو کار کی
تیری خاطر اے غریبِ خستہ پا ، کچھ بھی نہیں

دیکھنا! حُسنِ کلفٹن پر نہ مر مٹنا کہیں
ان کی آنکھوں میں مروت یا حیا، کچھ بھی نہیں

مے کے ساغر قصر و ایواں میں چھلکتے ہیں بہت
اپنے حصّہ میں بجز آب و ہوا کچھ بھی نہیں

معجزہ ہے میرے نظم و ضبط کا میرا مکاں
ورنہ یک گنجایشِ بیت الخلا کچھ بھی نہیں

سن رہے ہیں کتنے منصوبوں کے اعجوبوں کا شور
جن کا سَر دھڑ، کاٹھ قد، یا نقشِ پا، کچھ بھی نہیں

روگ اِس شدّت سے پھیلا ہے کہ اے ہاشم رضا[1]
اب علاجِ اِس کا فقط ہاشم رضا، کچھ بھی نہیں

ہے یہاں سب کچھ مگر 'سیٹھ و سکتر' کیلئے
میرے تیرے واسطے میرے 'بھرا[2]' کچھ بھی نہیں

(۱۹۵۰ء)

---

[1] سیّد ہاشم رضا (کراچی کے کلکٹر تھے)

[2] بھائی کے معنی میں پنجابی لفظ

یک بام و دو ہوا

ملک سر فیروز خان نون کے پنجاب کا وزیر اعلیٰ منتخب ہونے پر اور پھر اُن کے برطرف ہونے پر ایک ہی حلقے کی طرف سے متضاد تبصروں پر۔ (ض)

آنے پر

اِس کی خوش تدبیری و خوش انتظامی پر نثار
اس کی خوبی پر تصدق اس کی خامی پر نثار
اِس نے دیکھے چمسفرڈ و اردن و دلیول کے ہاتھ
اِس نے کھائے ہیں ڈنر، سر مالکم ہیلی کے ساتھ

نظم و ضبط و عدل اِس کے نام کی مخصوص چھاپ
یہ زمینداروں کا چاچا، یہ ’سوِل سروس‘ کا باپ
تجربہ اِس کا ہے، علم اِس کا ہے باتیں اِس کی ہیں
”نیند اِس کی ہے، دماغ اِس کا ہے، راتیں اِس کی ہیں“

جانے پر

آفریں صد آفریں جس نے ہٹایا نُون کو
اپنے پاجامے سے کیا نسبت بھلا پتلون کو
فکر و دانش میں وہ لندن کے سوا کچھ بھی نہیں
دیدہ و دل میں ــــ ’امرسن[۳]‘ کے سوا کچھ بھی نہیں
کیوں پھراتے ہیں عبث اب در بدر فیروز کو
سر مظفر[۴] اپنے گھر سے جائیں سَر فیروز کو
نام کا ’لیگی‘ ــــــ مگر دل کا ٹوانہ ہی رہا
یہ پرانا آدمی آخر پرانا ہی رہا

۸ جون ۱۹۵۵

---

۱ ہندوستان کے انگریز وائسرائے ۲ پنجاب کا گورنر ۳ گورنر ایمرسن ۴ فیروز خان نون کے دوست سر مظفر علی قزلباش ۵ مسلم لیگ ۔

برسبیلِ مشاعرہ

کہیں قتیلؔ، کہیں دانشؔ و عدمؔ نکلے
ندیمؔ و صوفیؔ و عابدؔ علی بہم نکلے
کہیں کلیمؔ، کہیں ثاقبؔ اور جالبؔ تھے
یہ غالبانِ سخن ریل پر بھی غالب تھے
میں سوچتا ہوں الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
تمام شہرِ نگاراں کو ہو گیا کیا ہے
مری ہی وضع کے مرادانِ حُر سفر میں ہیں
جو اور طرح کے ہوتے ہیں آج گھر میں ہیں

---

۷ فروری ۱۹۶۰ کو برسبیلِ مشاعرہ بہاولپور جاتے ہوئے بعض نامور شعرا جناب قتیل شفائی، جناب احسان دانش، جناب عبدالحمید عدم، جناب احمد ندیم قاسمی، جناب صوفی تبسم، جناب سید عابد علی عابد، جناب کلیم عثمانی، جناب ثاقب زیروی اور حبیب جالب کی ہم سفری کا اعزاز حاصل ہوا۔

زندگی

موسیقی کی تان میں بھی جذبات کا اک ہیجان سہی
بچے کی معصوم ہنسی، جاں کو تابندہ رکھتی ہے
سورج، چاند ستارے ہی بس جینے کا سامان نہیں
گھر میں پھرتی بلی بھی انسان کو زندہ رکھتی ہے

حُسن

حُسن اپنی نظر میں ہوتا ہے
یہ ستارہ ـــــ سحر میں ہوتا ہے
جو بھی عورت ہے خوبصورت ہے
یہ تری روح کی ضرورت ہے

بھیک کا چارہ

جینا ہے تو اپنے ہاتھوں اپنے سارے کام کرو
کب تک زندہ رہتا ہے کوئی بیمار سہارے سے
قدم قدم پہ ٹھوکر کھائے، چلے بھی چابک مارے سے
گھوڑا موٹا کر بھی لیا گر تُم نے بھیک کے چارے سے

قومی لباس

جب سے قومی لباس کا ہے چلن
بدلا بدلا ہے گفتگو کا شعار
روز مرّہ ــــــ محاورے پہ سوار

زینے سے ہم اُتر رہے تھے آج
ہمہ ایں توش و تن ـــــ صبا رفتار
شیخ[۱] منظور بھی تھے ساتھ اپنے
(وہ ادیبِ شہیر، خوش رفتار)
میری حالت کو دیکھ کر بولے
از رہِ دلکشائیِ اظہار
"میر[۲] صاحب یہ زینہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے شلوار"

(۲۱ مئی ۱۹۸۲)

---

۱ اردو کے ممتاز ادیب و مصنف شیخ منظور الٰہی
۲ مصرع میر تقی میر بہ مداخلتِ بے جا

بلبل اور مرغ

دعا مانگی یہ بلبل نے
خداوندا ۔۔ ۔ !
مرے نغمے کی لہروں کو
سمندر کی روانی دے
گلوں کی میزبانی دے
سُروں کی ساربانی دے
یہ سُن کر مرغ اک بولا
نہ دانہ دے نہ پانی دے
مگر یا رب !
جوانی غیر فانی دے

پتے کی بات

لالہ مصری خان نے کتنے پتے کی بات کی
اپنے ' بی اے ' پاس کو کوئی ہنر آیا نہیں
کیا کریں گھر والے برخوردار کے اس علم کو
بھوک تو گھر آگئی آٹا مگر آیا نہیں

سرمایہ

ہو کمالِ سرمایہ یا زوالِ سرمایہ
ایک جبر تنوری، ایک صبر مجبوری
زندگی بہر صورت پائمالِ سرمایہ ے : پامال

رسّہ کشی

ایک پاؤں خشکی پر ، دوسرا سمندر پر
دو رُخی محبت میں دیکھیے کمال اپنا
دین میں بھی دل اپنا، مال پر بھی جال اپنا
رزق ہے حرام اپنا، گوشت ہے حلال اپنا

گینڈوں میں بکری

(ایک بین الاقوامی کانفرنس کی تمثیل)

جبر کے کالے جنگل میں گینڈوں سے گالی کھا آئی
وحشی پاگل غُرّش میں کچھ "مم مم مم" — ممیا آئی
بھوکی پیاسی، بھولی بھالی اپنا بھرم گنوا آئی
بکری سینگ تو کیا بنواتی اپنے کان کٹا آئی

ٹوٹل دانائی

نیتاؤں نے تقریروں میں تصویر دکھائی کیا ہو گی
بُحران اُجالے کیا ہوں گے، اُلجھن سلجھائی کیا ہو گی
گمبھیر سیہ شب لبری کی تدبیر بتائی کیا ہو گی
جاہل افراد کے جلسے میں 'ٹوٹل دانائی' کیا ہو گی

ٹیلی وژن کا اونٹ

کوئی کہتا ہے بہر ساعت خدا کا نام ہو
کوئی کہتا ہے بہر منظر کوئی گلفام ہو
کوئی کہتا ہے کہ ہو لاہور کی صبحِ جمیل
کوئی کہتا ہے کراچی کا فروغِ شام ہو
کوئی کہتا ہے مفصّل نغمۂ عشرت چلے
کوئی کہتا ہے، مسلسل گردشِ ایام ہو

کوئی کہتا ہے کہ "جمبوجٹ، پہ مولا جٹ" اُڑے
کوئی کہتا ہے کہ گھوڑا اور تانگا عام ہو
کوئی کہتا ردحی پر دوپٹا تک نہ ہو
کوئی کہتا ہے کہ پورا جامۂ احرام ہو
کوئی کہتا ہے برے اصنام ہی اصنام ہوں
کوئی کہتا ہے فقط اسلام ہی اسلام ہو
کوئی کہتا ہے، حکومت کی سدا تسبیح پڑھ
کوئی کہتا ہے حکومت ہی پہ سب الزام ہو

ق

ہر خبر کے بیچ سے نکلے کوئی تازہ وزیر
ہر سخن میں 'سات مرے' کا کوئی پیغام ہو
کوئی کہتا ہے بُتوں کی بھی خودی باقی رہے
کوئی کہتا ہے، خدا کا نام بھی نیلام ہو

سُپر مرغ

روس ہو یا امریکا ہو
اِن سے لے تو سائنس لے
ورنہ تیری مانگ غلط
اِن مرغوں کی بانگ درست
اِن مرغوں کی ٹانگ غلط

گھمن گھیری

لوگو! کیا احوال کہیں اب سمے کی بے رُت رنگت کا
اِس بپھرے پاگل دریا میں کیا کیا 'گھُمن گھیری' ہے
کلی تو چٹکے دھیرے دھیرے، پھول بکھرتے دیر نہیں
دن تو گزرنے میں نہیں آتا، سال گزرتے دیر نہیں
سورج ہے اور صبح نہیں ہے، بیری ہے اور بیر نہیں

آرٹ

آرٹ کی اک مجلس کے میاں
بولے ـــــــ لالہ مصری خاں
آرٹ کا کون بنائے چارٹ
ہر انسان کے اندر آرٹ

مشورہ

مے کبھی پی کر بھی دیکھ
یار کچھ جی کر بھی دیکھ
درد بے درماں سہی
زخم کو سی کر بھی دیکھ

○

لُغت سب کی سب اشتعالی کیے جا
اُلف، امن کو "گاف" گالی کیے جا
بھری جیب اُس دَر پہ خالی کیے جا
کیے جا محبت مثالی کیے جا
نیا دن ــــ نئی صبح لایا مگر تُو
وہی بات کل رات والی کیے جا
تہی دست لفظوں کے مرگھٹ پہ جا کر
کیے جا ــــ غزل کی جُگالی کیے جا
بجٹ کم سہی ــــ کار لمبی رہے گی
روالا تو ہو گا ــــ دوالی کیے جا
جوانی میں ہر شے اُجالی تھی تُو نے
بڑھاپے میں ہر چیز کالی کیے جا
اُتر کر ذرا فقر کی سان سے اب
جلالی خودی کو سوالی کیے جا
نہیں کوئی سنتا مگر تو مسلسل
وہی اپنے ارشادِ عالی کیے جا

سکندری و قلندری

یہ بھی دیکھا ہے کہ جنگاہِ جہاں میں آدمی
جب سکندر بن نہیں پایا قلندر ہو گیا
یہ تھی تحلیلِ تخیلؔ یا تھی تبدیلِ انا
آدمی باہر سے پسپا یا تو اندر ہو گیا

جال

سادہ سے اک دھاگے میں
دنیا بُن لیتی ہے جال
ہر آسان جواب میں ہیں
کتنے کانٹے دار سوال

قدردانی

فیض ہو یا حفیظ و فانی ہو
زندگانی میں لامکانی ہو
لوگ شاعر کی قدر کرتے ہیں
اس جہاں میں جب آں جہانی ہو

زندگی

اُونچے اُونچے فلسفوں کی تہ میں کیا اترے ضمیر
کون جانے بُردنی یا خوردنی ہے زندگی
اتنے تھانوں اور وکیلوں اور شفاخانوں کے بعد
لوگ اگر زندہ ہیں تو نامردنی ہے زندگی

سنیم کاری

(۱۹۷۹ء کا بجٹ)

تیل سے جلایا ہے ، سگرٹوں سے یاری ہے
کچھ نرا ملمع ہے ، کچھ سنیم کاری ہے
اس بجٹ کے بارے میں رائے یہ ہماری ہے
شوقِ پا پیادہ کا عزم گھڑ سواری ہے

خانہ ویرانی

(افسروں کے گھروں سے سرکاری ٹیلی فونوں کی چھانٹی پر)

گھر ہو گیا گونگا سُونا ٹیلی فون بغیر
افسر ہوا بے خبر و نہ ٹیلی فون بغیر
صاحب تو نشستم پشتم اِس رِن جی بھی لے
اجڑی تو بیگم مونا ٹیلی فون بغیر

بجٹ ۱۹۸۰ء

ایک دُھن ، اک خیال مجورِ دل
مال کِس کِس سے کر سکیں حاصل
جس سے لکھا گیا ہمارا بجٹ
تھی کسی 'سیلز مین' کی پنسل

گریمر کی غلطی

زندگی موت ہے ، موت ہے زندگی
دن نظر آ رہا ہے مگر رات ہے
ناصحِ خوش بیاں جو چھپے سو کہے
یہ 'گریمر' کی رُو سے غلط بات ہے

بجٹ ۱۹۸۳ء

اگر سائیکل چور ـــــــ موٹر چرائے
تو ہم پر یہ لازم کہ ہم مسکرائیں

چلو کھو گئی ایک موٹر ہماری
فزوں تو ہوئی اپنی خوش روزگاری

مبارک کہ ہے شان و شوکت زیادہ
مبارک کہ ہے مال و دولت زیادہ

معیشت کو مضبوط بنیاد کہیے
وزیرِ خزانہ کو دھنباد کہیے

○

زَر وسیم و طَبل و عَلم دیکھتے ہیں
حرم میں صنم ہی صنم دیکھتے ہیں
ستم دیکھتے ہیں ، کرم دیکھتے ہیں
بُتوں کو زِسَر تا قدم دیکھتے ہیں
پسِ شہر دیوار ـــــ کیا ہو رہا ہے
نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں
پہاڑوں کو اور جنگلوں کو دعا دو
کہ انساں کو کچھ تازہ دم دیکھتے ہیں
جرائم کی فہرست لٹکانے والے
جرائم کے اسباب کم دیکھتے ہیں
کئی لفظ آج اپنے مبہم رہیں گے
بڑی دور کے غم بھی ہم دیکھتے ہیں

جہاں پھول سرسوں کے برسوں کھلے تھے
وہاں دود و بارود و بم دیکھتے ہیں

مرا شہر مغرب کا گھر ہے
وہ فلمیں بناتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں

تجھے بھی خبر ہے کہ اے جانِ خوبی
تجھے کس ارادے سے ہم دیکھتے ہیں

حقیقت میں بس ایک ہی مسئلہ ہے
زیادہ جو پڑھتے ہیں، کم دیکھتے ہیں

نئی اینٹ کے روغنی چوکھٹوں میں
ابھی قتل گاہوں کو ہم دیکھتے ہیں

امیرِ عساکر ہے میرِ معانی[1]
چلو آگ پانی بہم دیکھتے ہیں

بدل کر 'وزیروں' کا اب بھیس غالب
تماشائے 'اہلِ قلم' دیکھتے ہیں

---

[1] یہ اشعار اسلام آباد میں 'یوم غالب' کے ایک طرحی مشاعرے کے لیے لکھے گئے جس کی صدارت وزیر دفاع میر علی احمد تالپور کر رہے تھے۔

جوانِ امروز سے

تجھے یہ کس نے کہا اے جوانِ کم امروز
نئی زمین ——— نیا آسمان پیدا کر؟

خدا اگر دلِ مردہ تجھے نصیب کرے
دماغ پژدہ و خوردہ تجھے نصیب کرے
کوئی فضول فشردہ تجھے نصیب کرے
کوئی پھٹا ہوا گردہ تجھے نصیب کرے

تو کھانے پینے کا کوئی پلان پیدا کر
خودی کی راکھ سے بکرے کی ران پیدا کر

حقیقتوں پہ نہ جا ــــــ داستان پیدا کر
نہیں ہے شیر مگر شیر خان پیدا کر
مباحثوں کے لیے کرسیاں لگائے جا
مذاکروں کے لیے سائبان پیدا کر
عمل سے نفرت و کینہ کے بیج بو بے شک
مگر زبان ــــــ خلیق الزمان ــــــ پیدا کر
مخاصمت کے پہاڑوں سے درگزر پیارے
منافقت کی رہِ درمیان پیدا کر
سکندروں کے سمندر ہیں تیرنا ہے تجھے
قلندروں کے لیے بادبان پیدا کر
ضمیر عصر سفیری نہیں ــــــ وزیری ہے
پیمبروں کی جگہ پہلوان پیدا کر

خدا اگر دلِ مردہ تجھے نصیب کرے
کوئی پھٹا ہوا گردہ تجھے نصیب کرے
تو مرتبے کی جگہ مرتبان پیدا کرے
مقام بیچ کے اپنا مکان پیدا کرے

سچائی

سچائی وہ کُندن ہے جو نکلے عمل کٹھالی سے
فلسفیوں نے سچائی کی یہ تعریف بتائی ہے
لالہ مصری خان سے جب پوچھا تو انھوں نے فرمایا
جو شے وقت پہ کام آئے بھائی بس وہ سچائی ہے

فلسفہ

فلسفے کے نکات رہنے دو
قوم اِس سے کہاں بدلتی ہے
میرے ساتھ آیئے سٹیشن پر
دیکھیے ریل کیسے چلتی ہے

○

دنیا تھی دشوار زیادہ
رستہ کم ۔ دیوار زیادہ

جھیلے ہیں آزاد زیادہ
ہم نے کیا تھا پیار زیادہ

ناصح کا حلیہ تو دیکھو
سر چھوٹا ، دستار زیادہ

رندوں میں کم خوش اوقاتی
واعظ دنیا دار زیادہ

تسلسل

ببری بوٹا، چھاج کی چھنکن، بھیڑ کے پڑے کی مم مم
گھر کی رہن سہن کو رخشندہ، تابندہ رکھتی ہے
'جٹ جمبو' میں اڑنے والو، اڑدو پر اتنا دھیان رہے
اُن چیزوں کو ختم نہ کر دو جو تمھیں زندہ رکھتی ہیں
شکلیں ——— آوازیں ——— اور قدریں
ماضی کی بھی کچھ چیزیں اپنا آیندہ رکھتی ہیں

کیا سمجھے

ہر بچّہ اک باپ سہی
لیکن لالہ مصری خان
باپ بھی ہے اور بچّہ بھی
پکّا بھی اور کچّا بھی
کیا سمجھے؟

عارضی مستقل

خیام ہی میں قیام کا پہلے عارضی انتظام کرنا
پھر اپنے خیموں میں شہرِ یاراں کا مستقل انضمام کرنا
تمھارا طرزِ جہاں روائی۔ ، سپُر مقامو ، سمجھ گئے ہم
مصافحے میں سلام کرنا ، معانقے میں غلام کرنا

پیمانۂ امروز و فردا

جبکہ انگریزی میں ہو سب کاروبارِ عاشقی
درمیاں پھر اپنی اردو رائیگاں کیوں کر کریں
وہ یہ بولی : عشق ویری گڈ مگر اے ڈارلنگ
زندگی کا یہ سفر کتنے کلو میٹر کریں

اکائی

شیشے کا غم کب چھلک پاتا ہے خطِ جام سے
دُکھ کا اندازہ نہ کرنا عارضی آرام سے

اعتماد

اپنے آپ پر کتنا اعتماد رکھتے ہیں
زندگی نہیں رکھتے ، زندہ باد رکھتے ہیں
ذہن اور ضرورت میں اک عجب تعلّق ہے
علم ہم نہیں رکھتے ، اعتقاد رکھتے ہیں

احسان

کام نہ دے انعام عطا کر اے قادر قیّوم خدا
اک کوٹھی سامان کی دے، لمبی موٹر جاپان کی دے
بخشش کا سامان بھی کر اک دو رتّی ایمان کی دے
پاکستان بنایا ہے تو قیمت اِس احسان کی، دے!

تعلیم و تربیت

حصولِ علم کا ہے گر مدام لِکھ، مدام پڑھ
چھٹانک علم کے لیے حروف 'سو گرام' پڑھ
مگر کوئی نظامِ فکر و تربیت ہے لازمی
نہ یہ کہ تو سیام جا کے حافظ و خیام پڑھ

چنبیلی لڑکی

کیا بات کریں
اُس مست نظر البیلی کی
وہ نازک شاخ چنبیلی کی
ہلکے سے ہوا کے جھونکے سے
دوہری تہری ہو جاتی ہے
غنچے سے بھی تنگ دہن اِس کا
کوئی کیا جانے
روٹی وہ کہاں سے کھاتی ہے

اکائی

وہ کس کام کا جینا جیسے زندہ —— مردہ کام کرے
جام اُٹھاؤ پیتے جاؤ جب تک گردہ کام کرے

مُلّا دو پلازے[1]

رشوت اور سمگلنگ کے آسمان طرازے ہیں
سر سے بے نیازے ہیں، زر کے سرفرازے ہیں
علم وِلم مت پوچھو، ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھو
داغ دار ٹھیکوں کے 'سازے ولوازے' ہیں
مایا سے کِلپ ہو کر کایا کیسی پلٹی ہے
کل رزے کبوتر تھے آج 'شاہ بازے' ہیں
تن بدن کے اُجیالے، من سیاہ، دھن کالے
قول حاجیوں والے، فعل 'بے نمازے' ہیں
اکبری زمانے میں مُلّا دو پیازہ تھا
آپ اِس زمانے کے "ملّا دو پلازے" ہیں

---

[1] بلند و عظیم عمارات کے لیے انگریزی کا لفظ "پلازا" اب اردو زبان کی 'رہائش' میں داخل ہو چکا ہے (ض)

اوس پیاس

چلمن کی جھلمل جالی سے
آدھا رخسار دکھاتے ہیں
اِس دل کے جلتے صحرا کی
وہ اوس سے پیاس بجھاتے ہیں

رازِ جوانی

چھتری تانے، چھڑی سہارے، ہمت ہارے ہم عمرو!
مجھ سے پوچھو پیری میں رکھنا چونچال جوانی کو
کان لگا کر چلتے رہنا ہر مستانی آہٹ پر
جرأت سے دوہراتے رہنا ہر دلکش نادانی کو

(۱۹۸۸ء)

آگہان

کون خریدا جاتا ہے آسانی سے ؟
ضدّی شخص
کِن کو ڈرانا آسان ہے ؟
کمزوروں کو
کِن کو 'ترمانا'۔۔۔۔۔بھڑکانا آسان ہے ؟
عادی شیخی خوروں کو

عورت

جھومر جھمکے پہنائے رکھ
زلفوں میں اِسے الجھائے رکھ
ریشم کی راس رچائے رکھ
ورنہ مسٹر!
عورت جو برابر ہوتی ہے
وہ مرد سے بہتر ہوتی ہے

اکائیاں

وہ پانی سادہ پیتے ہیں یہ رنگیں بادہ پیتے ہیں
صوفی تمثیلاً جیتے ہیں، میکش تفصیلاً جیتے ہیں

○

اقدار غلط ہو جاتی ہیں، وجدان غلط ہو جاتا ہے
تعلیم غلط ہو جانے سے، انسان غلط ہو جاتا ہے

پیش رفت

زندگی پہ مرتے ہیں، روشنی سے ڈرتے ہیں
بانس کے سہارے ہم قد دراز کرتے ہیں

○

ہاتھ میں کتاب اپنے ، ذہن میں سراب اپنے
مُنہ سے سوال اپنے ، پیچھے جواب اپنے
سَر سرِ سحاب اپنے ، پاؤں بے رکاب اپنے

○

اپنا یہ تشخص ہے آج کے زمانے میں
جوہری خرادوں ، کے تیز کارخانوں میں
آرزو میں چوکس ہیں ، جستجو میں کاہل ہیں
عالموں کی دنیا میں بہترین جاہل ہیں

ٹماٹر کی اولاد

سنا ہے کہ جاپان کے ماہروں نے
کہ ہیں نام جن کے ــــــ نمادو ، یمادو
ٹماٹر میں آلو کی اولاد رکھ کر
کوئی کھاد رکھ کر ــــــــــــــ

اُگائی ہے اک شے ــــــ پٹاٹوٗ ٹماٹو،
اننّاس اگر اِس کو نیچے سے کاٹو
نری رس ملائی جو اوپر سے چاٹو

○

عزیزو ہنر اور حکمت سے تم بھی
وطن کی فصیلِ فلاکت کو پاٹو

اصلی شخص

مُلّا ، مسٹر ، قُلی ، قلندر
یہ سب ہیں بیرونی شکلیں
بلکہ نقلیں
اصلی شخص ہے تیرے اندر

ہمارے دوست

عجب 'چینک' ہے جس میں چائے کی پتّی نہیں ہوتی
ہمارے دوست عینک دے کے بینائی نہیں دیتے
یہ 'تکنیکی محبّت'، جس کی باریکی کے کیا کہنے
ہمیں وہ مشورے دیتے ہیں، دانائی نہیں دیتے

دُور درشن

دوسرے کی موٹر میں
دوسرے کے بازو میں
دوسرے چبارے پر
دوسرے کنارے پر یا کسی ستارے پر

جو بھی شے پرائی ہو
ماہ ہو کہ 'مائی' ہو
کوئی شکل ہو جس پر
عورتوں کی جھلّی ہو
خواہ 'کوڑ کِلّی'[1] ہو
کیا حسین لگتی ہے
اپنے سب اثاثے سے
بہترین لگتی ہے

الجھن

میں بڑی الجھن میں ہوں
کوئی اچھی بات کہہ سکتا نہیں
چپ بھی رہ سکتا نہیں

---

[1] چھپکلی

اکائیاں

اہلِ قلم پہ لفظ کے کیا کیا کرم نہ تھے
بے روز گار ہو کے بھی بے کار ہم نہ تھے

○

خبر یہ ہے کتابوں کی اشاعت بڑھتی جاتی ہے
اثر یہ ہے کہ لوگوں کی جہالت بڑھتی جاتی ہے

○

زندہ ہے جو فن کار اُسے بھوک سے مار دو
مر جائے تو مُردے کا کفن خوب سنوار دو

ایک ریفرنس

(قومی اور بین الاقوامی وڈیروں کے نام)

مرے کھیت میں خرمن تیرا ہے
جاں میری ، جوبن تیرا ہے
جو بجھ گئی راکھ ہماری تھی
جو نکھر گیا فن تیرا ہے
پیچھے یہ گاڑی میری ہے
وہ آگے انجن تیرا ہے
برسے ہوئے بادل میرے ہیں
اُمنڈا ہوا ساون تیرا ہے
گھی تیرا —— کنستر میرے ہیں
ہے باغ تو میرے نام ، مگر
سب سرو ، صنوبر تیرے ہیں
یہ گلیاں یہ گھر میرے ہیں

ساگر سے تیل نکالو تم
تہ کے موتی بھی جالو تم
ہر چالی ، گلی محلّے میں
اپنا فٹ بال ، اچھالو تم
جو من چاہے ، منوا لو تم
جو ہاتھ لگے ، ہتھیا لو تم
ساگر تیرے ، ساحل تیرے
ہر چھوٹی مچھلی کھا لو تم
جَل اُس کا ، جس کا جال میاں
یوں سات سمندر میرے ہیں
مرغی تیرے — پَر میرے ہیں
یہ گلیاں یہ گھر میرے ہیں
دنیا بستہ برادر تری
سجدے میرے ، سرکار تری
سبحان اللہ — سبحان اللہ
تِلّے والی دستار تری

چمکیلی موٹر کار تری
ٹوٹے ہوئے ٹائر میرے ہیں
مرمر کے محل وہ تیرے ہیں
یہ پھوس کے چھپّر میرے ہیں
توپیں تلواریں ڈھالے جا
ہاں آگ کے 'بھانبڑ بالے' جا
جو آتا ہے ، وہ آنے دے
جو ٹلتا ہے ، وہ ٹالے جا
دھرتی کی رگیں بارود سے بھر
بندوق بنا ، لوہا لے جا
مشرق کے پرندوں کی خاطر
تُو 'باگڑ بلّے' پالے جا
وہ کھلے 'جناور' تیرے ہیں
در بند کبوتر میرے ہیں
یہ گلیاں یہ گھر میرے ہیں

۱۲ دسمبر ۱۹۸۲

ایک بہادر شخص

قبر ہے یہ اک بہادر شخص کی
پہلے بایاں کان انگلستان میں کٹ کر گرا
دوسرا کان — اک جزیرے میں —
ذرا ہٹ کر گرا
بعد میں اک ٹانگ بھی جاتی رہی
چند دن زوجہ بچاری ساتھ لنگڑاتی رہی
اور پھر — جرمن کی لمبی جنگ میں
ایک خندق میں بڑی 'کھندک' ہوئی
آپ نے جاتے ہوئے دشمن کو جا کر جا لیا
جا لیا پر کیا لیا

پیش دستی میں خود اپنا ہاتھ ہی کٹوا لیا
ضمناً اِک ٹخنا بھی چھوڑ آئے وہیں
جو نہیں دشمن سے ٹوٹا، آپ توڑ آئے وہیں
اِس طرح مرحوم چند اقساط میں مارے گئے
جنگ میں ایسے بہادر لوگ 'زنہارے' گئے

لیکن ان کی موت کوئی وجہ رسوائی نہیں
جسم کٹوایا، پر اپنی ناک کٹوائی نہیں

(بنیادی خیال انگریزی سے)

خُدا اور شیطان

(کرکٹ میچ میں)

خیر اور شَر کی آویزش کا
چھوڑو! مجھ سے حال نہ پوچھو
کس کے پاس ہے ' بال '، نہ پوچھو
بھائی مجھ کو چُپ رہنے دو
مسٹر مرا خیال نہ پوچھو
پُوچھے ہو تو لو پھر سن لو
(دل میں چبھتے کانٹے چن لو)
ابھی تو شیطاں کھیل رہا ہے
یزداں 'ہٹ لائن' سے لگ کر
چوکے چھکّے جھیل رہا ہے
ابھی تو شیطاں کھیل رہا ہے

○

آفریں ہم پر کہ رکھا ہم نے پھرے کو بحال
دردِ دل ہوتا رہا ، دردِ جگر ہوتا رہا
غیر نے لٹکا دیا افسوس دُم سے باندھ کر
وہ کبوتر جو ہمارا نامہ بَر ہوتا رہا
کچھ عجب اُلٹی سی تاثیرِ دعا میں لاگ تھی
ہم نے جو چاہا بہ عنوانِ دگر ہوتا رہا
آرزوؤں کے دیے جلتے رہے ، بجھتے رہے
یہ چراغاں کا تماشا عمر بھر ہوتا رہا
زلفِ جاناں کی نئی 'کٹ' پر ہوا اب کیوں معترض
تب کہاں تھے جب یہ قصّہ مختصر ہوتا رہا
فیصلہ ترکِ وفا کا کچھ سمجھ کر ، سوچ کر
حضرتِ والا یہ دردِ دل اگر ہوتا رہا
زلیست کی تاریخ بھی جغرافیے کی بات تھی
ایک نقشہ تھا کہ بس زیر و زبر ہوتا رہا

(۱۹۵۴ء)

○

غریبی میں بھی شانِ وضع داری ہے جہاں میں ہوں
کہ اب تو اونٹ سے کوہان بھاری ہے جہاں میں ہوں
مہذب بیبیوں کا رقص جاری ہے جہاں میں ہوں
مؤدب شوہروں پر وجد طاری ہے جہاں میں ہوں
اگر مسٹر ہے اک ترشا ہوا الحاد کا پیکر
تو مولانا بھی کچھ 'من ذاتِ باری' ہے جہاں میں ہوں
ٹپکتا ہے، نگاہوں سے، اداؤں سے، صداؤں سے
کہ پوری قوم ہی شاید کنواری ہے جہاں میں ہوں
وہ کہتے ہیں کہ بھینسیں اشرف المخلوق ہوتی ہیں
اب اِس موضوع پر رائے شماری ہے جہاں میں ہوں
بہت دن عورتیں سہتی رہی ہوں جبر محرومی
مجھے ڈر ہے کہ اب مردوں کی باری ہے جہاں میں ہوں

تباہِ مدرسہ، شیخانِ دیں ، خاصانِ مے خانہ
کوئی بہروپیا، کوئی مداری ہے جہاں میں ہوں
ارے کچھ داد دو اِس اجتماعِ دین و دنیا کی
خیانت ہے مگر پرہیزگاری ہے جہاں میں ہوں
چچا کی مرغ بازی تو بڑی معصوم سی شے تھی
نہ جانے آج کیا کیا نابکاری ہے، جہاں میں ہوں
تمھارے ہاں سکون و امن ملتے ہوں تو لکھ بھیجو
یہاں تو خیر سے اخبار جاری ہے جہاں میں ہوں
محلّے بھر کے مٹکے مٹکیاں سیراب ہیں اِس سے
اُنکا 'وزیرِ آب کاری' ہے جہاں میں ہوں
ضمیرؔ جعفری تم شکل و صورت ہی کو روتے ہو
یہاں تو عقل و دانش بھی اُدھاری ہے جہاں میں ہوں

۹۴ یونیک روڈ
راولپنڈی چھاؤنی

۸ جولائی ۱۹۵۸

راولپنڈی کا گندہ نالا

پُر افشاں جس کی خوشبو ہے میانِ شہر وچک لالا
پُرانے "ہندوانہ مچھّروں" کی اک گؤ شالا
گلی کے مشترک ، متروک ورثے کا یہ رکھوالا
ہماری چھوٹی چھوٹی نالیوں کا باپ یہ نالا
مَرے چوہوں ، سَڑے جوتوں کی گہری کان ہے گویا
یہ دنیا بھر کے نالوں کا مہا پردھان ہے گویا
غلاظت میں غلاظت بال و پر پھیلا کے آتی ہے
عفونت بھاپ بن کر، دھند میں لہرا کے آتی ہے
گھروں کی ہر پرانی چیز چکّر کھا کے آتی ہے
نہ جانے کس زمانے سے کہاں جاجا کے آتی ہے
کچوڑی اور کچا لو دال اور دلیے کی کھاد اس میں
غرض برپا ہے ہندو اور مُسلم کا فساد اِس میں

کوئی دیکھے تو اس کی بے نیازی، فارغ البالی
سلامی دے رہی ہے سر کے بل گر گر کے ہر نالی
کہیں اُبھرا ہوا کدّو، کہیں بیٹھی ہوئی تھالی
خوشا بختے کمیٹی جس کو دے یہ رتبۂ عالی

کمیٹی کے رجسٹر میں تو یہ چلتا ہے، بہتا ہے
سمندر خان سے پوچھو تو اِس کے گھر میں رہتا ہے

پرانا بُوٹ اِک گوبھی کے ڈنٹھل پر سوار آیا
کبھی ٹوٹے ہوئے طبلے پہ سامانِ بہار آیا
صراحی میں گھڑے جتنا غمِ لیل و نہار آیا
وہ اِک بوری میں پورا عالمِ ناپائدار آیا

جو ارماں بھابھڑا بازار میں دفنائے جاتے ہیں
اِسی نالے کے سینے میں ترازو پائے جاتے ہیں

ہوئی جب بھی کمیٹی اِس کی دلدل سے نبرد آرا
کمیٹی ہر گئی ہر بار، یہ نالا نہیں ہارا
نظر آیا نہ اپنے جیتنے کا جب کوئی یارا
کمیٹی نے بالآخر خود کو نالے ہی میں دے مارا

محبّت پھر تو یوں بڑھتی گئی ماں اور بیٹی میں
کہ مشکل ہو گئی تمیز نالے اور کمیٹی میں

سیاسی جلوسوں کیلیے ایک کورس گانا

(۱)

جیم ــــ سے جگ میں شان ہماری
شان ہماری ــــــ زندہ باد
عقل بھی اچھی ــــ شکل بھی پیاری
شکل ہماری ــــــ زندہ باد

(۲)

جیم ــــــ بڑی موذی بیماری
یہ بیماری ــــــ مردہ باد
سر چھوٹا اور گردن بھاری
گردن بھاری ــــــ مردہ باد

(۳)

میم ـــــ ہمارا مردِ یگانہ

مردِ یگانہ ـــــــ زندہ باد

بینا دانا ـــــــ زندہ باد

شیرِ زمانہ ـــــــ زندہ باد

(۴)

میم ـــــ ہے دام کے اندر دانہ

اندر دانہ ـــــــ مردہ باد

نیا شکاری ـــــــ جال پرانا

جال پرانا ـــــــ مردہ باد

۱۹۵۵ء

تعارفیہ

○ اصل نام :- سید ضمیر حسین شاہ ولد سید حیدر شاہ۔ ○ مولد :- موضع چک عبدالخالق۔ ضلع جہلم۔ (یہ گاؤں منگلا کے قریب واقع ہے) ڈیم کی تعمیر سے پہلے منگلا کا سراغ — ہمارے گاؤں کے حوالے سے ملتا تھا — کبھی درویشوں کی باری کبھی سلطانوں کی — ○ تاریخ ولادت :- یکم جنوری 1916ء (اس باقاعدگی کے قربان جایئے۔) ○ ابتدائی تعلیم گاؤں کے ٹاٹ مدرسہ میں ○ بعد ازاں گورنمنٹ ہائی سکول جہلم، گورنمنٹ کالج کیمبل پور اور اسلامیہ کالج لاہور جہاں سے 1938ء' میں بی - اے کی سند حاصل کی۔ ○ عملی زندگی :- کچھ عرصہ لاہور میں صحافت کی کوچہ گردی کی۔ اس زمانہ کے ایک مقتدر روزنامہ "احسان" کی ملازمت سے وابستہ رہا۔ مولانا چراغ حسن حسرت کے قبول نگاہی ہفت روزہ "شیرازہ" کا مدیر معاون بھی رہا — چند برس جہلم اور دہلی اور شملہ میں سرکاری "بابوگیری" کرنے کے بعد فوج سے وابستہ ہوگئے کہ جنگ عالمگیر ثانی جوبن پر آرہی تھی اور ہمارے علاقے کا خاندانی پیشہ کئی پشت سے سپہ گری رہا تھا — فوج میں ہمارا تعلق تعلقات عامہ کے شعبے سے تھا۔ جہاں کرنل مجید ملک، لیفٹیننٹ کرنل فیض احمد فیض، اور میجر (مولانا) چراغ حسن حسرت جیسے شاعر اہل قلم کی رفاقت میں خدمت کا موقع ملا — ○ جنگ کے سلسلہ میں سمندر پار کی خدمت میں تین برس جنوب مشرقی ایشیا میں رہے۔ ○ 1948ء میں پاکستان واپس آئے تو آتے ہی کشمیر کی جنگ آزادی میں گتھ گئے۔ ○ 1949ء میں فوج کی کپتانی سے استعفیٰ دے کر راولپنڈی سے "بادشمال" کے نام سے اپنا روزنامہ جاری کیا۔ جو چل نہ سکا۔ ○ 1951ء میں اپنی دیہاتی نشست سے پنجاب اسمبلی کے الیکشن میں کود گئے مگر لنگڑاتے ہوئے نکل آئے۔ یعنی ہار گئے۔ ○ نئے سرے سے دوبارہ فوج میں واپس آگئے۔ 1966ء میں میجر کے رنیک پر ریٹائرڈ — 1965ء کی جنگ میں شریک رہا — ○ فوج سے سبکدوشی کے بعد اسلام آباد کے ترقیاتی ادارے کے شعبہ تعلقات عامہ کا ڈائریکٹر۔ وزارت اطلاعات میں نیشنل سنٹر کے محکمے، کا ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل۔ شمالی علاقہ جات میں (مشیر) اور اکادمی ادبیات پاکستان سے وابستہ رہا۔ ○ ادبی اعزازات :- 1947ء میں تمغہ قائداعظم اور 1985ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی — ہاں 1936ء میں ہمایوں گولڈ میڈل - بدست جسٹس شیخ سر عبدالقادر (ہماری نظم پنجاب یونیورسٹی کے ایک انعامی مقابلے میں اول قرار دی گئی)○ اب تک 25 سے زائد تصانیف شائع ہوچکی ہیں۔ شعر گوئی کا آغاز 1935ء سے کیا۔ ٹوں ٹاں ساتویں جماعت ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ سنجیدہ شعر کہا اور مزاحیہ بھی — ہلکے پھلکے مضامین خاکے اور صحافتی کالم بھی لکھے۔ ٹیلی ویژن اسلام آباد نے ایک مسلسل پروگرام کا نام ہی ہمارے نام پر — آپ کا ضمیر رکھا — اس کی نظامت بھی ہمارے سپرد رہی اور خدا جانے کیوں یہ پروگرام بہت کامیاب بھی رہا — شاہراہ میرے گاؤں تک جانے والی رابطہ روڈ کو بھی جہلم کی ضلعی کونسل نے اس کی فقیر کے نام سے موسوم کررکھا ہے — وغیرہ وغیرہ اا — چلے جارہے ہیں۔ مقصد کہیں پونچنا نہیں ہے۔